الکساندر پوشکن

منتخب تصانیف

نظم و نثر

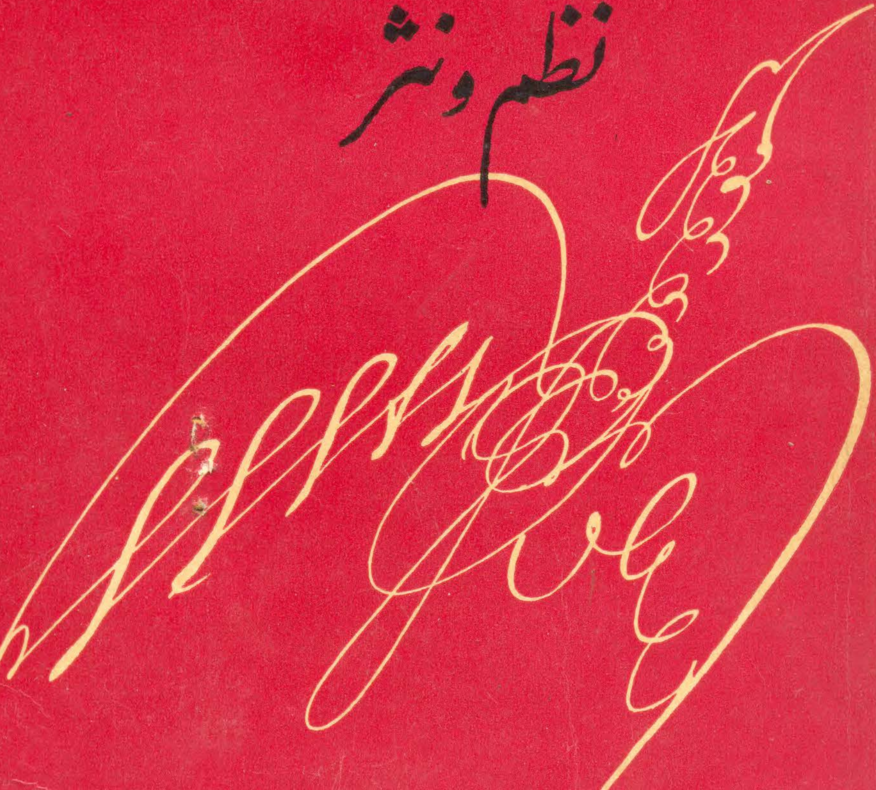

42 خالد حسین نورانی
ایل ایم سی
جامشورو

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

Пушкин

الکسانڈر پوشکن

منتخب تصانیف
نظم و نثر

اس کتاب میں الکساندر پوشکن کے قلمی نسخوں
سے کچھ تصویریں لی گئی ہیں

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکرگذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار۔ نمبر ۲۱
ماسکو، سوویت یونین
21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR

АЛЕКСАНДР ПУШКИН
ИЗБРАННОЕ
Поэзия и проза
на языке урду

صفحہ ۲ پر خود پوشکن کی بنائی ہوئی اپنی تصویر
(تقریباً ۱۸۲۷ — ۲۹ء)

پیش لفظ

الکساندر پوشکن کا بچپن
نامعلوم مصور کی تصویر (تقریباً ۲ — ۱۸۰۱ء)

''پوشکن کے نام سے ہی فوراً روسی قومی شاعر کا تصور پیدا ہو جاتا ہے... پوشکن ایک غیرمعمولی مظہر ہے اور غالباً روسی اسپرٹ کا واحد مظہر۔ اس میں روسی مناظر قدرت، روسی جذبات، روسی زبان اور روسی کیریکٹر کی عکاسی ایسی پاکیزگی اور شفاف حسن کے ساتھ ملتی ہے جیسے وہ کسی بصری شیشے کی ابھری ہوئی سطح سے معکوس ہو رہی ہو،، یہ پوشکن کے ہم عصر اور دوست عظیم روسی حقیقت پسند ادیب گوگول نے لکھا تھا۔

الکساندر پوشکن دو صدیوں کے ڈانڈوں پر ۲۶ مئی ۱۷۹۹ء کو ماسکو میں پیدا ہوئے۔ پوشکن کے والد قدیم اور کسی زمانے میں دولت مند درباری امرائ کی نسل سے تھے۔ شاعر کی ماں ابرام هانیبال کی نواسی تھیں جو ملک حبش کے شہزادے تھے اور جن کو ترکوں نے اغوا کرکے زار پیٹر اول کو بطور تحفہ دیا تھا۔

پوشکن کو اپنے جد پر فخر تھا جو پیٹر کے دور میں ممتاز سپہ سالار تھے اور انھوں نے ان کے اعزاز میں تاریخی ناول ''پیٹر اعظم کا حبشی،، لکھا۔

پوشکن نے اپنی مختصر زندگی میں شاندار تاریخی واقعات دیکھے۔ شاعر نے حب الوطنی کی اس زبردست لہر کو جو ۱۸۱۲ء کی جنگ سے پیدا ہوئی تھی، نپولین کی فوج کی تباهی اور فاتحوں کی دھوم دھام سے وطن کی طرف واپسی کو کبھی نہیں فراموش کیا۔

شاعر کے والد سرگئی پوشکن
(مصور : گام پیلن - ۱۸۲۴ء)

انیسویں صدی کی تیسری دھائی کی ابتدا میں مغربی یورپ میں قومی آزادی کی تحریک (نیپلز میں انقلاب، اسپین میں بغاوت، یونان میں ترکی کی حکومت کے خلاف جدوجہد) ابھری۔ روس کے سیاسی حالات میں بھی گرمی پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں خفیہ سیاسی انجمنیں قائم کی گئیں جن کا مقصد کسان غلامی کو ختم کرنا اور مطلق العنانی کا تختہ الٹنا تھا۔ نوجوان پوشکن آزادی کی آرزوئیں رکھنے والے نوجوان، درباری امیروں کے ہراول کے ترجمان شاعر بن گئے۔ انکی سیاسی نظمیں اور وہ منظوم لطیفے خاص طور سے مقبول ہوئے جو ظلم و استبداد کے خلاف اور عوام کے کچلے ہوئے حقوق کی حمایت میں تھے (غنائی نظم ''آزادی،، اور نظمیں ''گاؤں،، اور ''چاآدائف کے نام،، وغیرہ)۔ زار الکساندر اول نے بڑی ناراضگی سے کہا تھا ''پوشکن نے نفرت انگیز شاعری سے روس کو پاٹ دیا ھے اور وہ سب نوجوانوں کی زبان پر ھیں۔ پوشکن کو سائبیریا جلاوطن کردینا مناسب ہوگا،،۔

یہ دھمکی تو عمل میں نہیں لائی گئی لیکن سرکاری خدمات کے سلسلے میں تبادلے کی صورت میں پوشکن کو پیٹرس بورگ سے روس کے جنوبی علاقے میں جلاوطن کردیا گیا۔ جنوب میں جلاوطنی کا زمانہ ان کے انتھک تخلیقی کام، گہرے غوروفکر اور شاعرانہ جوہر کے پروان چڑھنے کا دور تھا۔

۱۸۲۰ء میں پوشکن نے اپنی پہلی بڑی تصنیف ''روسلان اور لیودمیلا،، نامی نظم ختم کی۔ نظم کی عوامی

١١

شاعر کی ماں نادیژدا پوشکنا جن کا خاندانی
نام هانیبال تها
(مصور : کساوئیے دے میسترا - ١٨١٠ء)

کہانی، شگفتہ بیان اور سادہ اور نازک اسلوب نے اسکو اس وقت کے تمام ادب سے نمایاں کردیا - مشہور شاعر واسیلی ژوکوفسکی نے جو پوشکن کے بہت بزرگ هم عصر تھے ان کو اپنی تصویر بطور تحفه پیش کی جس کے نیچے یه پرمعنی جمله لکها تها ''شکست خورده استاد کی طرف سے فتح یاب شاگرد کو،، -

تیسری دهائی کی ابتدا میں پوشکن کی جنوبی رومانی نظمیں ''قفقاز کا قیدی،، (١٨٢٢ء)، ''باغیچه سرائے کا فواره،، (١٨٢٣ء)، ''بنجارے،، (١٨٢٤ء) - '' بنجارے،، یه خاص نوعیت کی ڈرامائی نظم هے - نظم کا هیرو الیکو هے جو ''صرف اپنے لئے آزادی،، چاهتا هے - شاعر اسکی انا اور نا امیدی کی مذمت کرتا هے - بوڑھے بنجارے کے الفاظ میں عوامی دانائی کا اظهار هے جو نظم میں الیکو کی ''پرفخر،، انفرادیت کی مذمت کرتا هے کیونکه وه ان لوگوں کی رسم ورواج کو ٹهکراتا هے جنهوں نے اسکو پناه دی هے - اس کے ساتھ هی پوشکن شهروالوں کی غلامانه ذهنیت کی بهی مذمت کرتے هیں :

آتی هے عاشقی کے چلن سے حیا انهیں
اور غور و فکر کا بهی نهیں حوصله انهیں
آزادیوں کا مول هے زنجیر اور زر
هر بت کے آگے ٹیکتے رهتے هیں اپنا سر

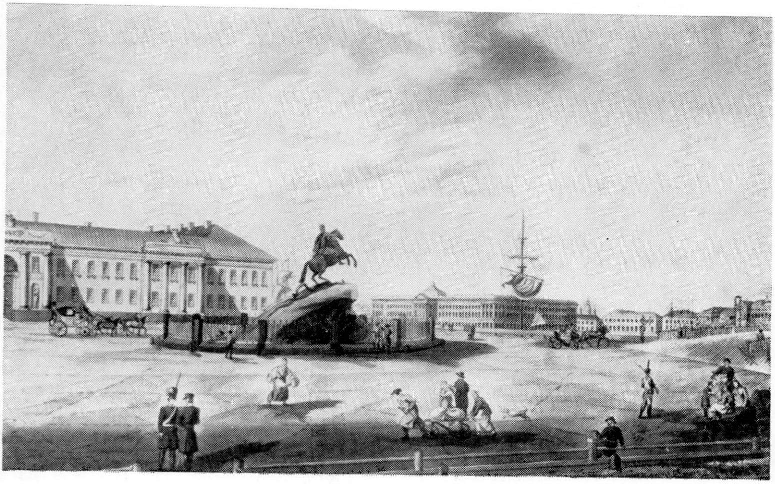

ماسکو کا کریملن، لال چوک
(مصور : کادول - ۱۸۲۵ء) ۱۳

پیٹرس بورگ - سینیٹ چوک
اور پیٹراول کی یادگار
(نقش مصور : پاپیرسین - ۱۸۰۰ء)

۱۸۲۴ء کی خزاں میں بھی زار کی حکومت غیور اور آزاد مزاج شاعر کے پیچھے پڑی رھی اور پوشکن کو دور افتادہ پسکوف صوبے کے گاؤں بھیج دیا گیا جہاں پولیس ان کی نگرانی کرتی تھی۔

اپنے گاؤں میخائلوفسکوئے کی الگ تھلگ زندگی میں جو پوشکن کے والد کی ملکیت تھا انھوں نے دل بھر مطالعہ اور تخلیق کا کام کیا۔ یہاں شاعر نے کسان غلاموں کی زندگی قریب سے دیکھی، یہاں ان میں عوامی تخلیق سے دلچسپی پیدا ہوکر استوار ہوئی۔ پوشکن نے عوامی گیت لکھے، اپنی دایہ آرینا رودیونوونا کی کہانیاں سنیں اور تعریف کرتے ہوئے اپنے بھائی کو لکھا ”کیا لاجواب ھیں یہ کہانیاں! ان میں سے ہر ایک نظم ھے۔“

پوشکن نے خود اپنی لکھی ہوئی کہانیوں کا پس منظر لیکر لاجواب منظوم کہانیاں لکھیں جن میں انھوں نے عوامی شاعری کی روح اور مزاج سے بڑی قربت حاصل کرلی۔

”روسی تھیٹر کو نیا روپ“ دینے کی کوشش کرتے ہوئے، عوامی ڈرامہ کی تخلیق کےلئے پوشکن نے روس کی ماضی کی تاریخ کی طرف توجہ کی۔ ”بوریس گودونوف“، نامی المیئے میں پوشکن نے روسی تاریخ کا ایک بہت ھی کٹھن دور (۱۶ ویں صدی کا آخر اور ۱۷ ویں صدی کی ابتدا) پیش کیا۔

الگساندر پوشکن ریاستی ثانوی اسکول میں
(نقش مصور : گیئتمان - ۱۸۲۲ء)

۱۵

تسارسکوئے سیلو کا اسکول جہاں پوشکن نے
۱۸۱۱ء — ۱۷ تک تعلیم حاصل کی
(ڈرائنگ : پوشکن - ۱۸۲۹ء)

اس المیے میں جو مطلق العنانی کو مسترد کرنے کے جذبات سے لبریز ہے بڑے تیز و تند انداز میں زار کی طرف عوام کے رویے کا سوال پیش کیا گیا ہے۔

پوشکن کا المیہ ''بوریس گودونوف،، سارے عالمی ادب میں پہلا حقیقی سماجی تاریخی المیہ ہے جس میں صرف چند افراد نہیں بلکہ ''قوم کی تقدیر،، کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

۱۴ دسمبر ۱۸۲۵ء کو پیٹرس‌بورگ میں دسمبروالوں کی بغاوت ہوئی جو خفیہ سیاسی انجمنوں کے ممبر تھے۔

پوشکن کو بغاوت کی ناکامیابی، روس کے ترقی‌یافتہ لوگوں کے المیہ کا بے حد صدمہ ہوا۔ وہ جان و دل سے معتوب دسمبروالوں کے حامی تھے۔

دسمبروالوں پر زارشاہی کے ظلم و ستم کا اثر پوشکن پر بہت ہوا۔ انھوں نے لکھا ''جن کو سولی دی گئی وہ تو اپنی جان سے گئے لیکن ۱۲۰ دوستوں، بھائیوں اور رفیقوں کے لئے جلاوطنی میں شدید مشقت کی سزا بہت بھیانک ہے۔،،

پوشکن ۱۸۲۶ء کی خزاں میں پھر ماسکو لوٹے۔ انھوں نے روسی تاریخ کے موضوع پر اپنا کام جاری رکھا۔ ۱۸۲۸ء میں انھوں نے وطن دوست ہیروِوانہ نظم ''پولتاوا،، لکھی جس میں روس کو نیا روپ دینے والی عظیم ہستی پیٹر اول کو خراج تحسین پیش کیا اور دکھایا کہ

الکساندر پوشکن
(مصور : تروپی‌نین - ۱۸۲۷ء)

کس طرح سویڈن کے شاہ کارل دوازدھم کی فوج کے خلاف لڑائیوں میں روسی عوام اپنے وطن کی حفاظت کےلئے ڈٹے رھے - پولتاوا کی جنگ کی تصویرکشی پوشکن کی شاعری کا ایک بڑا کارنامہ ھے -

''پولتاوا،، کے موضوع کا سلسلہ جاری رکھتے ھوئے پوشکن کی آخری نظم ''تانبے کا شہ سوار،، (۱۸۳۳ء) ظہور میں آئی جو سب سے زیادہ فکرآمیز اور فن کے لحاظ سے پختہ تھی - اپنے زور اور رنگینی کے لحاظ سے اس لاجواب نظم میں گہرے فلسفیانہ خیالات پنہاں ھیں - اس میں پیٹرس‌بورگ کے بانی، پیٹر اول کی سیاست دانی اور عظیم اور طاقتور روس کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ھے اور پیٹرس بورگ کے ایک معمولی افسر ''بدبخت ایوگینی،، کی غمگین کہانی ھے جو سخت سیلاب کے زمانے میں غم سے پاگل ھو گیا ھے اور اس پر لعنت بھیجتا ھے ''جس کی جان‌لیوا مرضی کی وجہ سے سمندر کے نیچے شہر کی بنیاد پڑی،،...

۱۸۳۰ء میں پوشکن کی عظیم تصنیف، منظوم ناول ''ایوگینی اونیگین،، ختم ھوئی - شاعر نے اس پر آٹھ سال سے زیادہ کام کیا - عظیم روسی ناقد اور جمہوریت پسند ویساریان بیلینسکی نے پوشکن کی اس تصنیف کو ''روسی زندگی کی انسائیکلوپیڈیا،، کہا -

پوشکن کی بیوی نتالیا پوشکنا جن کا خاندانی نام

گونچاروّوا تھا
(آبی تصویر : بریولوف - ۱۸۳۱ء)

اس ناول میں قارئین کے سامنے پیٹرس‌بورگ، ماسکو اور ان روسی صوبوں کی زندگی آتی ھے جن کا اونیگین نے سفر کیا تھا - ناول کے وسیع حقیقت‌پسند کنویس پر اس زمانے کے روسی سماج کی تصویریں آتی ھیں جن میں روسی مناظر قدرت کی لاجواب تصویرکشی کی گئی ھے اور شاعر کے ہم عصروں کے مثالی نمونے پیش کئے گئے ھیں -

اپنے منظوم ناول ''ایوگینی اونیگین،، میں پوشکن نے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے ادب میں فی‌کارانہ حقیقت پسندی کی بنیاد ڈالی - پوشکن کی شہرت انکے ہم عصروں کے درمیان غیرمعمولی تھی - شاعر کی مقبولیت میں ان کی شخصیت کی دلکشی اور ھمہ گیر جوھر نے چارچاند لگا دئے جس کی عکاسی خاص طور سے ان کی غنائی شاعری میں ھوئی - غنائی شاعری کو پوشکن نے آزادی سے اپنی محبت، حب الوطنی کے جذبات، اپنے وطن کے مستقبل میں اعتماد، آرٹ اور شاعری کے بارے میں رائے اور دوستی و محبت کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا - اس طرح ''میں نے چاھا تھا تمھیں،، نامی مختصر نظم میں جو ۱۸۲۹ء میں پوشکن کی تخلیقی پختگی کے زمانے میں لکھی گئی تھی غیرمعمولی وضاحت کے ساتھ اس عظیم اور شریف انسانی روح کا دلکش تصور پیش کیا گیا ھے جو سب کچھ سمولینےوالے جذبات سے معمور ھے - اس نظم میں کتنی نزاکت، محبت اور ایثار ھے!

۱۸۳۱ء میں پوشکن کی زندگی میں ایک اھم واقعہ ھوا - ان کی شادی ماسکو کی ایک بہت ھی حسین لڑکی

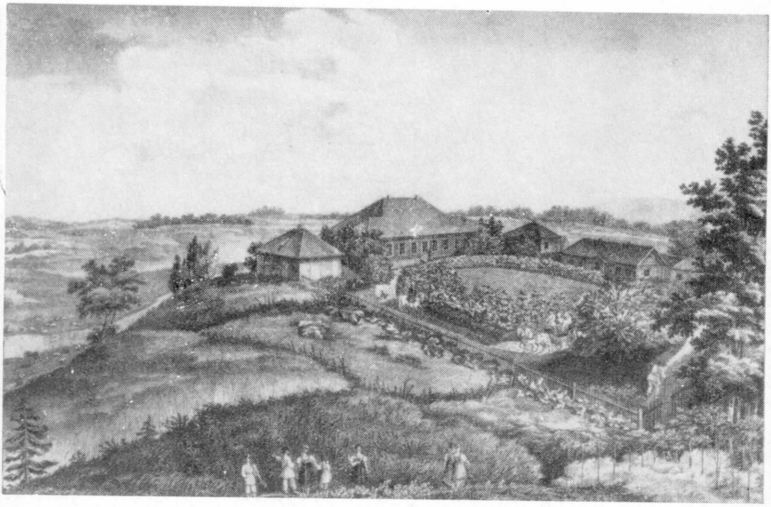

کرائمیا میں قصبہ گورزوف ۔ یہاں پوشکن جنوب
میں جلاوطنی کے زمانے میں اگست ۱۸۲۰ء میں آئے
(مصور : روباس ۔ ۱۸۲۸ء)

گاؤں میخائلوفسکوئے جو پوشکن کے خاندان کی
ملکیت تھا ۔ یہاں پوشکن ۲۶ – ۱۸۲۴ء میں اپنی
جلاوطنی کے دوران رہے
(ڈرائنگ : ایوانوف ۔ ۱۸۳۷ء)

نتالیا گونچاروووا سے ہوگئی ۔ شادی سے پہلے اپنے معاملات کو طے کرنے کے لئے پوشکن اپنے والد کی چھوٹی سی جاگیر بولدینو گئے ۔ یہاں انھوں نے اپنے بہترین ڈرامے ''چھوٹے المیئے،، ، داستانی ڈرامہ ''جل پری،، ، نظم ''کولومنا میں بنگلہ،، اور اپنی پہلی بڑی نثر کی کتاب ''بیلکن کی کہانیاں،، لکھی ۔

''بیلکن کی کہانیوں،، میں پوشکن کی تخلیقات کی جمہوریت پسندی بہت صاف نظر آتی ہے ۔ قارئین اور ناقدوں نے پوشکن کی نثر کو عریاں سادگی کا حسن، اختصار پردازی اور زبان و بیان کا آرٹ کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا ۔ عظیم روسی ادیب لیو تولستوئے نے کہا ''... پوشکن کی نثر سب سے زیادہ اچھی ہے ۔ ادیبوں کو چاہئے کہ وہ متواتر اس خزانے سے مستفید ہوتے رہیں ۔ کتنے یہ سب لاجواب ہیں — ''بیلکن کی کہانیاں،،! اور ارے ''حکم کی بیگم،، یہ تو بے نظیر ہے ۔،،

واقعی ۱۸۳۴ء میں پوشکن کی لکھی ہوئی طویل کہانی ''حکم کی بیگم،، اپنی واضح ساخت، دلکش پلاٹ، ماہرانہ طرزنگارش کے لحاظ سے ایک مختصر اور جامع ناولٹ کی شکل میں سامنے آتی ہے ۔ ہرمان کے روپ میں جو ''نپولین کے خط و خال،، اور ''میفیسٹوفیلس،، کی روح رکھتا ہے نئی قسم کا ہیرو جو دولت کے پیچھے پاگل ہے پیش کیا گیا ہے ۔

Вступленіе

На берегу пустынныхъ волнъ
Стоялъ <u>онъ</u> думъ великихъ полнъ
И вдаль глядѣлъ. Предъ нимъ <u>ш</u>ироко
Рѣка неслася; бѣдный челнъ
По ней стремился одиноко. —
По мшистымъ, топкимъ берегамъ
Чернѣли избы здѣсь и тамъ
Пріютъ убогаго чухонца;
И лѣсъ, невѣдомый лучамъ
Въ туманѣ спрятаннаго солнца,
Кругомъ шумѣлъ. 1)

И думалъ онъ:

Отсель грозить мы будемъ Шведу
Здѣсь будетъ городъ заложенъ
На зло надменному Сосѣду.

اپنی نظم ''تانبے کا شہ سوار،، پر پوشکن کا دستخطی پیش لفظ ۲۳

چوتھی دھائی میں پوشکن نے سماجی زندگی سے متعلق اپنا بڑا ناول ''دوبرووسکی،، لکھا جو مصنف کی المیہ موت کے بعد ۱۸۴۱ء میں شایع ھوا۔ اس ناول کا پلاٹ زندگی کے حقیقی واقعات سے لیا گیا ہے۔ اس میں غربت زدہ زمین‌دار دکھایا گیا ہے جس کا پڑوسی ایک امیر کبیر جاگیردار ہے جس نے اس کی ساری زمین ھڑپ کر لی اور اس کو اپنے گاؤں سے نکال باھر کیا۔

پوشکن کے اس ناول کا ھیرو نوجوان امیر ولادیمیر دوبرووسکی تشدد اور ناانصافی کی مخالفت کرتا ہے۔ اسکو عجیب عجیب واقعات پیش آتے ھیں۔ اپنے تباہ کرنےوالے کی بیٹی ماشا ترونیکوروو‌ا کے ساتھ اس کی شریفانہ محبت اس زمانے کے جاگیردارانہ رسم و رواج اور زندگی کے پس منظر میں دکھائی گئی ہے۔

لیکن پوشکن کی نثرنگاری کا فن ان کی آخری بڑی تصنیف ''کپتان کی بیٹی،، (۱۸۳۶ء) کی کہانی میں بام عروج تک پہنچ جاتا ہے جو واقعی حقیقی تاریخی تصنیف کا نمونہ ہے۔ ''کپتان کی بیٹی،، میں ھنگامی کسان بغاوت کی واضح تصویرکشی کی گئی ہے اور کسان لیڈر یمیلیان پوگاچیف کا کردار پیش کیا گیا ہے۔

پوشکن کی اس تصنیف کے بارے میں بیلینسکی نے لکھا ''کپتان کی بیٹی،، نثر میں ''اونیگین،، کی طرح ہے۔

شاعر نے اس میں زارینہ ایکاتیرینا کے زمانے کے روسی سماج کے رسم و رواج کی تصویرکشی کی ہے - بہت سی تصویریں اپنی سچائی، حقیقی مافیہ اور ماھرانہ طرزبیان کے لحاظ سے مکمل معجزہ ھیں -''

پوشکن کی زندگی کے آخری سال کٹھن تھے - زار سے تعلقات بہت خراب گئے تھے اور پیٹرس‌بورگ کے بااثر درباری امیروں کے حلقوں سے دشمنی ھوگئی تھی - فرانسیسی نژاد دانتیس کے ساتھ المیہ ڈوئل نے ان کے جوھر کے عین شباب میں عظیم شاعر کی زندگی کا خاتمہ کردیا -

پوشکن کو ڈوئل میں مہلک زخم لگا اور وہ ۲۹ جنوری ۱۸۳۷ء کو ختم ھوگئے - شاعر کی ناوقت موت سے سارے روس کو سخت صدمہ پہنچا - عوام کے رنج و غم کی ترجمانی میخائیل لیرمونتوف نے اپنی نظم ''شاعر کی موت'' میں کی جس کی قیمت ان کو فوری جلاوطنی سے ادا کرنی پڑی -

پوشکن کے ساتھ تمام لوگوں کی محبت اور ان کے جوھروں کے سامنے سرعقیدت خم کرنے کے بارے میں ممتاز روسی شاعر تیوت‌چیف نے خوب لکھا ہے :

پہلی محبت کی طرح تجھے
روس اپنے دل سے کبھی فراموش نہیں کریگا

ھمارے زمانے میں پوشکن کی یہ پیش گوئی پوری ھوئی ہے :

روس کی وسعتوں میں میرا ھی چرچا ھوگا
اور میرا نام ھر ایک کی زبان پر ھوگا

پوشکن کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں نہ صرف روسی زبان میں بلکہ سوویت یونین کی تمام قومی زبانوں میں بھی شائع ھوتی ھیں اور ساری دنیا میں مشہور ھیں - عظیم روسی شاعر کی لافانی فن‌کارانہ تخلیقات نے ساری انسانیت کو مالامال کیا ہے -

فہرست

مختصر نظمیں ۲۷
شاعر ۲۸
میں نے چاہا تھا تمھیں ۳۰
جاڑوں کی صبح ۳۱

طویل نظمیں ۳۵
بنجارے ۳۶
تانبے کا شہ سوار ۶۱

قصے ۸۱
قصہ مچھلی اور مچھوے کا ۸۲
سونے کے مرغے کا قصہ ۹۴

کہانیاں اور ناول ۱۰۵
ایوان بیلکن کی کہانیاں ۱۰۶
عرض مؤلف
نشانہ ۱۱۲
برفانی طوفان ۱۳۱
تابوت ساز ۱۴۹
گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ ۱۵۹
بہروپ ۱۷۶
حکم کی بیگم ۲۰۳
دوبرووسکی ۲۴۶

ڈرائنگ : پوشکن ۔
قدرتی منظر ۔ ۱۸۲۸ء

مختصر نظمیں

شاعر

سرسوتی* نہ جب تک اس کو دے صدا:
کوی کہاں ہے تو؟ ہماری بھینٹ لے کے آ
کوی کہیں
جہاں کے چھوٹے موٹے کاروبار میں دبا ہوا
وہ بے دلی سے فکر روزگار میں دبا ہوا
پڑا رہے
ستار اس کا بےنوا رہے
نشے میں نیند کے مگن کوی کی آتما رہے
جو مٹ چکے ہیں لذتوں کی راہ میں،
جو گر گئے ہیں ہوش کی نگاہ میں،
عجب نہیں کہ ان سے بھی
ذلیل و خوار ہو کوی
مگر زرا صدائے غیب آئے گی
شعور کو چھوئے گی — اور
شاعرانہ روح کو جگائے گی
کوی اٹھے گا اپنے من کی آنکھیں کھولتا ہوا

---

* پوشکن نے یہاں اپالون (Аполлон) لکھا ہے جو ''اپالو،، دیوتا کا روسی تلفظ ہے، یعنی نور و حیات کا دیوتا۔ روسی دیومالا میں اسے فنون لطیفہ کا دیوتا مانا گیا ہے، جو مقام ہندستان میں سرسوتی دیوی کو دیا جاتا ہے۔ (ظ۔ ا۔)

عقاب کے مثال شہپروں کو تولتا ہوا
زمانے بھر کی دل لگی
چبھے گی بن کے اک سوئی
زبان آس پاس کی
لگے گی اس کو اجنبی
وہ جن کو پوجتا ہے جگ، بنا کے اپنا دیوتا،
یہ خودپسند سر کبھی جھکے، نہ جھک سکا
وہ آپ اپنی ذات میں ہی محشرخیال ہے
خود اپنے زمزموں سے مالا مال ہے،
یہ روز کا چلن، یہ بےحسی اسے وبال ہے
مزاج کا نہ اس سے میل ہے، نہ اس سے تال ہے
وہ بےنیاز جا رہا ہے تیز گام — اس طرف
جہاں کنارے ہو چکے ہیں بے مقام — اس طرف
جہاں مچا ہے شور بن میں ڈھاک کے
جہاں لہربھر ہے موج، بےلگام — اس طرف

۱۸۲۷ء

میں نے چاہا تھا تمھیں

میں نے چاہا تھا تمھیں، تم سے محبت کی تھی
کیا خبر، آج بھی ہو دل میں دبی چنگاری

خیر، اب آنچ میں کیوں اس کی جلاؤں تم کو؛
جی نہیں مانتا، کچھ ٹھیس لگاؤں تم کو،
دل دکھے جس سے وہی بات سناؤں تم کو!

تھی محبت میں گلے کی، نہ صلے کی پروا
بے زبانی سے، کبھی رشک سے دل ٹکڑے تھا

جس نزاکت سے، لگن سے تمھیں چاہا میں نے
یوں ہی پھر چاہے کوئی اور بھی — اللہ کرے!

۱۸۲۹ء

جاڑوں کی صبح

پالا کٹتا ہے، دھوپ بھری
اور روشنی پھیلی ہے دن کی
تم، جان، جہاں، کیا سوتی ہو؟ اٹھ جاؤ یہ منظر دیکھو تو
اے حسن کی دیوی، مل ڈالو اب نیند کی ماتی انکھیوں کو
اترسے اجالا آتا ہے
دن کیا متوالا آتا ہے!
اس دن کا سواگت کرنے کو، تم صبح کا تارا بن جاؤ

کل رات بڑا طوفان رہا
کچھ یاد ہے، کیا طوفان رہا
برفیلے بگولے دھرتی سے آکاش کو بڑھتے جاتے تھے
تھی چاند کی ٹکیا سہمی سی، بادل سر چڑھتے جاتے تھے
وہ کل کی اداسی دور ہوئی
تھا جس سے تمھارا من میلا، وہ رات گئی، کافور ہوئی

اب نیلے گنبد کے نیچے
پھیلے ہیں برف کے غالیچے
کیا شان دکھاتے ہیں دن میں، کیا دھوپ میں چم چم کرتے ہیں
اس اجلے ستھرے منظر میں شفاف سا جنگل بکھرا ہے
پالے کی ہلکی چھینٹوں سے دیودار کا سبزہ نکھرا ہے
اور پتھر جیسے برف تلے دھارے بھی نرم گزرتے ہیں

کمرے میں روپہلی دھوپ لئے
دن آیا اجلا روپ لئے
چولھے میں بھرے ہوں انگارے اور چٹ چٹ اڑتی چنگاری
بستر پر پڑے ہوں سوچ میں گم، تب لطف ہے موسم کا
پیاری

پراؤ، زرا جی بھلا لیں
مشکی پر ساز کسا جائے
بے پہیے کی گاڑی میں ہم تم سیر کریں، پھسلا جائے

اس برف میں پھسلن زور کی ہے
بو، باس ہوا میں بھور کی ہے
بے تاب ہے گھوڑا اڑنے کو، فراٹے بھرتے جائیں گے
اے جان، یہ صبحیں عیش کی ہیں، ہم عیش ہی کرتے
جائیں گے

خالی کھیتوں، میدانوں سے
جنگل سے اور ویرانوں سے
ہیں مجھ کو بہت پیارے ساحل، ساحل سے گزرتے جائیں گے
۱۸۲۹ء

پوشکن کی ڈرائنگ اپنی نظم
''بنجارے،، کے لئے - ۱۸۲۴ء

طویل نظمیں

بنجارے

بنجارے بھیڑ بھاڑ میں کرتے چھل پھل
بسرابیہ میں گھومتے پھرتے ہیں دل کے دل
دریا کے آس پاس ہیں ڈیرے تنے ہوئے
وہ خستہ حال رین بسیرے بنے ہوئے
آزاد ہو کے عیش مناتے ہیں من چلے
کیسے مزے کی نیند ہے آکاش کے تلے
جلتی ہے آگ چھکڑوں کے پہیوں کے درمیاں
قالین بھی ہیں لٹکے ہوئے کچھ یہاں وہاں
گھر والے سارے سمٹے ہوئے ہیں الاؤ پر
ہو جائے دال دلیہ، تو مل جائے پیٹ بھر
گھوڑے چھٹے ہیں، پاس کے کھیتوں کی لوٹ ہے
پچھواڑے اینڈتا ہے کہ بھالو کو چھوٹ ہے
اسٹیپی میں یہ آئے تو اک جان پڑ گئی
اور چل دئے جو لاد کے، بستی اجڑ گئی
کنبے کا ہے خیال سبھی کو برا بھلا
ہے صبح چل چلاؤ کو تیار قافلہ
کلکاریاں ہیں بچوں کی، گانے ہیں ماؤں کے
گھن بج رہا ہے، کٹتے ہیں اوزار گاؤں کے

لو وہ صدائیں تھم گئیں! سناٹا ہو گیا
سارا قبیلہ رات گئے، تھک کے سو گیا
کتے جو بھونکتے ہیں، لرزتی ہے خامشی

صحرا میں هنهناتے هیں گھوڑے کبھی کبھی
انگارے راکھ هو گئے اک اک الاؤ پر
آکاش میں هے چاند، اجالا پڑاؤ پر
اس ٹھنڈی چاندنی میں هے بوڑھا کوئی اداس
ڈیرے میں اپنے، بجھتے هوئے کوئلوں کے پاس
میدان پر هیں بوڑھے کی آنکھیں لگی هوئی
اور رات کی سہک میں فضا هے بسی هوئی
بیٹی کا انتظار هے، کیا جانے، کب پھرے
گھر سے گئی تھی گھومنے پھرنے کے واسطے
نچلا نه بیٹھا جائے که هے چلبلا مزاج
آزادیوں کی گود کا پالا هوا مزاج
پچھلا پہر هے رات کا، ڈھلتی هے چاندنی
وہ دور بادلوں سے پھسلتی هے چاندنی
زیمفیرا کا پته نہیں اب تک، گئی کہاں!
ٹھنڈی پڑی هیں باپ بچارے کی روٹیاں۔

وہ دیکھو آرهی هے، وهی هے مگر کوئی
سائے سمان ساتھ میں آتا هے اجنبی
یه کون نوجوان هے، آتا نہیں نظر
دونوں لپک کے چلتے هیں، دونوں کا رخ ادھر
آتے هی بولی: ''بابا یه مہمان هے، مجھے
ٹیلے کے پیچھے مل گیا بس اتفاق سے
میں نے کہا که رات یه هو جائے گی بسر
خیمے میں چل کے ٹھیر همارے پڑاؤ پر
بنجارہ بن کے رهنے کو کہتا هے، جیسے هم
اس کی تلاش میں هے پولیس، ناک میں هے دم
پر میں نے اس کی هامی بھری هے نبھاؤں گی
یه هے الیکو، اس کو میں اپنا بناؤں گی
هے دم کے ساتھ ساتھ، جہاں بھی میں جاؤں گی''

بوڑھا

مجھ کو خوشی ہے، آؤ میاں، ہے تمھارا گھر
ٹھیرو یہیں فقیر کے ڈیرے پہ رات بھر
اور من کرے تو شوق سے رہنا ہمارے سنگ
عادت پڑے گی دیکھ کے اوروں کے رنگ ڈھنگ
تیار ہوں، یہ بوریا بستر ہے، بانٹ لو
جو مجھ کو روکھی سوکھی میسر ہے، بانٹ لو
خانہ بدوش لوگ ہیں، پھرتے ہیں بے لگام
ہم مفلسوں کا دن کو سفر، رات کو قیام
کل صبح تڑکے باجے گا نقارہ کوچ کا
تم بھی ہمارے ساتھ ہی چھکڑے میں بیٹھنا
دھندے بھی ہیں، پسند کرو، سیکھ جاؤ گے
لوہے پہ گھن بجاؤ گے یا گیت گاؤ گے
یا گاؤں گاؤں گھوم کے بھالو نچاؤ گے۔

الیکو

میں رہوں گا یہاں۔

زیمفیرا

یہ ہے میرا جواں
کس کی ہمت، چھڑائے بھلا مجھ سے، ہاں!
خیر، اب رات کافی ہوئی
ڈھل گیا چاند بھی
کھیت، میداں، اندھیرے میں گم ہو گئے
میری آنکھوں میں نیندیا گھلی جائے رے...

کٹ گئی رات، اجالا ہوا
اور بوڑھا دبے پاؤں پھرنے لگا
اپنے خاموش خیمے کے چاروں طرف
"جاگ زیمفیرا، اٹھ، دیکھ دن چڑھ گیا
ہو گیا وقت، مہماں، آنکھیں ملو
نرم بستر سے رخصت ہو، بچو، چلو"
لوگ اٹھے نیند سے غل مچاتے ہوئے
کپڑے لتے ٹھکانے لگاتے ہوئے
ڈیرے تہہ کر لئے

اور چھکڑے بھی اوپر تلے بھر لئے
وہ چلی بھیڑ سونے بیابان میں
ایک دو دم کی رونق ہے سنسان میں
آگے آگے چلے جا رہے ہیں گدھے
ان پہ جھولیں کسی اور دونوں طرف
بچے ہنستے، ہمکتے، مزے میں سدھے
پیچھے بڈھے، جواں، سب کے سب مرد و زن
باپ بیٹے، میاں بیوی، بھائی بہن
خوب ہوحق مچاتا چلا قافلہ
اونچی تانیں اڑاتا چلا قافلہ
چیخ بھالو کی، جھنکار زنجیر کی
جھانجھ بجتی ہے ہر بار زنجیر کی
دھاریاں شوخ، چتھڑے لگے پیرھن
بچوں بوڑھوں کے ننگے دھڑنگے بدن
ساتھ کتے بھی ہیں،
بھونکتے ہو کتے، دم نچاتے ہوئے
اور چھکڑے چلیں چرچراتے ہوئے
منچلے بھی نفیری بجاتے ہوئے
کیسا افلاس ہے، کس قدر ابتری!
ان کی ایک اک ادا میں ہے وحشت بھری!
پر مچلتا ہے یوں زندگی کا لہو
ہم جو شہروں کے باسی ہیں
مردار عیشوں پہ قربان ہیں
اس ابلتی ہوئی، ہمہماتی ہوئی زندگی کے لئے
اس قدر اجنبی اور انجان ہیں
جیسے گانے غلاموں کے بےرنگ وبو

الیکو ہے چپ دیکھتا جا رہا ہے
کہ میدان پیچھے چھٹا جا رہا ہے
کہیں دھول میں گم ہوا جا رہا ہے
کوئی جیسے چٹکی سی لیتا ہے دل میں
نجانے یہ کیا درد ہے، کیا ہے دل میں!

یہ زیمفیرا، میری سیہ چشم آھو
مرے پاس بیٹھی ھے، بازو میں بازو
مجھے کونسا غم ھے، دکھڑا کہاں کا
میں آزاد شہری ھوں سارے جہاں کا
مرے سر کے اوپر چمکتا ھے سورج
بھری دو پہر میں دمکتا ھے سورج
ھے آزاد دنیا، مگر میرے جی کو
ھوا کیا؟ ترستا ھوں اب بھی خوشی کو!

پنچھی ھے آزاد چمن میں؛
کیسی فکر، کہاں کا دھندا
اڑنا پھرنا ھر آنگن میں
رس بس کر کیا کرنا ھے، جو
تنکے چن چن چھپر چھائے
ھے وہ رین بسیرا اس کا
جس ٹہنی پر آنکھیں میچے
جس ٹہنی پر نیند آ جائے
جب سورج کی لال کٹوری
نکلے اور اجالا چھلکے
پنچھی اپنے رب کا کلمہ
سن کر جھومے ھلکے ھلکے
چہکے اور بھجن خودگائے
جب رت بدلے، آئے گرمی
اور بہاروں کی سب نرمی
دھوپ میں جھلسے، پیاس سے پھڑکے
اور پھر جب دن ھوں پت جھڑکے
بادل گرجیں، بجلی کڑکے
آدمی کتنے دکھ بھرتا ھے،
سردی، گرمی، آندھی، پانی
سب کے ساتھ گزر کرتا ھے
لیکن پنچھی کیوں غم کھائے
پھر سے اچھی رت آنے تک

دور سمندر پار اڑ جائے
کون اسے رکھے بندھن میں
پنچھی ہے آزاد چمن میں

چلا وہ بھی فکروں سے آزاد ہوکر
زمانے کی کھائے ہوئے سخت ٹھوکر
نہ وہ آشیانے کی راحت کو جانے
نہ دنیا کی اچھی بری لت کو جانے
جو جانے تو آزاد فطرت کو جانے
الیکو پہ ہر سمت راہیں کھلی تھیں
گھنی چھاؤں کی نرم باہیں کھلی تھیں
صبح آنکھ کھلتی تو بے فکر ہوکر
یونہی اپنا دن چھوڑ دیتا خدا پر
تن آسانیوں کی میسر تھی راحت
جو ہوتا ہے ہوتا رہے، اس کو کیا ڈر۔
کبھی بیٹھے بیٹھے خیال ایسے آتے:
وہ گزرا ہوا ناز و نعمت کا ساماں
وہ عشرت کے دن، جھوٹی شہرت کا ساماں
ستارے وہی دور سے ٹمٹماتے
سفر میں کبھی یوں بھی ہوتا کہ سر پر
کڑکتی تھی بجلی، گرجتے تھے بادل
مگر نیند بے فکر تھی ہر بلا سے
نہ راحت کی پروا، نہ خطرے سے بیکل
ہے تقدیر اندھے کی لاٹھی — مگر اس
پہ تقدیر کا زور چلتا نہیں تھا
نجانے کہاں کی بھری تھیں امنگیں!
دل آزادیوں میں بہلتا نہیں تھا
کہ سینے میں رہ رہ کے اٹھتی تھیں لہریں
سمے کٹ رہا تھا کسی کش مکش میں
اگر چین پایا تو کیا چین پایا،
کہیں حسرتوں نے جو پھر سر اٹھایا؟

———

زیمفیرا

سچ کہیو، میری جان، تجھے غم نہیں ہے کیا؟
اس کا جو عمر بھر کے لئے تو نے تج دیا؟

الیکو

کیا تج دیا ہے میں نے، سنوں تو سہی بھلا؟

زیمفیرا

اپنے وطن کے، شہرکے سب لوگ اور کیا!

الیکو

کاہے کا رنج؟
تو نے تو سوچا نہیں کبھی
میری طرح جو کاش کہیں تو بھی جانتی!
کیا چیز ہے گھٹے ہوئے شہروں کی زندگی!
ہر سمت ریل پیل ہے، لاچار ہیں وہ لوگ
جنگلے کھڑے ہوئے ہیں گرفتار ہیں وہ لوگ
سانس ان کے آشنائے نسیم سحر نہیں
پھولے اگر بسنت تو ان کو خبر نہیں
آتی ہے عاشقی کے چلن سے حیا انھیں
اور غور و فکر کا بھی نہیں حوصلہ انھیں
آزادیوں کا مول ہے زنجیر اور زر
ہر بت کے آگے ٹیکتے رہتے ہیں اپنا سر
کیا تج دیا ہے؟ ان کی یہی بے وفائیاں
وہ جوڑ توڑ اور دلوں کی برائیاں
دیوانے پن سے ان کی دھکا پیل اور ہجوم!
کیا ذلتوں کی شان ہے! بدنامیوں کی دھوم!

زیمفیرا

پر کیسے شاندار محل ہیں کھڑے ہوئے
قالین بھی ہیں رنگ برنگے پڑے ہوئے
ہیں دعوتیں بھی زور کی، تفریح بھی گھنی
اور لڑکیاں بھی پھرتی ہیں کیسے بنی ٹھنی!

الیکو

کس کام کے یہ جشن، یہ شہروں کی دل لگی
جب پریم ہی نہ ہو تو کہاں کی ہنسی خوشی!

اور لڑکیوں کی بات نہ کر... ان کا کیا شمار
تو ان سے لاکھ اچھی ہے، بےھار، بےسنگار
آرائش جمال کی حاجت نہیں تجھے
موتی ہے، موتیوں کی ضرورت نہیں تجھے
ہاں، شرط یہ ہے، دیکھ بدل جائیو نہ تو!
بس، میری جان، ایک یہی دل میں آرزو!
چاہت میں تو شریک ہو، راحت میں پاس ہو
پھر روز کا یہ گھومنا پھرنا بھی راس ہو۔

بوڑھا

یوں تو پیدا ہوئے تھے امیروں میں تم
ہم سے الفت ہوئی،
ہم غریبوں میں آئے، لگایا گلے
پر نہیں راس آتی ہیں آزادیاں
اس کو جو عیش میں، راحتوں میں پلے
ایک قصہ سناؤں،
جو ہم نے بڑوں کی زبانی سنا
رہنے والا کوئی دھوپ کے دیس کا*
شاہ کے حکم سے جب نکالا گیا
تو اسے بھی ٹھکانا ملا تھا یہیں
(نام تھا کچھ بھلا سا
مگر اب مجھے یاد آتا نہیں)
تھی بہت عمر لیکن جوان آتما
میل سے پاک، زندہ، سہان آتما
اپنے گیتوں سے جادو جگاتا تھا وہ
اور گلے میں کچھ ایسی کرامات تھی
جیسے چشمے ابلتے ہوں
جھرنے اچھلتے ہوں

---

* یہ رومن شاعر اوویدیم کا قصہ ہے جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے اور جس کو شہنشاہ آوگوستس نے بحیرۂ اسود کے ساحل پر جلاوطن کر دیا تھا۔ اٹلی جنوبی ملک ہے اس لئے اسے دھوپ کا دیس کہا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

جس وقت گانے پہ آتا تھا وہ
تھا بھلا آدمی، چاہتے تھے سبھی
ٹھیس پہنچی نہ اس سے کسی کو کبھی
وہ بھی ڈنیوب کے ساحلوں پر یہاں
خوب قصے کہانی سناتا رہا
گیت گاتا رہا، من لبھاتا رہا
اس کو آتا نہ تھا کام دھندا کوئی
بالکوں کا سا کمزور، نازک بدن
اور شرمیلا پن
اپنے بیگانے کرتے تھے سارے جتن
اس کی خاطر کبھی جانور مار لاتے
کبھی مچھلیاں کھیپ میں لے کے آتے
جو پڑتی تھی سردی تو تھمتا تھا دریا
بگولے اٹھاتی تھی برفیلی آندھی
ٹھٹھرتے تھے سب لوگ، جمتا تھا دریا
تو اس دھان پان اور دھرماتما کو
روئیں دار کھالیں اڑھاتے تھے لاکر
نکلنے نہ دیتے تھے سردی میں باھر
مگر ان غریبوں کی اوقات کیا تھی!
جو کرتے تھے خاطر مدارات کیا تھی!
کبھی اس کو فکروں کا جیون نہ بھایا
خوشی سے کبھی ان میں رھنے نہ پایا
وہ کانٹا ھوا اور بھی سوکھ کر
یہ کہتا پھرے جابجا دربدر
گناھوں کی یہ مل رھی ھے سزا
کہ قہر خدا مجھ پہ نازل ھوا
اسی آس میں وہ رہا رات دن
کہ شاید نظر ھو مرے حال پر
کہ شاید نکل آئے کوئی مفر
بڑے دکھ سہے اس نے ڈنیوب کے
ساحلوں پر ھمیشہ بھٹکتا رہا
اس کو یاد وطن نے رلایا بہت

زندگی بھر یہ کانٹا کھٹکتا رہا
آخری وقت یہ کی وصیت کہ تم
بعد مرنے کے میری دکھی ہڈیاں
بھیج دینا دکن کی زمیں کو، جہاں
جیتے جی لوٹ جانے کی حسرت رہی
روح بےچین تھی، اس کو پردیس میں
زندگی کیا، گوارا نہ تھی موت بھی

الیکو

ہاں تو اے روم، اے نامور سلطنت!
تیرے بیٹوں کی تقدیر تھی کیا یہی؟
تیرے بیٹوں نے صدمے اٹھائے بہت!
اے محبت کے نغمہ سرا
دیوتاؤں کے گن گانے والے بتا
شان کیا چیز ہے، نیکنامی ہے کیا؟
کیا وہ شہرت کہ دنیا قصیدے کہے؟
تذکرہ نسل درنسل چلتا رہے؟
یا یہ حالت کہ بے ساختہ داستاں
کوئی بنجارہ کرتا ہے خود سے بیاں
چھولداری کے اندر گھٹا ہے دھواں؟

چکر لگاتے، گھومتے دو سال ہو گئے
خانہ بدوش اپنا وہی قافلہ لئے
پھرتے ہیں جابجا؛
اب بھی وہ چلتے چلتے کہیں ٹھیر جاتے ہیں
مہمان بن کے رہتے ہیں، آرام پاتے ہیں۔
گھل مل گیا ہے ان میں الیکو بھی، اب اسے
تہذیب ناگوار، تمدن ہے ناپسند؛
وہ بیڑیاں بھی کٹ گئیں، آزاد ہوگیا
افسوس ہے کسی کا، نہ ہوتا ہے فکرمند
اب بھی وہی الیکو ہے، کنبہ بھی ہے وہی
بیتے دنوں کی یاد بھی آتی نہیں کبھی

بنجارہ بن کے رہنے کی عادت سی ہو گئی
اس کو وہ ان کے رین بسیرے پسند ھیں
اور یہ نشہ کہ کام سدا چین سے چلیں
سنگیت میں رچی ہوئی بھاشا غریب ھے
وہ بھی اسے پسند ھے، دل سے قریب ھے۔
بھالو ھے یوں تو غار کا، جنگل کا جانور،
لیکن اب اس کے ڈیرے میں سوتا ھے پھیل کر
میدان میں سڑک کے کنارے جو گاؤں تھے
مولداویہ کے لوگ بسے تھے یہاں وہاں
ان کے گھروں کے پاس جہاں ڈگڈگی بجی
وہ دوڑے اور چار طرف بھیڑ لگ گئی
بھالو انھیں دکھائے تماشے جہاں تہاں
غرائے اور پنجوں پہ ناچے بھدربھدر
زنجیر کو چبائے، بھنبھوڑے کسی قدر۔
بوڑھا بھی ڈھیلے ھاتھ سے ڈفلی بجا بجا
لاٹھی کی ٹیک لے کے بڑھے کانپتا ہوا
گاتا الیکو ریچھ کی رسی سنبھال کے
زیمفیرا گاؤں گھومتی اور گھر کو لوٹتی
جو کچھ کسی نے دے دیا جھولی میں ڈال کے؛
جب رات ہونے آئے تو وہ تینوں بیٹھ کر
دلیہ کوئی ابالتے موٹے اناج کا
بوڑھے کی آنکھ لگتے ھی، بتی بجھا کے سب
سو جاتے تھے کہ انت ہوا کام کاج کا

آئی بہار، دھوپ میں بیٹھے ہوئے ادھر
ٹھنڈے لہو کو سینک رھے ھیں بڑے میاں؛
اور جھولنے کے پاس ھے بیٹی مگن یہاں۔
گاتی ھے ایک گیت جسے سوچ سوچ کر
اڑنے لگیں الیکو کے منھ پر ہوائیاں

زیمفیرا

میرے بڈھے خصم،
میرے ظالم خصم
چاھے خنجر چلا

چاہے زندہ جلا
میں ہوں پکی بڑی،
تجھ سے ڈرتی نہیں
چاہے ٹکڑے اڑا، چاہے کر دے بھسم
میرے بڈھے خصم!
اب تو بھاتی نہیں،
تیری صورت مجھے
کیا کروں ہو گئی
تجھ سے نفرت مجھے
اب کسی اور سے
ہے محبت مجھے
جان دے دوں گی، کیا جان کا مجھ کو غم
میرے بڈھے خصم!

الیکو

خاموش، تیرے گیت سے میں تنگ آ گیا
مجھ کو نہیں پسند یہ گانے الا بلا

زیمفیرا

تجھ کو نہیں پسند، نہ ہو، مجھ کو اس سے کیا
میں گا رہی ہوں اپنے لئے، واہ وا جی وا!
... چاہے خنجر چلا، چاہے زندہ جلا
میرے بڈھے خصم، میرے ظالم خصم
کچھ بتاؤں نہ میں
دوں نہ اس کا پتہ
میرے بڈھے خصم!
وہ بہاروں سے بھی بڑھ کے ہے تازہ دم
اور گرمی کے دن سے بھی گرما گرم
ہائے کیا ویر ہے، کیسا کڑیل جواں
پیار بھی جی سے کرتا ہے اس کی قسم
میرے بڈھے خصم
رات سنسان تھی
پیار کرتی رہی
میں اسے، وہ مجھے

خوب ہنستے رہے
تیرے اجڑے ہوئے پکے بالوں پہ ہم
میرے بڈھے خصم!

<u>الیکو</u>

زیمفیرا، بس خموش، مرا ناک میں ہے دم

<u>زیمفیرا</u>

کیوں، کیا ہوا، سمجھ گئے تم، کیوں برا لگا؟

<u>الیکو</u>

زیمفیرا!

<u>زیمفیرا</u>

مرضی تمھاری، روٹھنا چاہو تو روٹھ لو
میں گاؤں گی، یہ گیت ہے تم پر، جو ہو، سو ہو،
(اٹھی وہاں سے، گیت وہ گاتی ہوئی چلی)

<u>بوڑھا</u>

ہاں، یاد آ گیا، مجھے اب یاد آ گیا
گانا ہمارے وقت میں تھا یہ گڑھا گیا
کاگول کے کناروں پہ ہوتا تھا جب گزر
مریولا میری بیٹھ کے جاڑوں کی رات میں
بچی کو بازووں میں جھلاتی الاؤ پر
اور تھا یہی وہ گیت جو گاتی تھی سات میں
بوڑھا ہوا ہوں، عقل پہ پردے سے پڑ گئے
لیکن یہ بول یاد رہے، دل میں گڑ گئے

رات خاموش ہے، رات کی چاندنی
اس جنوبی افق پر ہے چھٹکی ہوئی
اور زیمفیرا نے باپ کو نیند سے
ہڑبڑا کر اٹھایا کہ "ابا مرے،
دیکھنا تو، الیکو کو کیا ہو گیا
آہ پر آہ بھرتا ہے، روتا ہے یہ
سانس مشکل سے لیتا ہے، سوتا ہے یہ۔"

بوڑھا

دیکھ، بس چپ رہو،
اس کو مت چھوئیو
میں نے یہ روسیوں سے سناتھا کبھی
روح سینہ دباتی ہے جب رات کو
تلملاتا ہے سوتا ہوا آدمی،
بیٹھ جا تو مرے پاس،
یہ صبح ہوتے چلی جائے گی۔

زیمفیرا

پر یہ ہولے سے زیمفیرا کہتا ہے کیوں؟

بوڑھا

خواب میں بھی ہے اس کو تری جستجو
اب اسے ساری دنیا سے پیاری ہے تو

زیمفیرا

مجھ کو اس کی محبت بلا ہوگئی
ہائے، میں کیا کروں؟
دل یہ کہتا ہے اب اس سے آزاد ہوں
اب تو مجھ کو... مگر ہائیں، یہ کیا سنا؟
نام اب کے لیا ہے کسی اور کا۔

بوڑھا

نام کس کا لیا؟

زیمفیرا

نام کیا، تم کراہیں سنو تو سہی
دانت بھی کٹکٹاتا ہے توبہ مری
جاؤں، اس کو جگا دوں ابھی

بوڑھا

مت جگا تو اسے،
رات والی کو مت چھیڑ، جانے بھی دے
ایک آسیب ہے، خود چلی جائے گی

زیمفیرا

اس نے کروٹ بدل لی ہے، وہ اٹھ گیا
اور مجھ کو بلاتا ہے، جاؤں میں کیا؟

تم بھی سو جاؤ ابا کہ اب میں چلی

الیکو

تو کہاں تھی بتا؟

زیمفیرا

باپ کے پاس تھی میں تو بیٹھی ہوئی
تجھ پہ آسیب تھا، یا کوئی روح تھی
کس قدر نیند میں تھی تجھے بیکلی
دانت بھی پیستا، کٹکٹاتا رہا
نام لے لے کے میرا بلاتا رہا۔

الیکو

میں نے دیکھا تجھے خواب میں
میں نے دیکھا کہ میرے ترے درمیاں...
کیا کہوں، خواب میں تھا بھیانک سماں

زیمفیرا

ان کو مت مان،
وشواس مت کر، برے خواب ہیں

الیکو

میں تو کچھ بھی نہیں مانتا
میرا وشواس ہی اٹھ گیا
خواب کیا، اور باتیں بھی کیا دل نشیں
حد تو یہ ہے، یقین تیرے دل کا نہیں!

بوڑھا

کس بات پر خفا ہے، دوانہ ہوا ہے کیا؟
اے نوجوان، آہ تو بھرتا ہے کیوں سدا؟
ہیں منچلے یہ لوگ، یہ سندر ہیں ناریاں
ہے آسمان صاف یہاں، صاف دل یہاں
مت رنج کر، کہ رنج میں ہے جان کا زیاں

الیکو

بابا، وہ اب تو پیار ہی کرتی نہیں مجھے

بوڑھا

زیمفیرا ایک بچی ہے۔ لے کام صبر سے!

بیکار کے یہ وھم ھیں، دل سے نکال دے
تو عشق میں دکھی ہے، جلاتا ہے اپنا جی
عادت ہے عورتوں کو مگر تاک جھانک کی۔
وہ دیکھ آسمان کی محراب کے تلے
آزاد چاند گھوم رہا ہے مزے مزے
قدرت میں جو بھی چیز ہے، نزدیک ہو کہ دور
چھلکا کے اپنا جام لٹاتا ہے سب کو نور
جن بدلیوں میں جھانک لیا نور بھر دیا
جس کو دکھائی چھب، اسے دیوانہ کر دیا
لواب کے ایک اور ھی بادل سے میل ہے
اور یہ بھی تھوڑی دیرکا دل چسپ کھیل ہے
کس کی مجال ہے جو کہے ٹھیرجا یہیں
یہ چاند روک ٹوک کوئی مانتا نہیں
ان لڑکیوں کا دل بھی کہاں حکم سہہ سکے
تم ایک ھی سے پیار کرو، کون کہہ سکے
لے کام صبر سے!

الیکو

کتنا وہ چاہتی تھی مجھے
کیا ھوا وہ دل؟
جو سونی وادیوں میں دھڑکتا تھا مستقل
کتنی ھی بار شوق سے سینے کے متصل
باھیں گلے میں ڈال کے راتیں گزار دیں
کتنی ہی بار، جب اسے سوجھا ہے بچپنا
تتلا کے اور پیار کی باتیں بنا بنا
بوسوں سے مست کرکے کیا سوچنا منع
الجھے ہوئے خیال کی زلفیں سنوار دیں
زیمفیرا میری اب وہ نہیں ہے، بدل گئی
وہ آنچ سرد ہو گئی، مستی نکل گئی

بوڑھا

سن، تجھے آپ بیتی سناتا ھوں میں:
ہے پرانی بہت، ایک عرصہ ھوا
یوں سمجھ لو کہ ڈنیوب پر ان دنوں

ماسکو وال کا کوئی خطرہ نہ تھا
(دیکھتے ہو، مجھے یاد آنے لگی
وہ پرانی کہانی، بڑی دکھ بھری)
ہم لرزتے تھے ترکی کے سلطان سے
پادشا کی حکومت تھی بوجاک پر
حکم چلتا تھا اونچے اکرمان * سے
وہ مری نوجوانی کے دن تھے؛ ابھی
گھنگھریالا کوئی بال پکا نہ تھا
روح تھی شاد، آباد، مستانہ تھا
تھیں حسینائیں بھی ایک سے ایک ور
ان میں بس ایک پر جاکے ٹھیری نظر
اس کو تکتا تھا، بھرتا تھا اس کا ہی دم
جیسے سردی میں سورج کو تکتے ہیں ہم
رات‌دن التجا سے منایا اسے
آخر اک روز اپنا بنایا اسے

ہائے میری جوانی کے پر لگ گئے
کوئی تارا تھا، گم ہو گیا دن بھئے
اور محبت کی رت بھی بدا ہو گئی
وہ جوانی سے پہلے ہوا ہو گئی
سال بھرکی محبت میں جی بھر گیا
میری مریولا تو کیا سے کیا ہو گئی

اب سنو، کیا ہوا:
ہم تھے کاگول کے پاس ٹھیرے ہوئے
تھے پہاڑوں کے دامن میں ڈیرے لگے
اس طرف سامنے سے کوئی قافلہ
آن پہنچا تو وہ بھی وهیں ٹک گیا

---

* بوجاک — بسرابیہ علاقے کا جنوبی حصہ۔ بسرابیہ کا شہر اکرمان ۱۸ ویں صدی میں ترکی کا قلعہ تھا۔ (ایڈیٹر)

وہ بھی اپنے ہی بنجارے تھے ذات کے
بن گئے وہ بھی ہمسائے دو رات کے
تیسری رات کو وہ سدھارے سبھی
اور مریولا بھی ان کے پیچھے گئی
اپنی ننھی سی بچی کو گھر چھوڑ کر
مجھ کو سوتا ہوا بے خبر چھوڑ کر ؛
جب سویرا ہوا، آنکھ میری کھلی
دیکھتا ہوں کہ سب کچھ ہے، پر وہ نہ تھی
اس کو آواز دی — پوچھتا بھی پھرا
پر نہ پایا کہیں کوئی اس کا پتا
روئی زیمفیرا میری بلک کر تو میں
خود بھی رویا — کہ آخر ہم انسان ہیں
دیکھ لو وہ دن اور آج کا ہے یہ دن
ہو گئی ساری دنیا کی عورت سے گھن ؛
پھر کسی سے کبھی دل لگایا نہیں
اپنی بیٹی کو پالا، اکیلا رہا
اور سے میں نے دکھ سکھ بٹایا نہیں
اپنے جیون کا ساتھی بنایا نہیں

الیکو

پر تم نے اس رذیل کا پیچھا کیا نہ کیوں؟
اس بے وفا کا اور درندے کا ایک ساتھ
خنجر سے پاش پاش کلیجہ کیا نہ کیوں؟

بوڑھا

مگر کا ہے؟
جوانی پنچھیوں سے بھی زیادہ شاد ہوتی ہے
بہت آزاد ہوتی ہے
محبت پر، مرے پیارے، کسی کا بس نہیں چلتا
خوشی ملتی ہے سب کو باری باری
آج میری، کل تمھاری،
یہ دیا ایسا ہے جو بجھ جائے تو پھر سے نہیں جلتا

الیکو

مجھ میں نہیں یہ تاب کہ تکرار چھوڑ دوں

خاموش بیٹھ جاؤں، ادھیکار چھوڑ دوں
یا خود نہ جوڑ توڑ کروں اپنے کام کا
یا بس چلے تو لطف نہ لوں انتقام کا
دشمن جو سو رہا ہو سمندر پہ بے خبر
اور اتفاق سے ہو مرا اس طرف گزر
ماتھے پہ بل نہ آئے، نہ دل میں دیا کرم
ٹھوکر لگاؤں اس کو وهیں پر خدا قسم
پانی پہ جاکے دور گرے اور اچھل پڑے
اک دم جو اس کی چیخ نکل جائے خوف سے
میں زهر میں بجھا کے لگاؤں وہ قہقہے
جو اس کے ڈوبنے کو تماشا بنا بھی دیں
اور زندگی میں خوب هنسائیں، مزا بھی دیں

نوجوان بنجارہ
بس ایک پیار اور
سنو، ایک بار اور
زیمفیرا
اب هو گیا سمے
میرا میاں، بڑا هی جلاتن هے، بس کرو
نوجوان بنجارہ
اچھا تو رخصتی کا وہ لمبا سا پیار اور
زیمفیرا
لو، اب تو چھوڑ دو
وہ آ نہیں گیا، یہ غنیمت هے، بس کرو
نوجوان بنجارہ
یہ تو بتاؤ، کب کو کروں انتظار اور؟
زیمفیرا
جب چاند چڑھ چکا هو تو ٹیلے کی آڑ میں
اس قبر پر میں آؤں گی، تم آج هی ملو!
نوجوان بنجارہ
(رات گئے انتظار میں)
بس جی، وہ اب نہ آئے گی، باتیں بنا گئی

زیمفیرا
اے، میری جان دوڑ کے آ، لے میں آ گئی

سو رہا تھا الیکو، پر الجھے ہوئے
خواب نے اس کو چونکا دیا نیند سے
چیخ ماری، اندھیرے میں گھبرا گیا
سہج سے ہاتھ پھیلا کے بڑھتا گیا
بدگمانی میں اس نے ٹٹولا کہیں
سرد بستر تھا، بستر کی رونق نہیں...
وہ تڑپ کر اٹھا اور سننے لگا
ہر طرف ہو کا عالم تھا، سنسان تھا
مارے دہشت کے لرزہ ہوا، تپ چڑھی
اس کو چھوٹے پسینے، بڑھی کپکپی
اٹھ کے ڈیرے سے باھر گیا اور وہاں
اس نے چھکڑوں کے چکر لگائے کئی
گھپ اندھیرا تھا، وحشت تھی، سونا سماں
کھیت چپ چاپ لیٹے ہوئے بے زباں
چاند ہالے میں تھا، کہر میں چاندنی
ملگجا نور تاروں کا چھٹکا ہوا
سرد شبنم پہ ابھرے ہوئے نقش پا
وہ نشان اس کو رستہ دکھاتے چلے
بیقراری سے اس سمت بڑھتا گیا
دور ٹیلے کے پیچھے جہاں لے چلے

دور سے کچھ سفیدی سی آئی نظر
راہ کی تان ٹوٹی کسی قبر پر
پاؤں بے جان تھے، دل پریشان تھا
ہول آتا تھا ماتھا ٹھنکنے سے بھی
اس کے ہونٹوں پہ، گھٹنوں میں تھی تھرتھری
جا کے دیکھا تو — یہ کیا؟ یہ کیا ھے؟ یہ کیا؟
کوئی سچ مچ کی ھے بات یا خواب سا؟
قبر کی ہو رہی ھے یہ بےحرمتی!

اس پر بالکل ہی نزدیک ہیں سائے دو
اور چپکے سے جیسے کوئی بات ہو -

پہلی آواز

اب وقت ہو گیا -

دوسری آواز

تو زرا ٹھیر جا

پہلی آواز

اب وقت ہو گیا مرے پیارے

دوسری آواز

نہیں نہیں
کچھ اور ٹھیر جا کہ نکل آئے دن یہیں

پہلی آواز

اب دیر ہو چکی ہے پرے ہٹ

دوسری آواز

کچی ہے تیری چاد، زرا ٹھیر اک منٹ!

پہلی آواز

میرے میاں کی آنکھ اگر کھل گئی تو پھر؟

الیکو

لو، آنکھ کھل گئی،
دیکھوں تو مجھ سے بچ کے نکلتے ہو اب کہاں؟
اچھے رہے کہ قبر بھی تیار ہے یہاں -

زیمفیرا

تو میری جان بھاگ لے جلدی سے، بھاگ، بھاگ

الیکو

او نوجوان، ٹھیر، بجھاتا ہوں تیری آگ!
(چاقو اٹھا کے سینے میں پیوست کر دیا)

زیمفیرا

یہ کیا الیکو؟

نوجوان بنجارہ

ہائے رے میں مرا

زیمفیرا

یہ کیا ستم ہے، تو نے الیکو، یہ کیا کیا؟

چھینٹے اڑے ہیں، خون میں ڈوبا ہوا ہے تو
مارا ہے اس کو جان سے ظالم، برا کیا!

الیکو
تو پھریو دم اب اس کی محبت کا، کیا ہوا

زیمفیرا
بس، ہوش میں ہو، رعب نہیں مانتی ترا
ڈرتی نہیں ہوں تجھ سے، خبردار، دور ہو!
ان دھمکیوں پہ، قتل پہ پھٹکار، دور ہو!

الیکو
مرنا ہے تجھ کو بھی!
(اس پر بھی ایک وار کیا)

زیمفیرا
ہائے — محبت میں جان دی۔

مشرق کی صبح ہوتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
قاتل نے رات کاٹ دی سنگ مزار پر
ٹیلے کے پار، ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے
چہرے کا رنگ زرد ہے، کپڑے لہو میں تر،
لاشیں نظر کے سامنے دونوں دھری ہوئی
چاروں طرف سے بھیڑ ہے دہشت بھری ہوئی
بنجارے بدحواس ہیں، اور لب سیے ہوئے
روتی ہوئی، قطار میں آتی ہیں عورتیں
لاشوں کی آنکھیں چومتی جاتی ہیں عورتیں
بیٹھا ہے اک طرف کو اکیلا ضعیف باپ
کڑیل جواں کی لاش کو تکتا ہے درد سے
چپ چپ ہے، ہاتھ پاؤں ہیں بےجان سرد سے
دونوں جنازے ساتھ اٹھے، موت نے انھیں
ٹھنڈی زمیں کی گود میں لاکر لٹا دیا
دونوں جوانیوں کو برابر لٹا دیا۔
سب کچھ الیکو دور سے دیکھے گیا خموش
دینے لگے جب آخری مٹی تو اس نے سر
آہستہ سے جھکایا، گرا خود بھی خاک پر۔

نزدیک آکے بوڑھے نے تب اس سے یوں کہا :
"پیچھا ہمارا چھوڑ دے او خود پسند جا!
ہم لوگ جنگلوں میں پلے ہیں، ہمارے ہاں
قانون ہے، سزا ہے، نہ پھانسی، نہ سختیاں
آہیں نہ لیں، نہ خون کسی کا بہائیں ہم
پر خونیوں کے سائے سے دامن بچائیں ہم
آزاد زندگی کے نہیں ہیں یہ راستے
آزادی تجھ کو چاہیے صرف اپنے واسطے
تیرا خمیر اور ہے، راس آئے گی نہیں
یہ سادگی کہ جس میں بناوٹ کوئی نہیں
تو ساتھ ہوگا تو تری آواز آئے گی
گزرے گی ناگوار، بہت دل دکھائے گی
ہم دل کے صاف لوگ ہیں، ہم میں سہار ہے
تو بدمزاج شخص ہے، بےاختیار ہے
تیرا ہمارا ساتھ نہیں، جا معاف کر
وہ تیرا راستہ ہے، مبارک تجھے سفر"

یہ کہہ چکا تو چلنے کو خیمے اٹھا لیے
وہ خوفناک رین بسیرا اجاڑ کے
بنجارے سارے شور مچاتے ہوئے چلے
جب لاد کر وہ چل دئے، بستی اجڑ گئی
اجڑی زمیں پہ اور بھی کچھ گرد پڑ گئی
میدان نامراد رہا، اس میں کیا بچا
چھکڑا پھٹے پرانے سے قالین کا بچا
وہ حال جیسے بھور دھندلکے میں ہو کبھی
سردی شروع ہونے میں دو چار دن رہے
کھیتوں سے اڑ کے جاتے ہیں سارس رہے سہے
کرتی ہے رخ جنوب کو ان کی سفید ڈار
بازو ہوا میں، چیخ فضا میں، دلوں میں پیار
گولی لگے کسی کے تو گرتا ہے ٹوٹ کر
اپنے سفر نصیب رفیقوں سے چھوٹ کر
شہپر کا زخم پاؤں کی زنجیر ہے اسے

تنہائی ایک موت کی تصویر ہے اسے
اب رات آئی، رات کا اجڑا سہاگ ہے
چھکڑے میں روشنی، نہ انگیٹھی میں آگ ہے
گزرے گی کیسے رات چڑھی چھت کے سائے میں
سونا کہاں کا، آنکھ بھی لگنے نہ پائے گی
تنہائی اس کو خون کے آنسو رلائے گی

خاتمه

جادو ہے کوئی شاید اس نغمہ سرائی کا
جس نے مری یادوں میں
بھولے ہوئے چتروں کو رہ رہ کے ابھارا ہے
دکھ سکھ کے وہی منظر، وہ دھند، وہ اجیالے
آئے ہیں تصور میں، خوابوں نے پکارا ہے
اس ملک کی یاد آئی *
جس ملک میں مدت تک اٹھے ہیں بہت فتنے
گونجے ہیں بہت نعرے
جس ملک میں طاقت سے مجبور ہوا ترکی
روسی نے نئی سرحد منوا کے دکھا دی ہے اک شان بہادر کی
دو سر کا وہی شاہیں ** کرتا ہے صدا اب بھی
گزری ہوئی عظمت کا دیتا ہے پتہ اب بھی
اس ملک کے چٹیل سے میدان میں بنجارے
آثار قدیمہ کی سرحد سے گزرتے ہیں
دیکھے ہیں بہت میں نے
ان خانہ بدوشوں کے بے رنج و ضرر چھکڑے
بچوں کی طرح خوش خوش بھرتے ہیں یہ طرارے

---

* اشارہ ہے بسرابیہ کی طرف جہاں پوری اٹھارویں صدی میں روس اور ترکی کے درمیان لڑائی چلتی رہی۔ ۱۸۱۲ء میں بسرابیہ روس کو مل گیا اور یہاں سرحد قائم ہوئی۔ (ایڈیٹر)

** روس کی زارشاہی کا سرکاری نشان۔ (ایڈیٹر)

کیا شوخیاں کرتے ہیں!
سنسان بیابان میں اکثر یہ ہوا، میں بھی
اس بھیڑ میں جا پہنچا، کچھ دور چلا میں بھی:
جو رزق ملا کھایا
جو آگ ملی تاپی
ایسی بھی کٹیں راتیں
تکیہ نہ کوئی بستر
بس سو گئے کھاپی کر
وہ رینگنا چھکڑوں میں، جی کھول کے وہ گانا، مجھ کو بھی
پسند آیا
سنگیت کی سرمستی، انداز وہ مستانہ، مجھ کو بھی پسند آیا
مریولا کا نازک سا یہ نام سنا میں نے
اور ایک زمانے تک یادوں میں چنا میں نے
پر صاف کہوں تم سے
قدرت کے، غریبی میں پالے ہوئے، فرزندو!
آزاد منش بندو!
کہتے ہیں خوشی جس کو تم نے بھی نہیں پائی
وہ راس نہیں آئی!
پیوند لگے ڈیرے راحت کو ترستے ہیں
اور سائے میں ان کے بھی پلتے ہیں بڑے موذی
وہ خواب جو ڈستے ہیں؛
ویران زمینوں پر یہ چلتی چھتر چھایا
انسان نے اس میں بھی دکھ سے نہ مفر پایا
ہر سمت رکی راہیں، ہر سمت کھڑی ہیں یہ کم بخت
تمنائیں
تقدیر کے حملوں سے تدبیر نہیں بچتی، جائیں تو کہاں
جائیں؟
۲۴ — ۱۸۲۳ء

تانبے کا شہ سوار

پیش لفظ

جس واقعے کے بارے میں یہ نظم ہے اس کی بنیاد ایک حقیقت پر ہے یعنی سیلاب کی تفصیلات اس زمانے کے رسالوں سے لی گئی ہیں۔ شائقین بیرخ کی کتاب * دیکھ سکتے ہیں۔

تمہید

جہاں منہ زور دھارے ساحلوں کو توڑ دیتے تھے
وہ اپنی سوچ میں گم تھا، کنارے پر قدم رکھے
خیال اونچے، نگاہیں دور، چوڑے پاٹ کا دریا
بدلتا کروٹیں، انگڑائیاں لیتا؛
کہیں اک آدھ خستہ حال سی ڈونگی
جھکولے کھاتی جاتی تھی؛
کبھی لہراتی جاتی تھی۔
دھنساؤ تھی زمیں، کائی لگے کچے کناروں کے

---

* یہاں مطلب اس کتاب سے ہے جس کا نام ہے ''سینٹ پیٹرس بورگ کے تمام گذشتہ سیلابوں کی تفصیلی خبریں،، (سینٹ پیٹرس بورگ، ١٨٢٦ء) ۔ (ایڈیٹر)

ادھر آدھر گھروندے تھے
ٹھکانے گھاٹیوں، کم بختی ماروں کے۔
گھنا جنگل تھا چاروں سمت، سائیں سائیں ھوتی تھی
اجالا دن کا غائب،
دھوپ کہرے میں کہیں منھ ڈھک کے سوتی تھی
خیال آیا اسے:
ھم اس جگہ سے سویڈن کا زور توڑیں گے۔
یہاں بنیاد ڈالی جائے گی اک شہر کی اور یہ
اسی مغرور ھمسائے کی ضد پر کرکے چھوڑیں گے
ھمارے حق میں قدرت سے ھوا ھے فیصلہ صادر
کہ کھڑکی کھول دی جائے یہاں یورپ کی سمت آخر،
کھڑے ھوں ڈٹ کے ھم، رکھیں سمندر پر قدم اپنے
نئی انجانی لہروں میں جہاز آئیں گے اس جانب
ھمارے میہماں بننے کو، لہراتے علم اپنے
جہاں ھے آج جنگل، کل یہیں منگل منائیں گے
کھلے میدان میں جی کھول کر دھومیں مچائیں گے

ابھی سو سال گزرے تھے کہ یہ نوخیز شہزادہ
دیار نیم شب کے حسن میں ھر شہر سے زیادہ
اندھیرے جنگلوں میں سے
بھبکتی دلدلوں میں سے
نرالی شان سے ابھرا، ھوا شوخی پہ آمادہ؛
جہاں سو سال پہلے تک، وھی ”فن“، قوم کے مچھوے
بہت آفت زدہ پھرتے رھے قدرت کے سوتیلے
پھٹے حالوں گزر کرتے رھے نیچے کناروں پر
پرانے جال پھیلاتے رھے ان دیکھے دھاروں پر
وھیں اب جگمگاتی، جاگتی پتھر کی دیواریں
کھڑی تھیں سر اٹھائے اور موجیں ان سے سرماریں
بڑے بھاری محل تھے اور عالی شان میناریں
جہاز ان گودیوں کے رخ پہ آتے تھے زمیں کے کونے کونے سے
جو رونق کی جگہ تھیں اور مالامال سونے سے
ادھر دریائے نیوا کے بدن پر چڑھ گئے پتھر

کمانی دار پل ھی پل بنے پانی کی چھاتی پر
جزیروں میں سے گھرے سبز باغوں کے گھنے سائے
بڑھے دریا کے اوپر ھاتھ پھیلائے
بنا یہ پائے تخت ایسا
کہ اس کا سامنا کیسا
پرانی راجدھانی ماسکو یوں ھو گئی باسی
نئی رانی کے آگے
جیسے گھنوں میں لدی پچھلے کسی راجہ کی رنواسی

محبت ہے مجھے تجھ سے، بنایا تجھ کو پیٹر نے
یہ سانچے میں ڈھلے گمبھیر منظر ھیں مجھے پیارے
یہ کس بل تیرے نیوا کے، یہ اس کا شان سے بہنا
کناروں کا پٹاؤ اور چٹانوں کا چڑھا رہنا
یہ گل بوٹوں کے جنگلے اور باڑیں تیری لو ہے کی،
یہ راتیں کھوئی کھوئی سی،
یہ دن چھپتے، اندھیرے سے اجالے کی ملاقاتیں،
تری بے چاند کی یہ چاندنی راتیں،
کہ میں کمرے میں جب بےلیمپ کے لکھتا ھوں، پڑھتا ھوں
جدھر دیکھو، حویلی ھی حویلی ہے بڑی بھاری
کھڑی سنسان سڑکوں پر، جھلکتی، نیند کی ماری
ادھر سے ''ایڈمیرلٹی،، کی سوئی روشنی دیتی
اندھیرا رات کا اترے تو کیونکر
ان سنہرے آسمانوں پر
شفق خود ھی بدلتی رھتی ہے اوپر تلے چادر
یہاں شب آدھ گھنٹے کے سوا مہلت نہیں لیتی۔
میں تیرا اور ترے بے رحم جاڑوں کا ھوں متوالا
ھوا جب بند ھو جاتی ہے اور کٹتا ہے جب پالا
اڑے پھرتے ھیں نیوا کے کنارے جن دنوں زن زن
وہ بے پہیے کے تانگے، راس جن کو برف کی پھسلن
تو کتنے خوبصورت لڑکیوں کے گال ھوتے ھیں
دمکتے ھیں، گلابوں سے زیادہ لال ھوتے ھیں
گمکتی، چمچماتی، گونجتی ہے ناچ کی محفل

چھڑے چھانٹوں کی دعوت میں جمع ہوتے ہیں بگڑے دل
انھی میں جھاگ اڑاتے، کھنکھناتے جام آتے ہیں
اگر "پچ میل"، ہو تو نیلے شعلے کام آتے ہیں
مجھے پیاری ہیں یہ فوجی پریڈیں "مارسوو میدان" کی
جہاں پیدل کی رپ رپ اور سواروں کے رسالے بھی
بڑی مردانگی ہے، زندگی ہے ان جوانوں میں!
ہے یک رنگی مگر کیا دل کشی ہے ان جوانوں میں!
قدم اپنے ملا کر جب صفیں ہٹتی ہیں، بڑھتی ہیں
اترجاتی ہیں لہروں کی طرح اور پھرسے چڑھتی ہیں
اٹھائے فتح کے پرچم، اڑاتے جھنڈیاں ان کی
چمک اٹھتی ہیں جب تانبے کی فوجی ٹوپیاں ان کی
پڑی ہیں گولیاں ان پر، لڑائی کے نشاں ان کی
یہ جنگی راجدھانی تیرا نظارہ!
دھوئیں کی دھار، توپوں کی گرج، سب کچھ مجھے پیارا
جب آدھی رات کی رانی
محل میں زار کے جنتی ہے بیٹا یوسف ثانی
کہیں سے جب خبر آتی ہے دشمن کو ہرانے کی
سلامی روس کو دیتی ہیں توپیں فتح پانے کی۔
اڑاتا برف کے ٹکڑے
بسنت آنے کی دھن میں جھومتا، دھومیں مچاتا
جب سمندر کی طرف نیوا بڑھا جائے
مجھے اس سے محبت ہے،
مجھے اس شہر کی اک اک ادا پر دل سے پیار آئے۔

نکھر، ہاں شہر پیٹر کے، ترا حسن اور بھی نکھرے!
کھڑا ہو روس کے مانند تن کر
ہاں، جھکیں گے تیرے قدموں پر
عناصر اپنی مٹھی میں ہیں، اب رہتے نہیں بکھرے؛
کہو "فن"، سے کہ وہ اپنی پرانی دشمنی اور قیدیوں کی
رٹ لگانا بھول جائے

آخری آرام میں ہے اس جگہ پیٹر
خبردار، اب کوئی فتنہ یہاں اٹھنے نہ پائے!

اک آفت آئی تھی اس شہر پر ایسی
دلوں میں آج بھی تازہ ہے یاد اس کی...
عزیزو، دوستو! گزری ہوئی بپتا سناتا ہوں۔
دکھے گا دل، مگر میں آپ کو قصہ سناتا ہوں۔

پہلا حصہ

بجھا سا شہر تھا پتروگراد اور سنسناتی تھی
نومبر میں خزاں کی بن بلائی میہماں سردی
مچاتا شور غل، شرائے بھرتا
اپنی سب حدبندیوں کو پار کرتا
اس طرح نیوا تڑپتا تھا وہاں
جیسے کوئی بیمار بستر پر مچلتا ہے
(جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتا ہے)
اندھیری رات میں بوچھار کھڑکی پر اکھرتی تھی
ہوا اس زور سے چلتی کہ گویا بین کرتی تھی
غرض ایسے میں جب تھا ہر طرف طوفان کا سایا
کہیں مہماں گیا تھا ایوگینی، اپنے گھر آیا
ہم اس کو ایوگینی ہی کہیں گے اس فسانے میں
کہ کانوں کو بھلا لگتا ہے یہ نام اور پھر یوں بھی
قلم میرا رہا مانوس اس سے اک زمانے میں
ضرورت کیا ہے اس کا خاندانی نام لکھنے کی،
کبھی مشہور تھا شاید: کرامزین * کے قلم سے بھی
جگہ اس نام نے پائی وطن کی داستانوں میں
مگر سب بھول بیٹھے، گم ہوا کب کا فسانوں میں
ہمارا نوجواں ہیرو

---

* کرامزین مشہور روسی مورخ (١٨٢٦ء — ١٧٦٦ء)
جنھوں نے روس قدیم کی مبسوط تاریخ لکھی ہے۔ اس تاریخ
میں مشاہیر پیر کے خاندانوں کے نام بھی آتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

کہیں پر نوکری کرتا ہے
کولومنا میں رہتا ہے ؛
بڑے لوگوں سے ہے وحشت، نہ اک لینی نہ دو دینی
نہ غم گزرے عزیزوں کا، نہ دکھ ماضی کے سہتا ہے

گھر آیا ایوگینی، کوٹ جھاڑا اور سونے کو
اتارے اپنے کپڑے، اور گرمی دی بچھونے کو
مگر سو طرح کی الجھن نے گھیرا
دیر تک ہوتی رہی ہلچل خیالوں میں
خیال ایسے کہ خود سوئیں، نہ سونے دیں
کبھی سوچے کہ کیسی مفلسی تھی، کس قدر مشکل
سے آزادی ملی ہے اور ہوا ہوں میں کسی قابل ؛
کبھی سوچے، خدا گر مہرباں ہوتا
رقم ملتی، سمجھ ملتی، چنیں ہوتا، چناں ہوتا
بھلا دیکھ تو ہیں دنیا میں کتنے خوش نصیب ایسے
کہ جن کی عقل میں ہے گانٹھ، لیکن گانٹھ میں پیسے
نہ کچھ کرنا نہ دھرنا ہے، اڑاتے ہیں مزے کیسے!
ادھر میں ہوں کہ ہے دو سال سے بس کام کا چکر ؛
کبھی سوچے کہ موسم کے زرا بگڑے ہیں کچھ تیور
چڑھا آتا ہے پانی
اور نیوا میں ہے طغیانی
عجب کیا جو ہٹائے جا چکے ہوں پل بھی دریا سے
نہ ملنا ہو سکے دو چار دن اپنی پراشا سے۔
جدائی کا خیال آتے ہی دل سے آہ سی نکلی
وہ شاعر کی طرح الجھا تو یہ الجھن بڑی نکلی :
”کروں شادی؟ مگر کیسا رہے گا؟
کیوں نہیں؟ — کرلوں
زرا مشکل تو ہوگی،
پھر بھی کرنی ہے وہیں، کر لوں،
بدن میں جان ہے اور نوجوانی بھی
لگن بھی ہے مجھے دن رات محنت کی
ٹھکانا کوئی اچھا سا سلیقے کا کہیں کر لوں ؛

پراشا کو بسا لوں ہو جو اطمینان کی صورت
سجا لوں من کے مندر میں اسی دیوی کی اک مورت
برس دن ہونے آئے گا تو تم جانو
کہ گھر میں بال بچہ ہو
ملے تنخواہ، لاؤں، اس کو دوں، وہ جانے گھر جانے
وہی پالے گی بچوں کو، وہی یہ درد سر جانے...
مزے سے ہاتھ میں ہم ہاتھ تھامے دن گزاریں گے
جب اپنی عمر کو پہنچیں گے دنیا سے سدھاریں گے
نواسے پوتے کاندھا دیں گے، مٹی میں اتاریں گے...''

خیال آتے رہے، جاتے رہے۔ اس رات سینے پر
دھرا تھا جیسے اک پتھر
غرض یہ آرزو کرتے
کہ اچھا تھا اگر طوفان ٹل جاتا
نہ یوں غصے میں بارش کھڑکیوں پر سر پٹکتی
اور نہ یوں جھونکے گزرتے
ہائے واویلا مچاتے، تو مرے سینے سے یہ کانٹا نکل جاتا
یہی اک آس دل بہلا گئی آخر
پپوٹے جھک چلے تھے نیند اس کو آگئی آخر۔
ڈھلی جب رات طوفانی
تو کچھ ہلکے ہوئے جھونکے
وہ دن نکلا تھپیڑے جس نے کھائے تھے ہواؤں کے
وہ پھیکا دن
مصیبت کا، غمی کا دن!
پھر کر رات بھر نیوا نے پٹکا سر
سمندر کی طرف طوفان کی زد پر
مگر ان چیختے چنگھاڑتے دھاروں پہ کیا قابو
ملا رستہ نہ دریا کو، نہ ریلے پر چلا قابو
صبح کو بھیڑ تھی، انبوہ تھا اس کے کناروں پر
تماشا دیکھتے تھے لوگ جھک جھک کر
مزا چھینٹوں کا لیتے تھے
نظارہ کر رہے تھے ان پہاڑوں کا

جنھیں بپھرا ہوا پانی اٹھاتا تھا
مگر اتنے میں کھاڑی سے
بڑھے اس زور کے جھونکے
کہ نیوا سامنے کی مار کھا کر ہو لیا پیچھے
وہ اپنی رو میں یوں غصے سے بل کھاتا ہوا پلٹا
جزیروں کو ڈبویا اور غراتا ہوا پلٹا
ہوا کچھ اور بھی بگڑی
ادھر موسم نے دی ٹکر
تو نیوا ہو گیا آپے سے باہر
اور ابلتا، کھولتا، چنگھاڑتا یوں شہر پر جھپٹا
بڑھے جیسے کوئی خونی درندہ طیش میں آ کر
اسے دیکھا جو یوں بڑھتے ہوئے آگے
تو سناٹا ہوا جب سب کے سب بھاگے
زمیں کے نیچے تہہ خانوں میں دراتا بڑھا پانی
تو نہریں سیخچوں سے پھٹ پڑیں اتنا چڑھا پانی
کمر تک پانی ہی پانی تھا، اس میں پیتروپول ایسے
کھڑا تھا ، جھومتے جاتے ہوں اندر دیوتا جیسے...

گھرے نرغے میں، یورش! ہر طرف سے کر دیا ریلا
گھسی ہیں کھڑکیوں میں، چور لہروں نے کیا ریلا
پٹیلے دوڑتے ہیں،
ان کے ٹکرانے سے چکنا چور ہیں شیشے
سڑک پر تیرتے پھرتے ہیں:
گالے تربتر ، ٹوٹے گھروندے اور کڑی تختے،
گوداموں کے ذخیرے، مال کے پھولے ہوئے بورے،
غریبوں کی جمع پونجی
کہ آڑے وقت کام آنے کو رکھی تھی۔
جو پل طوفان کے جھٹکوں نے توڑے ہیں، اکھاڑے ہیں
وہ تابوت اور لاشے، جن کے قبرستان اجاڑے ہیں
سڑک پر تیرتے پھرتے ہیں
خلقت کانپتی ہے
دیکھیے اب کس بلا کا سامنا ہوگا

خدا کا قہر نازل ہو گیا، انجام کیا ہوگا؟
غضب ہے، موت کے منھ میں چلا جاتا ہے گائے بیل کا گلہ ٦٩
جڑےگا اب کہاں سے اس قدر سامان اور غلہ
اس آفت کے برس جب کام سارے روس کے
ہاتھوں میں تھے مرحوم زار روس کے*
چھجے پہ وہ غم سے سرا سیمہ نکل آئے
جو اپنی بے بسی دیکھی تو یہ دو بول فرمائے:
"مشیت میں خدا کی بادشاہوں کو نہیں چارہ"
نظر کے سامنے تھا ایک بربادی کا نظارہ
وہ بیٹھے تک رہے تھے اور آنکھیں غم میں ڈوبی تھیں
کھلے میدان جھیلیں بن گئے تھے
اور اس دریاؤ میں سڑکیں کہیں ادھم میں ڈوبی تھیں
محل گویا جزیرہ تھا
کوئی آفت زدہ ٹیلا
ادھر سرکار نے اک حکم فرمایا
ادھر سے ان کے خاص الخاص جنرل دوڑ کر آئے
بڑھے ایک اک سرے سے
دور کے، نزدیک کے ہر راستے سے
جہاں طوفان کی شورش تھی، پانی میں اترآئے
بچانے ان کو جو سیلاب کی دہشت کے مارے تھے
انھیں بھی جو گھروں میں ڈوبتے تھے، بے سہارے تھے

تبھی کا ذکر ہے، منظر یہ پیٹر چوک میں دیکھا
جہاں زینے پہ یوں پنجے اٹھائے اور زرا اچکے
کھڑے دو شیر پہرہ دے رہے ہیں جیسے سچ مچ کے
وہاں اک سنگ مرمر کے ببر کی پیٹھ پر چڑھ کر
بچارا ایوگینی یونہی ننگے سر
جما بیٹھا تھا دونوں ہاتھ باندھے اپنے سینے پر

---

* الیکساندر اول جس کا انتقال ١٨٢٥ء میں ہوا۔
(ایڈیٹر)

دھاکے سے اڑا تھا رنگ چہرے کا
مگر اس کو نہ تھی اپنی کوئی پروا
نہ اتنا تن بدن کا ہوش باقی تھا
کہ طوفان بلانوش اور اونچا ہو گیا — یعنی
پہنچتا ہے مرے تلووں تلک پانی
نہ اس کی فکر تھی بوچھار میرے منھ پہ پڑتی ہے
ہوا یوں ہوکتی ہے جیسے غصے میں بگڑتی ہے
نہ اس کو ہوش تھا ٹوپی اڑا کر لے گیا جھونکا۔
اداسی چھا گئی تھی اس کی آنکھوں میں
مگر وہ ٹکٹکی باندھے کسی جانب کو تکتا تھا
اور اس جانب پہاڑوں کی طرح موجیں
ابلتی تھیں کہیں گہرائی سے، طوفان برپا تھا
مکانوں کے ہوئے جاتے تھے دس ٹکڑے
اچھلتے، ڈوبتے اس سمت سے آتے تھے بس ٹکڑے
خدایا خیر، یا رب خیر، کیا اندھیر ہے یارب!
مٹا ڈالےگا سب کا سب!
وہیں سیلاب کے نزدیک، بالکل پاس کھاڑی کے
وہیں بدرنگ جنگلے کا
گھروندا تھا پرانا سا
وہیں پر سائے تھے پھیلے ہوئے ایوا کی جھاڑی کے
وہیں وہ دونوں رہتی تھیں پراشا اور بوڑھی ماں
پراشا خواب میرا، زندگی میری تھی، میری جاں
یہ کیا ہے؟ خواب ہے، خواب پریشاں دیکھتا ہوں؟ یا
ہماری زندگی خود خواب ہے اک — بے حقیقت سا،
زمیں پر آسمانوں کو ہنسی چھوٹی ہے؟ ہاہاہا!

وہ ایسے، جیسے جادو سے گڑا ہو
سنگ مرمر میں جڑا ہو
بس وہیں بیٹھا رہا اور ٹس سے مس ہونے نہیں پایا۔
چڑھا دریا تو پھر پانی ہی پانی ہر طرف چھایا۔
مگر اس کی طرف سے پیٹھ موڑے، منھ پھرائے

اور اٹل اونچائی سے بازو اٹھائے
یوں کھڑا تھا دیوتا — تانبے کے گھوڑے کی رکابوں میں
قدم رکھے *
کہ نیوا کو جلال آیا تو اس کی سرکشی پر اپنی شکتی کا
بھرم رکھے

دوسرا حصہ

غرض بربادیاں پھیلا چکا تو جھک گیا دریا
کمینے پن کے ھنگاموں سے آخر تھک گیا دریا
چلا اب الٹے پاؤں سرکشی پر ، برھمی پر اپنی خوش ھوتا،
تو بے پروائی سے مال غنیمت راہ میں کھوتا
کہ جیسے گاؤں پر جب غول چڑھتا ھے لٹیروں کا
الٹ دیتے ھیں ظالم سنگ دل اس گاؤں کا تختہ
کہیں توڑیں گے، کاٹیں گے، اکھاڑیں گے، پچھاڑیں گے
کسی کو پیس ڈالیں گے، کسی کی جیب جھاڑیں گے
جھپٹ لیتے ھیں سب کچھ مارپیٹ اور دھینگا مشتی سے
دبا کر گالیوں سے، دھمکیوں سے اور کشتی سے
ادھر گاؤں میں ھاھاکار مچتی ھے، ادھر ڈاکو
اٹھائے لوٹ کا مال اور تھکن سے چور، بے قابو
کہیں پیچھا نہ ھو اس ڈر سے گھر کو بھاگ جاتے ھیں
جو مال اٹھتا نہیں ان سے، اٹھاتے ھیں، گراتے ھیں

زرا اترا جو پانی
کم ھوئی نیوا کی طغیانی
کھلی سڑکیں تو میرا ایوگینی تیز قدموں سے
امیدوبیم کے عالم میں دل تھامے ھوئے نکلا
چلا دریا کی جانب جو ابھی مشکل سے ٹھیرا تھا
ابھی سیلاب کی موجیں
فتح کے نشے میں سرشار تھیں

---

* پیٹرسبرگ میں پیٹراول کی یادگار جس کو فالکونے نے بنایاتھا۔ (ایڈیٹر)

اور بدمزاجی میں ہوا سے برسر پیکار تھیں
ابھی تک جوش میں دریا تھا — اس کی تہہ میں انگارے
سلگتے تھے اور اوپر جھاگ کے چھٹتے تھے فوارے
ابھی تک سانس تھا نیوا کا بوجھل، دم بہت تھوڑا
کہ جیسے ہانپتا ہو جنگ سے بھاگا ہوا گھوڑا
وہاں پہنچا جو ایوگینی
تو کشتی گھاٹ پر پائی
وہ دوڑا جیسے کوئی گمشدہ دولت نظر آئی
صدا دی اس نے مانجھی کو
میاں اس پار پہنچا دو
تو لاپروائی سے مانجھی
دوانی پر ہوا راضی
بھیانک ہوں تو ہوں لہریں، کھلا لنگر، چلی کشتی

تجربےکار کشتی بان ان طوفانی لہروں سے
لڑا کچھ دیر تک جم کر ، کبھی ڈوبے، کبھی اچھلے
جو تھے بیکل سوار اس پر
تو بیکل تھی سواری بھی
بچی مشکل سے جان آخر ، کنارے جا لگی کشتی
وہ قسمت کا ستایا
اس سڑک پر ، ان جگہوں پر دوڑ کر آیا
جو اس کی جانی پہچانی تھیں -
لیکن دیکھتا کیا ہے
کہ پہچانا نہیں جاتا کچھ ایسا حلیہ بگڑا ہے
پڑا تھا سامنے نظروں کے سب کا سب تہہ و بالا
ادھر ٹوٹا، ادھر لوٹا ، کہیں پھینکا، کہیں ڈالا
نہ تھا سامان رکھنے کو، نہ کوئی اس کا رکھوالا -
جو باقی تھے کمر ٹوٹی ہوئی تھی ان مکانوں کی
کہیں ملبے کے نیچے قبر تھی پچھلے ٹھکانوں کی
سرک آئے تھے کچھ بنیاد سے پانی کے ریلے میں
وہ ستھراؤ تھا جیسے جنگ کے میدان میں لاشیں -
مگر وہ اپنی دھن میں منھ اٹھائے چل دیا سیدھا

نہ کھلتی تھی زباں غم سے، نہ اس کی یاد میں کچھ تھا
ادھر دوڑا ہوا جاتا تھا ایوگینی
جہاں پر ایک انجانی مصیبت راہ تکتی تھی
لفافہ بند اوپر مہر تھی گویا
مگر تقدیر کی لکھی تھی، ٹالے ٹل نہ سکتی تھی
کنارے شہر کے، پوروے میں جب لپکا ہوا پہنچا
تو کھاڑی مل گئی — لیکن جو اس کے پاس ہی گھر تھا؟
کہاں ہے وہ؟ یہیں پر تھا...
ٹھٹک کر رہ گیا، پیچھے ہٹا، پھر اور بھی پیچھے
یہاں دیکھا، وہاں دیکھا، اگر ہو تو دکھائی دے
یہی تو وہ جگہ ہے، گھر یہیں تھا، کیا ہوا آخر؟
یہ ہے ایوا کی جھاڑی — گھر کہاں ہے پھر؟
یہاں پھاٹک تھا — شاید بہہ گیا ہوگا!
مگر وہ گھر کہاں ہے؟ کچھ نشاں تو رہ گیا ہوگا!
پھرا چاروں طرف لیکن نشاں باقی نہ سایہ تھا
وہ چکر کاٹتا تھا اور کلیجہ منہ کو آیا تھا
کبھی خود سے الجھتا، دل کو سمجھاتا تھا بے چارہ
پھر اکدم ہاتھ ماتھے پر پٹک کر قہقہہ مارا۔

کٹا وہ دن بھیانک رات آئی
اور تاریکی لرزتے شہر پر چھائی
مگر پچھلے پہر تک آنکھ ہی لگنے نہیں پائی
ڈرے تھے لوگ کچھ ایسے کہ اوروں کو ڈراتے تھے
جو دن بیتا تھا اس کے رات بھر قصے سناتے تھے۔

کرن جب صبح کی نکلی
تھکے، بے جان، پھیکے بادلوں کی آڑ سے ہو کر
کئے تابندہ پائے تخت کے سنسان بام و در
مگر بیتے ہوئے دن کی مصیبت کا
کہیں نام و نشاں باقی نہیں پایا
شفق نے اپنی عنابی سی اک چادر بنا ڈالی
اجالا صبح کا پھیلا تو بدرنگی مٹا ڈالی

چلی تو زندگی پھر چل پڑی پہلے کے ڈھرے پر
کھلی سڑکوں پہ نکلے لوگ اپنی بے حسی لے کر
سدھارے اپنا اپنا شب بسیرا چھوڑ کر بابو،
بجانے نوکری لپکے ہوئے جاتے تھے بے قابو
ادھر وارے نیارے کرنے والا تیز بیوپاری
اٹھا دوکان پھر سے کھولنے، ہمت نہیں ہاری
جو تہہ خانوں میں تھا
نیوا کے دست ظلم سے باقی کھرا کھوٹا
اسی کو پھر جمایا:
لاؤ میں ہمسائے سے پورا کروں ٹوٹا
مکانوں سے بڑھے کچھ لوگ اپنی کشتیاں لے کر
نواب اگلے زمانوں کا
خووستوف ایک شاعر تھا چہیتا آسمانوں کا
قلم برداشتہ وہ لکھ گیا اشعار لافانی
کہ کیسے شہر ڈوبا اور ہوئی نیوا میں طغیانی

مگر افسوس،
وہ میرا بچارہ، غم کا مارا ایوگینی تھا
کہ اس کی عقل ہی جاتی رہی، ایسا پڑا صدمہ
ہواؤں کے تھپیڑے اور اس طوفان کے دھارے
بجاتے تھے ابھی کانوں میں نقارے
ابھی تک کان پھٹتے تھے
اسی اک شور کے مارے
لبوں پر مہر تھی، پاؤں میں چکر، سر میں تھا سودا
وہ جیسے خواب کے عالم میں بےآرام پھرتا تھا
کٹے یوں سات دن، گزرا مہینہ بھر
نہ بھولے سے کبھی لوٹا وہ اپنے گھر
ہوئی میعاد تو مالک نے سوچا، گھر ہوا خالی
کرائے پر کسی قلاش شاعر کے
حوالے کر دیا اور سونپ دی تالی
نہ آیا ایوگینی پھر کبھی سامان لینے کو۔
وہ دنیا کی نظر میں اجنبی ٹھیرا تو — آمادہ

نہ تھے پہچان والے بھی اسے پہچان لینے کو ۔
وہ سارے دن یونہی پیدل بھٹکتا تھا
کبھی گھاٹوں پہ سو جانا
کہیں پر کھڑکی سے ٹکڑے مانگنا، کھانا
بدن پر چیتھڑے اور چیتھڑوں میں ایک دیوانہ
شرارت ہر جگہ بدذات بچے کر گزرتے تھے
اسے پیچھے سے پتھر مارتے تھے، شور کرتے تھے
ہٹاتے راہ سے چابک اڑا کر کوچوان اس کو
کہ چلنے میں کبھی رہتا نہ تھا سڑکوں کا دھیان اس کو
یہ لگتا تھا کہ سب اس کی بلا سے
جو گزرنی ہے گزر جائے
وہ اندر شور محشر تھا کہ باہر کی
نہ — کانوں تک خبر جائے
گھسیٹے جا رہا تھا جیسے تیسے زندگی کے دن
نہ بن باسی، نہ انسانوں کی بستی کا کوئی ساکن
نہ زندہ تھا، نہ مردہ، بھوت لگتا تھا، نہ کوئی جن ۔

یہ جاتی گرمیوں کا ذکر ہے، بارش کا موسم تھا
کہ اک دن سوتے سوتے گھاٹ پر نیوا کے وہ اٹھا
برے آثار تھے:
دیوار سی موجوں کی اٹھ اٹھ کر
کبھی گھاٹوں میں چڑھ جاتی
کبھی جھاگوں میں بڑھ جاتی
کبھی پٹری کی چکنی سیڑھیوں سے مارتی ٹکر
کوئی انصاف جیسے مانگتا ہو اور پٹکے سر
عدالت ایسی غافل، جوں نہ رینگے اس کے کانوں پر
اٹھا وہ غم کا مارا نیند سے
دیکھا، فضا مرجھائی تھی ساری
زمیں پر ابر کے آنسو، ہوا میں گریۂ وزاری
اندھیری رات تھی اور دور کوئی سنتری گویا
ہوا کی دکھبھری آواز پر آواز دیتا تھا...
اٹھا جب ایوگینی چونک کر تصویر سی ابھری

جو بیتی تھی مصیبت، یاد میں پھر سے وہی ابھری
وہ گھبراھٹ میں قدموں پر سنبھلنے بھی نہیں پایا
چلا بس منھ اٹھائے بےخبر ہوکے
کہیں پر ایک دم ٹھٹکا، قدم روکے
بہت آھستہ سے نظریں گھمائیں،
ہر طرف دیکھا
برستی تھی مگر چہرے پہ وحشت، خوف طاری تھا
انھی کھمبوں کے آگے اس حویلی پر کھڑا تھا وہ
جہاں زینے پہ یوں پنجے اٹھائے اور زرا اچکے
کھڑے دو شیر پہرہ دے رھے تھے جیسے سچ مچ کے
اندھیرا اور اوپر سامنے ابھرا ھوا پتھر
چٹان اتنی بڑی، چاروں طرف جنگلے کی اک جھالر
بلندی سے اٹھائے ایک بازو — شان سے ڈٹ کر
جمائے اپنا آسن دیوتا تانبے کے گھوڑے پر

یکایک ایوگینی کے بدن میں جھر جھری آئی
خیالوں کی بھیانک رو بری آئی
اسے یاد آگیا — ھاں ھاں!
یہی تھی وہ جگہ ابلا جہاں طوفاں
جہاں خونخوار موجیں طیش میں آکر
چڑھی آتی تھیں سینے پر
یہی وہ شیر ھیں، وہ چوک ھے
اور یہ وہ ھستی ھے
جو ٹس سے مس نہیں ھوتی ھے
اونچائی پہ بستی ھے
اندھیرے میں اٹھائے سیس تانبے کا
یہی ھے جس کے اندھے حکم نے دیکھا نہ بھالا
زعم میں آکر
سمندر کے کنارے شہر چن ڈالا
یہ ھیبت ناک چہرہ اور اوپر سے اندھیرے کا بڑاھالا!
زرا تیور تو دیکھو، جی میں اس کے کیا سمائی ھے!

بھرا ہے کس بلا کا زور، کیا زور آزمائی ہے!
اور اس گھوڑے میں شاید آگ ہے کوئی
بتا مغرور گھوڑے
ہاں کدھر جاتا ہے تو ٹاپیں اٹھائے
اب کہاں ٹیکے گا سم اپنے؟
بڑا شہزور ہے تو بول،
تقدیروں کے مالک، کیا خیالوں میں ہے گم اپنے
بتا ہاں، تو نے پہلے بھی یہی بل آزمایا تھا؟
اڑا کر یوں ہی لوہے کا دھانہ روس کو بھی کیا
الف کرکے اتھاہ گہرائیوں پر جا چڑھایا تھا؟

کئی چکر کئے بیچارے پاگل نے سنگھا سن کے
بہت وحشت بھری اوپر سے نیچے تک نظر ڈالی
تنا بیٹھا تھا اب بھی دیوتا
آدھے جہاں کا وارث‌ووالی
دھواں سا بھر گیا سینے میں
ٹھنڈے سیخچوں پر رکھ دیا ماتھا
پڑا آنکھوں پر اس کی دھند کا پردہ
پرانے زخم سارے چھل گئے، لودے اٹھے دل میں
لہو میں کوئی چنگاری پڑی، شعلے اٹھے دل میں
غم وغصے میں یوں مغرور بت کے سامنے اس نے
مروڑی انگلیاں اور دانت پیسے اس طرح، گویا
کوئی آسیب ہو سر پر، کہا یہ ہونٹ بھینچے
"اوہ، بڑا آیا عمارت ساز!
دکھلاتا پھرا اعجاز!
اب تو ٹھیرجا — تجھ کو دکھاتا ہوں! .."
اتنا کہا اور کانپتا بھاگا
نہ دیکھا دائیں بائیں، منھ اٹھائے، ہانپتا بھاگا
لگا یوں اک نظر میں ایوگینی کو
کہ جیسے زار کے چہرے میں جنبش ہو
وہ لمحے بھر میں غصے کی دمک آئی

کہ آہستہ سے بدلا اور بڑی ویسی چمک آئی
وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلا
اور سناٹے میں جب اس چوک سے گزرا
تو آوازیں سنائی دیں اسے، کرتی ہوئی پیچھا
فٹافٹ ہو رہی ہو، جھنجھناہٹ ہو
زمیں پر زلزلے کی سنسناہٹ ہو
کھڑنجے پر بجیں ٹاپیں، سڑک پر دندناہٹ ہو
ہوا میں ہاتھ اٹھائے
اور پھیکی چاندنی میں جگمگائے
شہسوار آتا ہو تانبے کا
جھپٹ کر کر رہا ہو اس طرح پیچھا
کہ پتھر پر بجے سم اور چنگاری اڑائے
وہ دیوانہ بچارہ، رات بھر دوڑا پھرا —
لیکن جدھر کا رخ کیا، معلوم ہوتا تھا
کہ سر پر آگئی اس کی سواری
سم پٹکتی اور قدم رکھتی ہوئی بھاری۔

وہ دن اورآج کا دن —
جب کبھی اس چوک سے گزرا
پریشانی سے حالت غیر، چہرہ فق
بڑی جلدی میں دل تھامے ہوئے گزرا
تڑپنے میں ہو گویا اک یہی تسکین کی صورت
اتارے ملگجی ٹوپی، نظر نیچی کئے گزرا
وہ یوں سہما گزر جاتا تھا پہلو سے کہ پھر اس نے
نہ سر اونچا کیا، دیکھی نہ پھر تانبے کی وہ مورت۔

سمندر میں نظر آتا ہے — اک ویران چھوٹا سا جزیرہ
اور کبھی جب دیر ہوجائے تو اپنی کھیپ لے کر
اس جزیرے پر مچھیرا جا نکلتا ہے
وہاں ہنڈیا چڑھا دیتا ہے اپنا پیٹ بھرنے
اور کبھی اتوار کو تفریح کرنے
دور سے بجرا بڑھاتا کوئی بابو، آنکلتا ہے

زمیں ہے اس قدر بنجر
نہ بستی ہے، نہ کوئی گھاس کا پتہ نکلتا ہے
وہیں سیلاب سے بہتا بہاتا اک پرانا گھر
کنارے آلگا، جیسے ہو کالا جھاڑ پانی پر
زرا سردی ڈھلی اور برف گلنے کے جو دن آئے
اسے پلوار پر لادا، جزیرے سے اٹھالائے
گھروندا کیا تھا اک برباد غم خانہ
پڑا تھا اس کی چوکھٹ پر مرا بےچارہ دیوانہ
وہ ٹھنڈی لاش تھی، اجلا کفن پہنا دیا اس کو
خدا کے نام پر دفنا دیا اس کو۔

۱۸۳۳ء

پوشکن کی ڈرائنگ اپنی نظم
''سونے کے مرغے کا قصہ''
کے لئے۔ ۱۸۳۴ء

قصّہ

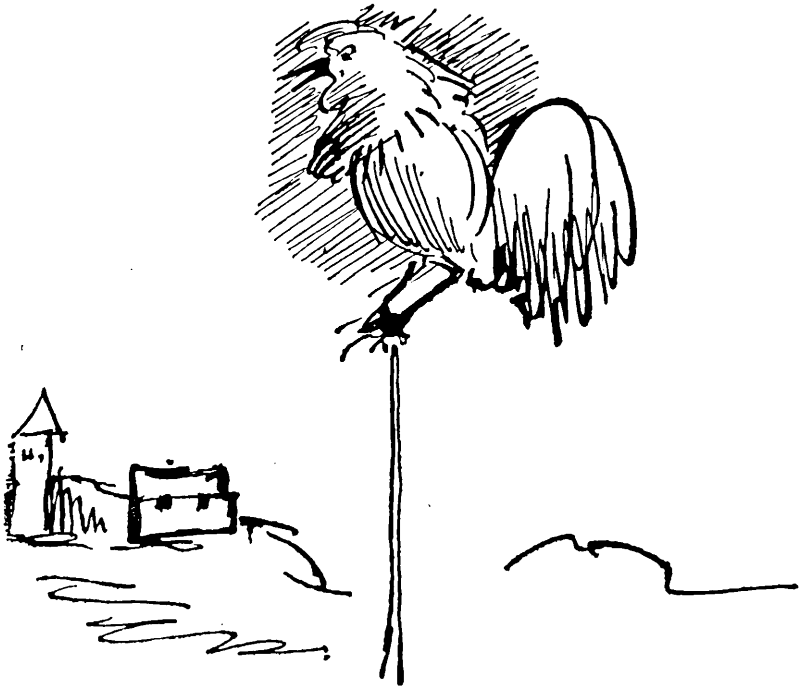

قصّہ مچھلی اور مچھوے کا

نیلے ساگر کے بالکل ہی
پاس پرانی سی کٹیا تھی
اس کٹیا میں بوڑھا بوڑھیا دونوں ساتھ رہا کرتے تھے
پورے تیس اور تین برس سے رہتے اور مزا کرتے تھے
بوڑھا جال اٹھا کر جائے
مچھلی پکڑے، گھر کو لائے
بوڑھیا بیٹھی چرخہ کاتے
چرخہ، چرخ چوں چوں گائے
ایک دفعہ بوڑھے مچھوے نے
پانی میں سے جال سمیٹا
لے دے کے بس نکلی کائی
پھر سے جال بچھا کر کھینچا
اک پن جھاڑی لپٹی آئی
تسرا کے بوڑھے نے اپنا
جال سمندر میں پھیلایا
اب جو جال سمیٹا اس میں دیکھا نکلی کیسی مچھلی!
سچ پوچھو تو سونے کی تھی — کوئی ایسی ویسی مچھلی!
مچھلی منت کرکے بولی
آدمی کی سی بولی ٹھولی
کہنے لگی — '' اے، بوڑھے بابا!
جال کا پھندا کردو ڈھیلا
نیلا ساگر ہے گھر میرا

مجھ کو اپنے گھر جانے دو اپنا مول چکا دوں گی میں
میرا کہنا مانو گے تو منھ مانگا بدلہ دوں گی میں "
بوڑھا چونکا، بچکا، سہما
پورے تیس اور تین برس تک
جال اٹھاتے، جال بچھاتے (گھس گئی، اس کے ہاتھ کی ریکھا)
بولنا مچھلی کا سننے میں آیا اور نہ آنکھوں دیکھا
ڈھیلا کر کے جال کا پھندا
پیار سے بولا بوڑھا مچھوا
" اچھا، بھئی، سونے کی مچھلی، جا، تو، بھی کیا یاد کرے گی
مجھ کو نہیں کچھ لینا دینا، مجھ پر کیا ھن برسادے گی!
جل تھل تیرا سارا آنگن
سیر سپاٹے کر، بہلا من "

لوٹ کے بوڑھا گھر کو آیا
کہہ دی جو دیکھی تھی مایا
بولا " سنتی ہو جی، بڑی بی؟
آج اک مچھلی جال میں آئی
کیا بتلاؤں کیسی تھی وہ؟
کیا کچھ ایسی ویسی تھی وہ؟
سونے کی مچھلی اور بولے
سچ مچ جیسے ھم تم بولیں
کہنے لگی: 'اے بوڑھے بابا،
جال کا پھندا کر دو ڈھیلا
نیلا ساگر ھے گھر میرا
مجھ کو اپنے گھر جانے دو اپنا مول چکا دوں گی میں
میرا کہنا مانو گے تو، منھ مانگا بدلہ دوں گی میں'
میری بھلا کیا ھمت تھی جو
اس سے دام چکاتا، بولو؟
یوں ھی چھوڑ دیا میں نے تو "
یہ سنتے ھی گرجی بوڑھیا، بوڑھے کو پھٹکارا کس کر
" ھت تیرے کی، جنم کے بدھو، عقل پہ تیری پڑ گئے پتھر
تجھ کو مانگنا بھی نہ آیا

موقع پایا اور گنوایا
منھ پھوٹے سے اتنا کہتا ''دلوا دو اچھا سا تسلا
اور ہمارا تو بالکل ہی ہوگیا چھلنی سارا تسلا''

بوڑھا الٹے پاؤں سدھارا
نیلے ساگر پر جا پہنچا
دیکھا کیا نیلے ساگر میں
اٹھیں ہلکی ہلکی لہریں
بوڑھے نے اک ہانک لگائی، سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا:
''کیوں بابا، کیا چاہیے تم کو؟''
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے
''رحم کرو تم مچھلی رانی
بوڑھیا میری ہے دیوانی
اس نے ایسے فیل مچائے
جن سے ناک میں دم آجائے
کہتی کیا ہے، جاؤ، مانگ کے لاؤ ایک نیا سا تسلا
اور ہمارا تو بالکل ہی چھلنی ہوگیا سارا تسلا''
مچھلی بولی ''اچھا بابا
جو مانگا ہے مل جائے گا
غم نہ کرو، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ''

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
ایک نیا تسلا دیکھا، جو
بوڑھیا کے آگے رکھا تھا
دیکھتے ہی وہ کھوسٹ بوڑھیا، اور ہوئی آپے سے باہر
''ہت تیرے کی، جنم کے بدھو، عقل پہ تیری پڑگئے پتھر
تجھ کو مانگنا بھی نہ آیا

بس اک تسلا مانگ کے لایا
تسلا دو کوڑی کی مایا
الٹے پاؤں چلاجا بدھو اور مچھلی سے جھک کر کہیو
تسلا تو دلوایا تم نے، ایک اچھا سا گھر دلوادو ،،

بوڑھا مچھوا اٹھ کر سیدھا
پھر نیلے ساگر پر پہنچا
دیکھا تو نیلے ساگر میں
اب کے اٹھیں زور کی موجیں
بوڑھے نے اک ہانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ بولی:
,, کیوں بابا، کیا چاہیے تم کو؟ ،،
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے
,, رحم کرو سرکار مری تم، جورونے جنجال میں ڈالا
اب تو میری بوڑھیا اور بھی ہوگئی آفت کا پر کالہ
تریا ہٹ سے جینا دوبھر
مانگ رہی ہے ایک نیا گھر،،
مچھلی بولی ,, اچھا بابا
جو مانگا ہے مل جائے گا
یوں ہی سہی، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ،،

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
دائیں بائیں کٹیا ڈھونڈھی
پھر بھی اس کا کھوج نہ پایا
آگے دیکھا ایک ایسا گھر
جس میں روشندان تھا اوپر
پکی اینٹوں کا چوبارہ
اوپر سے چونے کا پچارہ

شیشم کی لکڑی کے پھاٹک
پالش اوپر سے نیچے تک
جگمگ، جگمگ، جگمگ، جگمگ
کھڑکی اوپر جھلمل بتی
نیچے گھر والی کا مکھڑا
(بوڑھا من میں سوچے، لو بھئی
اب تو نمٹا، گھر کا دکھڑا)
لیکن بوڑھے کو دیکھا تو
اور چڑھا بوڑھیا کا پارہ
خوب اسے ڈانٹا پھٹکارا
" ہت تیرے کی ، جنم کے بدھو، عقل پہ تیری پڑ گئے پتھر
مورکھ تونے مچھلی سے جو مانگا بھی تو مانگا اک گھر
جا، اب الٹے پاؤں چلاجا اور مچھلی سے جاکر کہنا
مجھ کو نہیں بھاتا، یہ دو کوڑی کی نیچ دہاتن رہنا
میں تو بنوں گی اونچے گھر کی، جس کا محل میں رہنا سہنا "

بوڑھا کان دبائے نکلا
سیدھا نیلے ساگر پہنچا
دیکھا ساگر ہے کچھ بیکل
ہوتی ہے لہروں میں ہلچل
بوڑھے نے اک ہانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا:
" کیوں بابا، کیا چاہیے تم کو؟ "
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے
" رحم کرو سرکار مری تم
بوڑھیا کی تو عقل ہوئی گم
مجھ بوڑھے کا اس جھنجھٹ سے
ناک میں دم ہے تریا ہٹ سے
بننے چلی ہے اونچے گھر کی، جس کا محل میں رہنا سہنا

اس کو نہیں بھاتا اب دو کوڑی کی نیچ دہاتن رہنا ،،
مچھلی بولی ’’ اچھا بابا
یہ بھی سہی، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ ،،

بوڑھا مچھوا گھر کو آیا
دیکھا تو پلٹی تھی کایا
دیکھتا کیا ہے :
یہ اونچا سا محل کھڑا ہے
آگے کو زینہ نکلا ہے
اور زینے پر اس کی بڑی بی
ہیں موجود بڑے ٹھسے سے
بڑھیا بڑھیا زیور پہنے
سر پر جوڑا ایسا موٹا
اور جوڑے میں سچا گوٹا
تن پر نرم روئیں کا دگلا
استر جیسے بھورا بگلا
گردن میں مالا موٹی سی
اور مالا میں سچے موتی
ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھی
جوتی جیسے بیر بہوٹی
آگے پیچھے نوکر چاکر
جلدی جلدی دوڑ رہے ہیں
سب اس کی خاطر میں لگے ہیں
اور بڑی بی ناک چڑھائے
گالی دئے، کوسے، دھمکائے
اس کو مکا، اس کو چانٹا
اس کے جھونٹے پکڑے، ڈانٹا
بوڑھا پاس گیا بوڑھیا کے، جوڑ کے دونوں ہاتھ یہ پوچھا :
’’ خیر، بڑی سرکار کی ہووے، اب تو منوا راضی ہے نا؟ ،،
بوڑھیا سن کر زور سے بگڑی
بڈھے کو ڈپٹا دھتکارا

حکم دیا نوکر چاکر کو
اس کو تم اصطبل میں رکھو
کاٹے جاکے بھوسا چارہ

اک دن گزرا، دو دن گزرے،
گزرے آخر دو اٹھواڑے
اب کے تو بڈھے پر اس نے اور بھی بڑھ کر پنجے جھاڑے
”بڈھے تجھ سے کہا جاتا ہے
سن، جو حکم دیا جاتا ہے
جا، اب الٹے پاؤں چلا جا
اور مچھلی سے جھک کر کہنا
مجھ کو نہیں بھاتا یوں جھوٹی موٹی نام کی رانی رہنا
میں ہوں گی سچ مچ کی رانی
جس کو راج کا مالک جانیں
جیسے چاہوں حکم چلاؤں
سارے میرا کہنا مانیں“
بوڑھا سنتے ہی بھونچکا ہوگیا اور دھیرے سے بولا :
”گھاس کہیں تو کھا گئی، جورو ؟
میں جانوں سٹھیا گئی ، جورو ؟
اٹھنا آئے، نہ بیٹھا جائے
منہ کھولے تو بول نہ پائے
لال لگام اور بوڑھی گھوڑی، تجھ پر سارا راج ہنسے گا“
دل میں چبھا بوڑھیا کے کانٹا
بڈھے کے منہ پر اک چانٹا
دے کر بولی ”کیا بکتا ہے ؟
ہوش ٹھکانے کر دوں گی میں
افوہ ! تیری اتنی ہمت!
بول بڑا، سرکار کے آگے
اٹھ کر جیبھ کتر دوں گی میں
جا، عزت کے ساتھ چلا جا
سن جو حکم دیا جاتا ہے
اور جو کی کچھ چین چپٹ تو

باندھ کے لے جائیں گے تجھ کو
اس میں میرا کیا جاتا ہے ! ،،

بوڑھا دونوں کان دبائے
پھر نیلے ساگر پر پہنچا
لہروں نے وہ پلٹے کھائے
ہو گیا سارا پانی کالا
بوڑھے نے اک ھانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا :
" کیوں بابا، کیا چاھیے تم کو ؟ ،،
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے :
" رحم کرو سرکار مری تم
جان کو آئی کھوسٹ بوڑھیا
اس نے اور مچایا اودھم ، اور ھوئی آفت کی پڑیا
دیکھو تو ، اب کہتی کیا ہے
اونچے گھر میں خاک دھرا ہے
نام بڑا اور درشن تھوڑے
میں ھوں گی سچ مچ کی رانی
جس کو راج کا مالک جانیں
جیسے چاھوں حکم چلاؤں
سارے میرا کہنا مانیں ،،
مچھلی بولی : " اچھا بابا
یوں ھی سہی، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ
بوڑھیا کو مہارانی پاؤ ،،

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
دیکھتا کیا ہے :
آگے شاھی محل کھڑا ہے

اور محل میں اس کی بڑی بی
سر پر تاج لگائے بیٹھی
سامنے دسترخوان سجا ہے
دائیں بائیں ہیں درباری
پنج ہزاری، ہفت ہزاری
بانکے ٹیڑھے، پگڑی والے
مونچھوں‌والے، داڑھی‌والے
سب اس کی سیوا میں لگے ہیں
جام میں مدرا ڈھال رہے ہیں
سات سمندر پار کے تحفے
شکر پارے رنگ برنگے
بوڑھیا بیٹھی ٹونگ رہی ہے
چوطرفہ ہے گارد پہرا
برچھے اور کلھاڑے تولے
کس کی ہمت جو کچھ بولے
بوڑھا دیکھ کے ٹھٹکا، سہما
بوڑھیا کے چرنوں میں جھک کر
بس اتنا پوچھا رک رک کر :
'' رعب بہت گانٹھا مہارانی، پر جو پوچھوں، سچ‌سچ کہنا
اب تو کلیجے میں ٹھنڈک ہے؟ اب تو منوا راضی ہے نا؟ ،،
سنتے ہی یوں تنکی بوڑھیا
مڑ کر اس کی اور نہ دیکھا
حکم کیا آنکھوں آنکھوں میں
اس کو دھکے دے کے نکالو
آئی بلا ہے، جلدی ٹالو !
ایک اشارہ سا پاتے ہی
لپکے مسٹنڈے درباری
جھٹ سے بڈھے کو جا پکڑا
گدی پر دو ہاتھ جمائے
دھکے دیتے باہر لائے
اور ڈیوڑھی پر لپ جھپ دوڑے چوکی والے، گاردوالے
کوئی کلھاڑا تھامے نکلا، کوئی تانے بلم بھالے

بوڑھے کی تو جان کے لالے،
اور اوپر سے ھنسنے والے
جملے پھینکیں، طعنے ماریں:
کوئی کہے، سٹھیایا بڈھا
کوئی کہے، دیہاتی گڈا
کام کیا تھا سر کٹنے کا
جان بچی تو چھوٹا سستا
اب آگے کو آنکھیں ھو گئیں
دیکھ کے چلیو اپنا رستا

پھر جیسے تیسے دن گزرے
اک دن گزرا، دو دن گزرے،
گزرے آخر دو اٹھواڑے
اور بھی کچھ سٹھیائی بوڑھیا
اور کھلی آفت کی پڑیا
حکم ھوا، بوڑھے کو لاؤ
چار طرف ڈگی پٹوا دی
بوڑھے کی ڈھنڈیا مچوادی
جال کنووں تک میں ڈلوائے
آخر اس کو لے کر آئے
بوڑھیا خوب اکڑ کر بولی: "سنتا ھے رے بڈھے مچھوے
الٹے پاؤں چلا جا اور جھک کر کہیو مچھلی سے مچھوے:
میں رانی بن کر بھر پائی
راج سنگھا سن سے اکتائی
بس اب تو یہ جی میں سمائی
راج کروں نیلے ساگر پر
قبضے میں ھوں سات سمندر
بیچوں بیچ لگاؤں ڈیرا
حکم چلے پانی پر میرا
وہ جو ھے سونے کی مچھلی، میری خدمتگار رھے وہ
جیسے چاھوں حکم کروں میں، آٹھ پہر تیار رھے وہ"

سنتا تھا وہ سانس کو روکے
کیا همت جو بیچ میں ٹوکے
وہ تو مہارانی تھی اور یہ
اک بڈھا مچھوا بیچارہ
حکم مہارانی کا سن کر
مچھوا ہو گیا نو دو گیارہ
سیدھا نیلے ساگر پہنچا
دیکھتا کیا ہے : کالی لہریں
طوفانی غصیالی لہریں
زور کے شراٹے بھرتی هیں
بپھری هیں، فوں فاں کرتی هیں
بڈھے نے اک هانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا :
" کیوں بابا، کیا چاهیے تم کو؟ "
بوڑھا گردن نیچی کرکے
بولا یہ دو بول ادب سے :
" رحم کرو سرکار مری تم، ناک میں دم ہے مچھلی رانی!
اب کم بختی ماری جورو نے دل میں کچھ اور هی ٹھانی
کہتی کیا ہے :
میں رانی بن کر بھر پائی
بس اب تو یہ جی میں سمائی
راج کروں نیلے ساگر پر
قبضے میں هوں سات سمندر
بیچوں بیچ لگاؤں ڈیرا
حکم چلے پانی پر میرا
اور پیاری سونے کی مچھلی، اس کی خدمتگار رہے تو
جیسے چاہے حکم کرے وہ، آٹھ پہر تیار رہے تو "
مچھلی پٹ پٹ آنکھیں کھولے
سنتی رهی سب کچھ، بن بولے
پانی پر دم چھپ سے ماری

ساگر کو چپ چاپ سدھاری
دیر تلک امید میں بڈھا
ساگر کے تٹ پر ھی ٹھیرا
جب نہ پتہ کچھ اس کا پایا
منھ لٹکائے گھر کو آیا
دیکھا کیا: آنکھوں کے آگے ایک پرانی سی کٹیا ھے
اور اس کٹیا کی چوکھٹ پر بیٹھی وہ کھوسٹ بوڑھیا ھے
ٹوٹا پھوٹا اس کے آگے ایک وھی تسلا رکھا ھے

۱۸۳۳ء

سونے کے مرغے کا قصّہ

سات اقلیم پار دور کہیں
اس جگہ جس کا اور چھور نہیں
دادون نام کا کوئی راجہ
کس دھڑلے سے راج کرتا تھا!
نوجوانی میں ایسے ٹھونکے خم
پاس والوں کا ناک میں تھا دم
پر بڑھاپا، بری بلا، آیا
تو وہ لشکر کشی سے اکتایا
جی میں آئی کہ کیجئے آرام
کچھ جو ہلکے ہوں راج پاٹ کے کام
تھے پڑوسی بھی تاک میں اس کی
وہ جورہتے تھے دھاک میں اس کی
اب بوڑھاپے میں سرپہ چڑھنے لگے
موقع پایا تو حدسے بڑھنے لگے
سرحدیں دور دور تک پھیلی
تھیں، تو کرنے کو ان کی نگرانی
اک بڑی فوج رکھنی پڑتی تھی۔
رات بھر جاگتے سپہ سالار
پھر بھی پڑتا تھا دشمنوں کا وار
یوں بھی ہوتا کہ ان کو دشمن سے
ہے تو حملے کا خوف دکھن سے

اور وہ پورب میں آپڑا دن سے
اس طرف سے ہٹاؤ تو بدذات
پھر سمندر سے بڑھ کے کرتے گھات
راجہ دادون مارے غصے کے
ایسا لاچار ہو کہ رو رو دے
اور جو چاہے کہ آنکھ لگ جاتی،
ایسی ھلچل میں نیند کیا آتی!
آخر اک جیوتشی کو بلوایا
کوئی ہرکارہ اس‌نے دوڑایا
اور مانگی مدد کہ راج گورو
کچھ بتا، ھے بڑا گیانی تو،
اس گیانی نے، مرد دانا نے
تار بجتے ھی راگ پہچانے
ساتھ لایا تھا اپنے اک تھیلا
اس سے مرغا نکالا سونے کا
اور بولا ”حضور یہ لیجئے!
تیلیوں پر اسے بٹھا دیجئے!
ھے تو سونے کا جانور لیکن
پہرہ‌داری کرے‌گا رات اور دن
ھے اگر شانتی تو یہ مرغا
چونچ پر میں دبا کے بیٹھے‌گا
پر کسی سمت سے ہوئی گڑبڑ
دشمنوں نے کہیں جو کی تڑپھڑ
ہو اچانک اگر کہیں دھاوا
یا کوئی اور آپڑے بپتا
میرا مرغا پلک جھپکتے ھی
چونک اٹھے‌گا، اٹھائے‌گا کلغی
بانگ دے‌دے کے پھٹپھٹائے‌گا
اس طرف جھٹ سے گھوم جائے‌گا“
سن‌کے ترکیب خوش ہوا راجہ
”جیوتشی، تونے کی بڑی کرپا

تجھ کو سونے میں لاددوں توسہی
آج کی بات عمر بھر کو رہی
پہلے جو مانگے تو، وہ تیرا ہے
ٹل نہیں سکتا حکم میرا ہے،،

مرغ بیٹھا جو اونچے اڈے پر
خوب رکھنے لگا حدوں پہ نظر
کھڑکے پتہ، جو ہو زرا آھٹ
جیسے اٹھتا ہے سنتری جھٹ پٹ
یونہی مرغا بھی پھٹپھٹانے لگے
گھوم کر اس طرف بتانے لگے
سر اٹھاکر پکارے ,, ککڑوں کوں،
چین سے راج کر، میں پہرہ دوں،،
تب پڑوسی بھی پڑگئے ٹھنڈے
کون اٹھاتا لڑائی کے جھنڈے
ہر طرف سے لگائی ایسی چوٹ
پٹ گئی دشمنوں کی ایک اک گوٹ

اک برس گزرا، دوسرا گزرا
چونچ ڈالے کھڑا رہا مرغا
[عیش کی راتیں، امن چین کے دن
چھوٹے ہوتے ہیں، کہہ گئے پوشکن]
ایک دم ایسی ھاھاکار مچی
اٹھ گئے ھڑبڑاکے چھترپتی
سینانایک پکار کر بولا :
,, راجہ، مالک ھمارے، ان داتا
اٹھ، مصیبت سروں پہ آئی ہے
تیری پرجاپتی دھائی ہے،،
راجہ دادون نے جماھی لی —

پوچھا : ''کیا ہے رے، ایسی کیا بیتی؟''
بولا سیناپتی ''غضب سرکار
مرغ سونے کا کر رہا ہے پکار
راجدھانی میں غل غپاڑا ہے
بھیڑ بکری کا جیسے باڑا ہے''
جا کے کھڑکی کے پاس دیکھا تو
کوئی دورہ پڑا تھا مرغے کو
مارتا پر، کبھی اٹھاتا موں
کر کے پورب کی اور ککڑوں کوں
پھر تو راجہ نے دیکھا آؤ نہ تاؤ :
'' ہاں، جوانو سوار ہو جاؤ!
دیر کیا ہے سنبھال لو گھوڑے
ہاں بڑھالو، نکال لو گھوڑے''
عمر میں جو بڑا تھا راجکمار
وہ بنایا گیا سپہ سالار
فوج پورب کے راستے ہولی
مرغ کی بند ہوگئی بولی
راجا پر جانے بھی کمر کھولی

اب سنو آٹھ دن گزرنے پر
جب نہ لشکر کی آئی کوئی خبر
نہ یہ معلوم، رن پڑے کہ نہیں
جن کو بھیجا تھا وہ لڑے کہ نہیں
تب تو بے‌چین ہو گیا راجہ
اور ادھر مرغ بانگ دینے لگا
پھر چنا دوسرے رسالے کو
ایک للکار دی، کہا ''جاؤ!''
چھوٹا بیٹا رسالدار کیا
اور بڑے کی کمک پہ بھیج دیا
مرغ چپ ہوگیا، رہا چپ چپ
اس طرف کا یہ حال، پھر گپ چپ

پھر اسی طرح آٹھ دن گزرے
اور یہ بھی خبر کے بن گزرے
اب کے راجہ بہت نراس ھوا
لوگ باگوں کو بھی ھراس ھوا
پھر وہ مرغا پکارا ککڑوں کوں
تب تو راجہ نے جی میں ٹھانی یوں
خود ھی پورب کی اور چلتا ھوں
لے لیا تیسرا رسالہ ساتھ
جانے کچھ آئے یا نہ آئے ھاتھ

رات دن فوج منزلیں مارے
چلتے چلتے نڈھال تھے سارے
نہ کہیں رن ملا نہ ھاھاکار
نہ لہو تھا، نہ لاش کے انبار
سوچے دادون اور دل دھڑکے:
"ھائیں یہ کیا! کہاں گئے لڑکے؟"
[ڈگمگاتا، کبھی سنبھلتا جائے
سوچتا جائے اور چلتا جائے]
آٹھواں دن جو بیتنے آیا
اک پہاڑی میں راستہ پایا
اونچے اونچے پہاڑ کا گھیرا
بیچ میں ان کے ریشمی ڈیرا
اور ڈیرے کے گرد کیا دیکھا:
ھوکا عالم، عجیب سناٹا
تنگ گھاٹی میں سب کی سب پلٹن
یوں پڑی، جیسے کٹ گیا ھو بن
پاس ڈیرے کے جو نظر آیا
وہ سماں اور بھی بھیانک تھا
دونوں بیٹے پڑے تھے ننگے سر
اور تن پر نہ تھا زرہ بکتر

ان کی لاشوں میں تھی گڑی برچھی
ایک نے دوسرے کے گھونپی تھی
گھوڑے دونوں کے سبزہ زار کے پاس
چرتے پھرتے تھے روندی کچلی گھاس
گھاس کیسی، کہاں کی ہریالی!
تھی لہو کی جگہ جگہ لالی!
راجہ دادون بین کرکر کے
رو پڑا '' ہائے رے مرے بچے!
ہائے دشمن نے جال میں پھانسا
میرے شکروں کو دے دیا جھانسا
چل بسے تم تو، چھوڑ کر مجھ کو
اب مری آخری گھڑی جانو! ''
پھر تو سب روئے یوں گلےمل مل
درد سے پھٹ گیا پہاڑ کا دل
گھاٹیوں کے لرز گئے سینے
زور سے آہ کھینچی وادی نے
اتنے میں ایک دم کھلا ڈیرا
جھانکا باہر کو چاندسا چہرا
تھی شماخان کی وہ شہزادی
چھب دکھائی شفق سی پھیلا دی
یوں سواگت ادب کے ساتھ کیا
اس کو تکتا ہی رہ گیا راجہ
چار آنکھیں ہوئیں تو تھا گم سم
جیسے سورج کے سامنے گلدم
دیکھ‌کر ایسا کھو گیا دادون
غم سے آزاد ہوگیا دادون
اور وہ راجہ کے سامنے جھک‌کر
مسکرانے لگی زرا رک کر
پھر بڑھی اور لےکے ہاتھ میں ہاتھ
لائی ڈیرے میں اس کو اپنے ساتھ
چن دیا اس کے آگے دسترخوان

میز پر اک سے ایک بڑھ کر خوان
کھا چکا تو اسے اٹھایا پھر
اک چھپر کھٹ میں جالٹایا پھر
رنگ رلیوں میں رات دن گزرے
اس طرح پورے سات دن گزرے
راجہ دادون ہو گیا لٹو،
چل گیا اس پہ حسن کا جادو
روز ڈیرے میں اک جھمیلا ہو
عیش ہو، دل لگی ہو، میلا ہو

گھر کو اب رخصتی کی بات چلی
پوری پلٹن لئے برات چلی
اور چلیں آگے آگے افواہیں
جتنے منھ اتنی باتیں لوگوں میں
راجدھانی کا تھا جو دروازا
اس پہ لینے پہنچ گئی پرجا
جب براتی بڑھے نگر کی اور
ہر طرف تھا ہٹوبچو کا شور
رتھ میں راجہ تھا اور وہ ناری
پیچھے جنتا لگی ہوئی ساری
راجہ دادون نے کیا پر نام
اور پرجا کا جب لیا پر نام
ایک دم بھیڑ میں دکھائی دی
ہاتھ بھر کی سفید سی پگڑی
دور سے جیوتشی نظر آیا
اس کو بگلا بھگت بنا پایا
سر سے پاؤں تلک سفید لباس
دیکھتے ہی بلایا اپنے پاس
کرکے ڈنڈوت خیریت پوچھی:
"کہیے، اچھے تو ہیں سوامی جی؟

هم کو سیوا کی آگیا دیجئے!
جو بھی کچھ حکم ہو بتا دیجئے! ،،
گیانی بولا کہ ”سنیے ان داتا
آج بیباق کیجئے کھاتا
میں نے جب خوش کیا تھا، یاد ہے نا؟
آپ نے کیا کہا تھا، یاد ہے نا؟
پہلے جو مانگے تو، وہ تیرا ہے
ٹل نہیں سکتا حکم میرا ہے
بس یہی پہلی مانگ ہے میری
جو شماخان کی ہے شہزادی
یہ مجھے بخش دیجئے سرکار!
وہ وچن یاد کیجئے سرکار! ،،
مانگ ایسی سنی جو راجہ نے
سن کے ہاتھوں سے اڑ گئے طوطے
”کیا کہا ؟ ،، اس کو ڈانٹ کر پوچھا
”گھس گیا، تجھ میں کوئی بھوت بلا؟
عقل تونے کہیں گنوائی کیا؟
تیرے بھیجے میں یہ سمائی کیا؟
اپنا وعدہ تو یاد ہے مجھ کو
پر ہر اک بات کی کوئی حد ہو
کیوں بھلا تجھ کو چاہئے لڑکی ؟
[مجھ سے کرتا ہے ایسی گستاخی!]
کیا مجھے جانتا نہیں، ہوں کون؟
مہاراجہ، مہابلی دادون!
مانگنا ہے تو مانگ لے مجھ سے
سونے چاندی کی تھیلیاں بھر کے
کوئی منصب، کوئی بڑا عہدہ
شاہی اصطبل سے کوئی گھوڑا
اور تو اور، اپنا آدھا راج
تو جو مانگے تو بخش دوں گا آج ،،
جیوتشی بولا ”جی نہیں سرکار،

میں تو کھائے ہوں بس اسی پہ ادھار
جو شماخان کی ہے شہزادی
آپ سے مانگتا ہے فریادی ،،
تھوکا راجہ نے، آ گیا غصہ :
” ہشت! ایسا کبھی نہیں ہوگا
تجھ کو ملتا بھی تھا تو اب نہ ملے
خیریت ہے اسی میں، لب نہ ہلے
ہاں خبردار، دیکھتے کیا ہو !
سامنے سے ہٹاؤ بڈھے کو ! ،،
چاہتا تھا الجھ پڑے گیانی
پر الجھنا ہے ایسی نادانی
بعض اوقات مہنگی پڑتی ہے
(بات کرتے میں، ہاتھ جڑتی ہے)
راجہ دادون نے اٹھایا گرز
اس کے مستک پہ یوں جمایا گرز
وہ گرا جا کے چاروں شانے چت
نہ رہا سانس، اور نہ سانس کا ہت
راجدھانی تو ساری کانپ گئی
اور لڑکی ہنسے، ہاہا، ہی‌ہی
جانے والا گزر گیا جی سے
کوئی مرتا ہے،اس کی جوتی سے
یوں تو خود بھی دہل گیا راجہ
مسکرا کر بہل گیا راجہ
رتھ چلا پورے تام جھام کے ساتھ
شہر میں آئے دھوم دھام کے ساتھ
اتنے میں ایک‌دم ہوئی چھن چھن
سب کی آنکھوں کے سامنے فوراً
پر پھلاتا ہوا اڑا مرغا
اڑ کے اڈے سے رتھ پہ جا پہنچا
ٹھونگ سر پر لگائی راجہ کے
اور مکٹ پر جمائے پنجے

جان لیوا تھی مرغ کی ہر ٹھونگ
رتھ سے راجہ گرا، ہوئی ہڑبونگ
اور ہڑبونگ میں وہ شہزادی
گم ہوئی، دے کے سب کو بربادی
ڈھونڈھنے پر کہیں ملی ہی نہیں
ایسی غائب ہوئی کہ تھی ہی نہیں
من گھڑت ہو تو ہو کہانی میں!
پر نصیحت ہے نوجوانی میں۔

۱۸۳۴ء

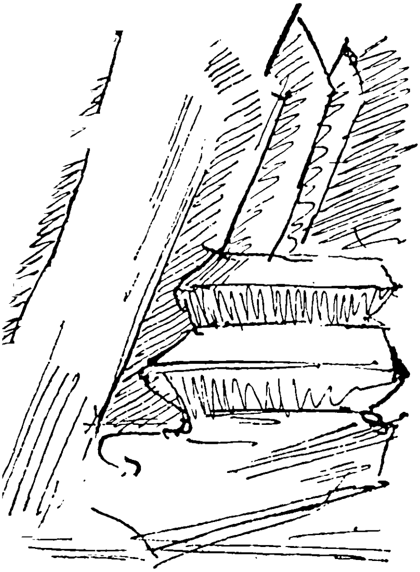

پوشکن کی ڈرائنگ
اپنی ''ایوان بیلکن کی کہانیوں،، کے لئے
(''تابوت ساز،،)۔ ۱۸۳۰ء

کہانیاں اور ناول

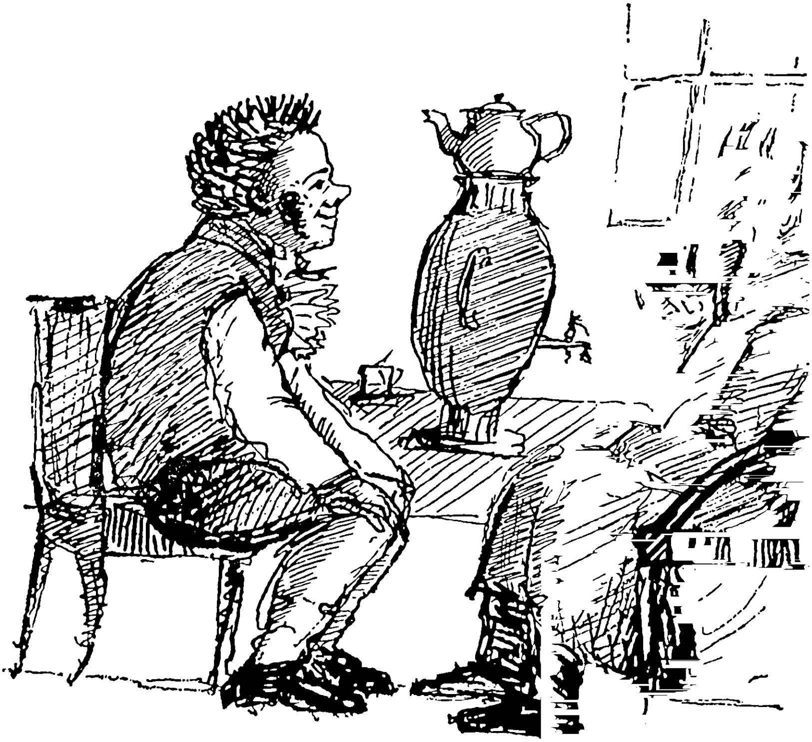

ایوان بیلکن کی کہانیاں

مادام پروستاکووا:
”جی ہاں جناب! اسے بچوں تک
سے کہانیاں سننے کا شوق تھا۔“
سکوتی‌نن:
”متروفان بالکل مجھہ پر پڑا ہے۔“
”کند ذہن“

عرض مؤلف

ہم نے ا۔ پ۔ بیلکن کی کہانیاں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو مناسب معلوم ہوا کہ پڑھنے والوں کے لئے مرحوم مصنف کا کچھ حال بطور پیش لفظ لکھدیں۔ اس خیال سے ہم نے ماریا الکسیونا ترافیلنا سے مدد چاہی کیونکہ وہ ایوان پترووچ بیلکن کی سب سے قریبی عزیز بھی ہیں اور ان کی جائداد کی وارث بھی۔ بدقسمتی سے وہ ہمیں ان کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں کیونکہ وہ مرحوم سے کبھی ملیں تک نہ تھیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ اگر ہم چاہیں تو ایک اور صاحب کی مدد لے سکتے ہیں جو ایوان پترووچ کے دوست تھے۔ ہم نے ان کی صلاح پر عمل کیا، جس کا نہایت تشفی بخش جواب ملا۔ ہم رد و بدل کئے بغیر۔ ذیل میں ان کا خط چھاپ رہے ہیں جو بیک وقت شائستہ رائے اور سچی دوستی کی بیش بہا یادگار بھی ہے اور مصنف کے سوانحی حالات کا مناسب تذکرہ بھی۔

محترمی!

آپ کا پندرہ تاریخ کا عنایت نامہ مجھے تیئیس تاریخ کو ملا، جس میں آپ نے میرے عزیز دوست اور پڑوسی ایوان پترووچ بیلکن مرحوم کی پیدائش، موت، ملازمت، گھریلو زندگی، مشاغل اور کیریکٹر کے بارے میں تفصیلی معلومات مانگی ھیں۔ میں آپ کی خواھش حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کرونگا کیونکہ مجھے خود اس سے بڑی خوشی اور آسودگی ھوگی۔ ان کی عادات، خوبیوں اور گفتگو کے بارے میں مجھے جو کچھ یاد ھے نیز ان کے بارے میں کچھ اپنے خیالات بھی آپکو لکھ کر بھیج رھا ھوں۔

ایوان پترووچ بیلکن ایک معزز گھرانے میں ۱۷۹۸ء میں گوریوھینو گاؤں میں پیدا ھوئے۔ ان کے والد مرحوم سیکنڈ میجر پیوتر ایوانووچ بیلکن نے ترافیلن خاندان کی لڑکی پیلاگیا گاوریلوونا سے شادی کی۔ وہ امیر تو نہ تھے مگر بڑے کفایت شعار اور معاملہفہم تھے۔ ان کے بیٹے کی ابتدائی تعلیم گرجا کے محرر نے کی۔ اور اس لائق آدمی کے زیر اثر انہیں مطالعہ کرنے اور اپنی مادری زبان میں لکھنے کا شوق پیدا ھوا۔ ۱۸۱۵ء میں ایوان پترووچ بیلکن پیادہ فوج کی ایک رجمنٹ (جس کا نمبر مجھے یاد نہیں رھا) میں بھرتی ھو گئے جس میں وہ ۱۸۲۳ء تک رھے۔ اس کے بعد انہیں ملازمت ترک کر دینی پڑی کیونکہ ان کے ماں باپ کا یکے بعد دیگرے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے انتقال ھو گیا۔ اور انہیں اپنے گاؤں گوریوھینو میں جاکر رھنا پڑا جو ان کی موروثی جاگیر میں واقع تھا۔

ایوان پترووچ اپنے والد کی طرح سخت گیر اور اچھے منتظم نہ تھے۔ اسلئے جاگیر کا انتظام ھاتھ میں لینے کے کچھ ھی دنوں بعد ان کی ناتجربہ کاری اور نرم مزاجی کی وجہ سے اس کی حالت بہت ابتر ھو گئی۔ انہوں نے باپ کے وقت کے محنتی اور کارگذار مکھیا کو ھٹا دیا کیونکہ اس سے کسان اپنی عادت کے مطابق ناراض رھتے تھے۔ جائداد کا سارا انتظام انہوں نے اپنی پرانی مہتممخانہ کے سپرد کر دیا جس نے کہانیاں سنا سناکر ان پر اپنا

سکہ جما رکھا تھا۔ یہ سادہ‌لوح بڑھیا پچاس اور پچیس روبل کے نوٹ میں تمیز نہ کر سکتی تھی۔ کسان اس سے ذرا بھی نہ ڈرتے تھے کیونکہ ان میں سے کتنوں کے بچوں کی وہ دینی ماں تھی۔ اس کی شہہ پا کر گاؤں والوں نے نیا مکھیا چنا جس نے کسانوں کے ساتھ تو خوب رعائتیں کیں۔ بلکہ ان کے ساتھ مل کر اپنے آقا کو دھوکہ دینے میں بھی دریغ نہ کیا۔ انجام یہ ھوا کہ ایوان پترووچ کو بیگار کا دستور ترک کر دینا پڑا اور اس کی جگہ بہت ھی کم لگان پر زمین اٹھانی پڑی۔ کسانوں نے زمیندار کی کمزور طبیعت سے فائدہ اٹھا کر پہلے سال چند اور رعائتیں بھی منظور کرا لیں۔ اور اگلے سال بھی لگان کا دو تہائی حصہ جنگلی اخروٹ، بلبیری اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی شکل میں ادا کیا۔ بعض نے اس پر بھی پوری ادائیگی نہ کی۔

میں ایوان پترووچ کے والد کا دوست تھا۔ ان کو اچھی صلاح دینا میرا فرض تھا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ جائداد کی حالت سدھارنے میں ان کی کچھ مدد کروں کیونکہ یہ کام اکیلے ان کے بس کا نہ تھا۔ اس خیال سے میں ایک دن ان کے ھاں گیا۔ حساب کتاب کے کھاتے منگائے، مکھیا بدمعاش کو بلوایا اور ایوان پترووچ کے سامنے ھی پوچھ گچھ کرنے لگا۔ شروع میں تو انہوں نے میری جانچ پڑتال پر بڑی سرگرمی اور توجہ کا اظہار کیا۔ مگر جوں ھی معلوم ھوا کہ پچھلے دو سال میں گو مویشیوں، مرغیوں، بطخوں وغیرہ کی تعداد میں کمی ھوئی ھے مگر کسانوں کی آبادی میں اضافہ ھوا ھے تو وہ اس سے اسقدر خوش ھوئے کہ انہیں اور کچھ جاننے کی خواھش نہ رھی اور آخر میں جب میں نے مکھیا پاجی کو ایسا قائل کیا کہ وہ بغلیں جھانکنے لگا، تو مجھے یہ دیکھکر انتہائی کوفت ھوئی کہ ایوان پترووچ کرسی پر پڑے خراٹے لے رھے تھے۔ اس دن سے میں نے ان کی جائداد کے معاملے میں دلچسپی لینی بالکل چھوڑ دی اور اس کو ایوان پترووچ کی طرح خدا کے حوالے کر دیا۔

مگر ان تمام باتوں سے ہم لوگوں کے دوستانہ تعلقات پر کچھ اثر نہیں پڑا اگرچہ میں ان کی طبیعت کی کمزوری اور تباہ کن بے توجہی سے نالاں تھا جو آج کل کے شریف زادوں میں عام ہے۔ مگر ان کی رحمدلی اور نیکی کی وجہ سے مجھے ایوان پتروچ سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ بھی مجھے اپنا بزرگ مانتے تھے۔ ہم لوگ تقریباً روزانہ ملتے تھے۔ وہ میری سیدھی سادھی گفتگو پسند کرتے تھے حالانکہ ہم لوگوں کی عادات، سوچ بچار کے طریقوں اور طبیعتوں کی افتاد میں کوئی مماثلت نہ تھی۔

ایوان پتروچ کے مزاج میں اعتدال پسندی تھی۔ وہ کسی شوق میں حد سے تجاوز نہ کرتے۔ میں نے کبھی انہیں نشے میں دھت نہیں دیکھا (اور یہ بات ہمارے علاقے میں معجزے سے کم نہ تھی)۔ صنف نازک ان کی خاص کمزوری تھی مگر ان کے معاملے میں بھی ان کے مزاج میں لڑکیوں کی سی جھجک تھی*۔

جن کہانیوں کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے ان کے علاوہ ایوان پتروچ نے کچھ اور مسودے بھی چھوڑے ہیں، جن میں سے کچھ میرے قبضے میں ہیں اور کچھ ان کے گھر کی مہتممہ نے مختلف گھریلو کاموں میں استعمال کر لئے۔ مثلاً گھر کے جس حصے میں وہ رہتی ہیں، پچھلے جاڑوں میں اس کی سب کھڑکیوں پر ایک نامکمل ناول کے شروع کے اوراق چپکے ہوئے تھے... اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو مذکورہ بالا کہانیاں ایوان پتروچ کی ابتدائی ادبی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔ ایوان پتروچ کے بیان کے مطابق زیادہ‌تر کہانیاں سچی ہیں جن کے واقعات مختلف لوگوں نے ایوان پتروچ

---

* اس جگہ خط میں ایک چھوٹا واقعہ بیان کیا گیا تھا جسے ہم نے فضول سمجھکر چھوڑ دیا۔ مگر پڑھنے والے یقین کریں کہ اس سے ایوان پتروچ کی شخصیت کا کوئی برا پہلو نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ (پشکن کا نوٹ)

کو بتائے تھے*۔ سب کہانیوں کے کرداروں کے نام فرضی ھیں ۔ صرف گاؤں اور دیہات کے نام واقعی ھمارے علاقے کے ھیں ۔ میرے گاؤں کا بھی ایک جگہ ذکر ھے ۔ مگر اس کی وجہ کوئی بدنیتی نہ تھی، محض تخیل کی کمی سمجھئے ۔

۱۸۲۸ء کی خزاں میں ایک بار سردی کھا کر ایوان پتروِوچ سخت بیمار ھو گئے ۔ اور مقامی ڈاکٹر کی انتہائی کوشش کے باوجود جانبر نہ ھو سکے حالانکہ ڈاکٹر بڑا ھوشیار تھا — پرانی بیماریوں مثلاً پاؤں میں گھٹے پڑ جانے کے لئے علاج میں تو اس کا جواب نہ تھا ۔ مگر موت کے آگے کسی کی کیا چل سکتی ھے؟ ایوان پتروِوچ کا دم میری گود میں نکلا ۔ عمر صرف تیس سال کی تھی ۔ گوریوھینو گاؤں میں اپنے والدین کے قریب دفن ھوئے ۔

ایوان پتروِوچ کا قد درمیانہ، آنکھیں بھوری، بال سنہرے، ناک سیدھی اور سبک، رنگت صاف اور جسم چھریرا تھا ۔

اپنے دوست اور پڑوسی کی عادات، شکل و صورت اور مشاغل کے متعلق جو کچھ مجھے یاد تھا سب آپ کو لکھ دیا ھے ۔ اگر آپ میرے خط کا کچھ حصہ اشاعت کے لئے استعمال کریں تو اتنی عنایت کیجیئےگا کہ میرا نام نہ آنے پائے کیونکہ میں ادیبوں کی قدروعزت کرنے

---

* یہ واقعہ ھے کہ ا ۔ پ ۔ بیلکن کے مسودے میں ھر کہانی کے شروع میں مصنف کے قلم سے لکھا ھوا ھے ''یہ کہانی مجھے فلاں شخص (اس کے نام کے شروع کے حروف، عہدے اور خطاب لکھے ھیں) سے معلوم ھوئی تھی ۔ دلچسپی لینے والوں کی خاطر چند مثالیں درج ھیں ۔ ''گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ،، نام نہاد کاؤنسلر ا ۔ گ ۔ ن نے، ''نشانہ،، کرنل ا ۔ ل ۔ پ نے، ''تابوت ساز،، دکان پر کام کرنےوالے ب ۔ و نے اور ''برفانی طوفان،، اور ''بہروپ،، ایک نوجوان خاتون ک ۔ ا ۔ ت نے بتائی تھیں ۔ (پوشکن کا نوٹ)

کے باوجود ان لوگوں میں شمار کیا جانا نہیں چاہتا اور نہ یہ میری عمر کے لئے موزوں ہی معلوم ہوتا ہے۔

زیادہ آداب

آپ کا نیازمند...

۱۶ نومبر ۱۸۳۰ء

موضع نینارادووا

مصنف کے دوست کی مرضی کے مطابق ہم نے ان کا نام نہیں لکھا۔ مگر ہم ان کے تہہ دل سے مشکور ہیں اور یقین ہے کہ ہمارے پڑھنے والے بھی ان کے خلوص اور سادگی کی قدر کریں گے۔

ا۔ پ۔

نشانہ

''ہم نے ڈوئیل لڑی''
باراتینسکی
''میں نے قسم کھائی کہ ڈوئیل کے
قاعدے کے مطابق اسے گولی
مار دونگا (میری ایک گولی
اس پر قرض تھی)''
''پڑاؤ کی شام''

— ۱ —

ہماری رجمنٹ کا پڑاؤ شہر ''خ'' میں تھا ۔ سبھی جانتے ھیں کہ فوجی افسروں کی زندگی کس قسم کی ہوتی ھے ۔ صبح کے وقت قواعد اور شہہ سواری، دو پہر کو رجمنٹ کمانڈر یا کسی یہودی کی دکان پر کھانا کھانا، شام کو تاش اور شراب نوشی ۔ نہ شہر کے کسی گھرانے میں ہماری رسائی تھی نہ شہر بھر میں کوئی کم عمر ناکتخدا لڑکی تھی ۔ شام کو ایک دوسرے کی قیام گاہ پر ملتے تو ایک دوسرے کی وردیاں دیکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔

ہمارے دوستوں کے حلقے میں صرف ایک آدمی فوجی نہ تھا ۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی اس لئے ہم لوگ اسے کافی عمر رسیدہ سمجھتے تھے ۔ زندگی کے

تجربہ نے اسے ہم لوگوں پر فوقیت دے دی تھی۔ اس پر اس کی افسردہ طبیعت، کھرے مزاج اور تلخ کلامی کی عادت نے ہم نوجوانوں کو اور بھی مرعوب کر رکھا تھا۔ اس کی زندگی سب کے لئے ایک راز سربستہ تھی۔ وہ روسی معلوم ہوتا تھا مگر اس کا نام روسیوں جیسا نہ تھا۔ ایک زمانے میں وہ فوجی رسالے میں سپاھی تھا، ترقی کی راھیں اس کے سامنے کھلیں تھیں کہ اچانک اس نے فوج سے استعفاٰ دے دیا۔ اور آج تک کسی کو اس کی وجہ نہ معلوم ہو سکی۔ پھر وہ اس چھوٹے سے گمنام شہر میں آ بسا۔ اس کی زندگی عجب طور سے گذرتی تھی: ایک طرف غریبوں کی سی تنگدستی تھی اور دوسری طرف امیروں کی سی دریادلی۔ مثلاً وہ سدا پھٹے پرانے فراک کوٹ میں بغیر سواری کے گھومتا مگر ھماری رجمنٹ کے افسروں کی خاطر تواضع کے لئے اس کے دروازے سدا کھلے رھتے۔ یہ ٹھیک ھے کہ اس کے ھاں صرف دو یا تین قسم کے کھانے میز پر ھوتے تھے (پکانے والا بھی ایک سابق سپاھی تھا) مگر شامپین کے دور پر دور چلتے۔ کسی کو معلوم نہ تھا اس کی آمدنی کتنی تھی اور کہاں سے آتی تھی۔ اور نہ کسی میں اتنی ھمت تھی کہ اس سے یہ سوال پوچھتا۔ اس کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا جن میں زیادہ تر فن جنگ کے متعلق تھیں یا کچھ ناول تھے۔ اپنی کتابیں وہ ھر ایک کو بخوشی دے دیتا اور کبھی واپسی کا مطالبہ نہ کرتا۔ خود بھی کتاب لیکر واپس کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس کو لت تھی، تو ایک پستول سے نشانے بازی کی۔ کمرے کی ھر دیوار گولیوں سے ایسی چھلنی ھو چکی تھی کہ اس پر شہد کی مکھیوں کے چھتے کا گمان ھوتا تھا۔ اس کے کچے جھونپڑے میں سب سے بڑھیا اس کے بیش قیمت پستول تھے۔ نشانہ اس قدر بےخطا تھا کہ اگر وہ کسی کے سر پر ناشپاتی رکھ کر نشانہ لگانا چاھتا تو اس کے لئے ھماری رجمنٹ کا ھر افسر بے جھجک اپنا سر پیش کر دیتا۔ ھم لوگوں کی گفتگو مین اکثر ڈوئیل کا ذکر آتا۔ مگر سلویو (میں اس کا

تذکرہ اسی نام سے کرونگا) اس میں کبھی حصہ نہ لیتا
بلکہ اگر کوئی پوچھتا بھی کہ اس نے کبھی ڈوئیل لڑی
ہے تو وہ نہایت ترشی سے کہتا ''ھاں،، مگر اس کے
انداز سے صاف ظاہر ہو جاتا کہ وہ اس موضوع پر
بات چیت بالکل پسند نہیں کرتا۔ ھمیں یقین ہو گیا کہ ہو
نہ ہو کوئی اس کے بے خطا نشانے کا شکار ہو چکا ہے
جس کا اس کے ضمیر پر بوجھ ہے۔ کسی کے ذہن میں
بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس تذکرہ سے دامن
بچانے کی وجہ بزدلی ہو سکتی ہے۔ اصل میں بعض آدمی
ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ ذہن میں بعض صفات
کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے سلویو کو بزدل گردانا
ناممکن تھا۔ مگر اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا
جس نے ہم سب کو متحیر کر دیا۔

ایک دن ہم دس افسر سلویو کے ہاں مدعو تھے۔
حسب معمول شراب کا دور چل رہا تھا۔ سب خوب پی
پلا رہے تھے۔ کھانا ختم ہونے پر ہم نے اپنے میزبان سے
تاش کھیلنے اور بینکر بننے کی فرمائش کی۔ پہلے تو اس
نے انکار کیا کیونکہ وہ تاش بہت کم کھیلتا تھا۔ مگر
پھر اس نے تاش کے پتے منگوائے اور پچاس کے قریب دس
دس روبل کے سکے میز پر پھیلا کر پتے بانٹنے شروع کر
دئیے۔ سب نے اسے گھیر لیا اور کھیل شروع ہو گیا۔
سلویو کی عادت تھی کہ تاش کھیلتے ہوئے بہت ہی
خاموش رہتا، نہ کسی کی بات پر جرح کرتا، نہ اپنی صفائی
پیش کرتا۔ اگر کسی شرط بدنے والے سے کوئی غلطی
ہو جاتی تو سلویو یا تو فوراً روپیہ ادا کر دیتا، یا رقم
کاغذ پر لکھ لیتا۔ ہم سب اس کے ان اصولوں کو جانتے
اور مانتے تھے۔ مگر ہماری رجمنٹ میں ایک افسر نیا
نیا آیا تھا۔ کھیلتے ہوئے اس نے بے خیالی میں بازی کی
شرح بڑھا دی۔ سلویو نے چاک کے ٹکڑے سے عادت کے
مطابق میزان صحیح کر دی۔ افسر سمجھا کہ اس نے
غلطی سے ایسا کیا ہے اور فوراً حجت شروع کر دی۔
سلویو سنی ان سنی کرکے خاموشی کے ساتھ کھیلتا رہا۔

افسر کو تاب کا یارا نہ رہا۔ اور اس نے سلویو کی تحریر کو برش سے مٹا دیا۔ سلویو نے چاک اٹھا کر پھر وہی ہندسے لکھ دئے۔ جوئے اور شراب کی گرمی اور دوستوں کے قہقہوں سے کھسیا کر افسر اور بھی بھڑک اٹھا۔ اس نے سلویو کے فعل کو اپنی ہتک سمجھا اور میز پر سے پیتل کا شمعدان اٹھا کر سلویو کی طرف تاک کر پھینکا۔ مگر سلویو اس کی زد سے بال بال بچ گیا۔ اس واقعہ سے ہم سب پریشان ہوگئے۔ سلویو کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ بڑی مشکل سے اپنے غصے کو ضبط کرکے اسنے اتنا کہا ''جناب مہربانی سے اسی وقت یہاں سے تشریف لے جائیے۔ اور اپنی خوش نصیبی پر شکر کیجئے کہ یہ واقعہ میرے گھر پر ہوا۔''

اسی وقت سے ہم لوگ اپنے بدنصیب ساتھی کو مردوں میں گننے لگے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ اس واقعہ کا انجام کیا ہوگا وہ فوراً یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا کہ وہ ہر وقت اس بےعزتی کا بداہ چکانے کو تیار ہے۔ اس کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک کھیل ہوتا رہا مگر سب نے محسوس کیا کہ ہمارے میزبان کا دل تاشوں میں نہیں لگ رہا ہے۔ چنانچہ ایک ایک کرکے ہم سب وہاں سے رخصت ہو گئے۔ راستے بھر یہی باتیں ہوتی رہیں کہ دیکھیں لیفٹیننٹ کی موت کے بعد اس کی جگہ کون آئے۔

اگلے دن شہسواری کے اسکول میں سب ایک دوسرے سے لیفٹیننٹ کی خیر عافیت پوچھ رہے تھے کہ وہ خود ہی وہاں آ موجود ہوا۔ ہم نے اس سے احوال پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ابھی تک اس کے پاس سلویو کی طرف سے کوئی پیام نہیں پہونچا۔ سبھی کو اس پر بڑا اچنبھا ہوا۔ وہاں سے ہم لوگ سلویو کے گھر گئے تو دیکھا وہ دروازے میں لگے ہوئے تاش کے اکے پر پےدرپے گولی چلا رہا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہم سب سے ملا۔ ایک دن پہلے کے واقعہ کا ذکر تک نہ کیا۔ اسی طرح تین

دن اور گذر گئے۔ لیفٹیننٹ زندہ سلامت موجود تھا۔ ہر طرف یہی چرچا تھا کہ آخر بات کیا ہے۔ شاید سلویو ڈوئیل لڑنا نہیں چاھتا۔ اور ھوا بھی یہی۔ لیفٹیننٹ نے معمولی سی معذرت کی اور سلویو نے اسے معاف کر دیا۔

اس واقعہ کی وجہ سے ہم نوجوانوں کی نظر میں سلویو کی وقعت بہت کم ہو گئی۔ کیونکہ ھماری عمر میں شجاعت اور بہادری کے اوصاف سب سے اعلی معلوم ہوتے ھیں جن سے سب خامیوں کی پردہ‌پوشی کی جا سکتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ واقعہ بھولا بسرا ھوگیا۔ اور سلویو کا اقتدار پھر ویسا ھی قائم ھو گیا۔

صرف میرے دل میں سلویو کی طرف سے ھمیشہ کے لئے بال سا پڑ گیا۔ ایک تو میں طبعاً رومان پسند تھا۔ اس لئے اور سب افسروں سے زیادہ میں اس آدمی میں کشش محسوس کرتا تھا جس کی زندگی سب کے لئے ایک معمہ تھی۔ مجھے وہ کسی پراسرار کہانی کا ھیرو معلوم ھوتا تھا۔ اسے بھی اوروں کی نسبت مجھ سے زیادہ لگاؤ تھا کیونکہ صرف مجھ ھی سے وہ طنز آمیز فقرے بازی کے بغیر مختلف موضوعوں پر سادہ اور دلنشیں پیرایہ میں گفتگو کرتا تھا۔ اس واقعہ نے اسے میری نظروں سے گرا دیا۔ رہ رہ کر یہ خیال مجھے ستاتا تھا کہ اس نے اپنی ھتک کا انتقام لینے سے کیوں گریز کیا۔ اُسی وجہ سے اُس سے آنکھ ملاتے ھوئے مجھے شرم محسوس ھونے لگی۔ سلویو جہاندیدہ آدمی تھا۔ میرے انداز سے میرے دلی جذبات بھانپ گیا۔ لگتا تھا کہ اسے کافی تکلیف ھوئی۔ ایک دو دفعہ مجھے ایسا محسوس ھوا کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاھتا ہے۔ مگر میں نے اس کا موقع نہ دیا۔ اور اس سے اکیلے میں ملنے سے کترانے لگا۔ بعد میں سلویو نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ اب میں صرف اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں اس سے ملتا اور ھماری پہلے کی پرخلوص صحبتیں بالکل ختم ھو گئیں۔

بڑے بڑے شہروں کے آرام و آسائش کے عادی لوگ ان احساسات کی لذت کو کیا جانیں جو گاؤں اور قصبوں‌والوں

کی زندگی میں اسقدر اهمیت رکھتے هیں مثلاً ڈاک کا انتظار: منگل اور جمعه کے دن رجمنٹ کا هیڈ کوارٹر افسروں کے مجمع سے کھچا کھچ بھر جاتا۔ کوئی روپئے آنے کی امید لگائے هوئے هے، کوئی خطوں کے لئے بے چین هے، کوئی اخبار اور رسالوں کا انتظار کر رها هے۔ مارے بے صبری کے اکثر خط وهیں کھول کر پڑھ لئے جاتے۔ ایک دوسرے کو خبریں سنائی جاتیں۔ غرض یه که هر طرف عجب چهل پهل نظر آتی۔ سلویو کے خطوط بھی رجمنٹ کی معرفت آتے تھے۔ اس لئے ڈاک کے دن وه بھی وهیں موجود هوتا۔ ایک دفعه اس کے نام کا ایک خط اسے دیا گیا۔ اس نے بڑی بے صبری سے اس کی مہر توڑی۔ خط کے مضمون پر نظر پڑتے هی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سب افسر اس وقت اپنے اپنے خط پڑھنے میں اتنے منہمک تھے که کسی نے اس کی طرف توجه نه کی۔ اتنے میں اس نے خود هی سب کو مخاطب کرکے کہا ''حضرات! بعض حالات کی وجه سے میری یہاں سے فوری روانگی ضروری هے۔ مجھے امید هے که آپ سب آج آخری بار میرے ساتھ کھانا کھانے سے انکار نه کرینگے۔ میں آپ سب کا منتظر رهونگا۔'' پھر میری طرف دیکھکر کہا که ''تم ضرور آنا''۔ یه کہکر وه تیزی سے هیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکل گیا۔ هم لوگ بھی سلویو کے هاں ایک دوسرے سے ملنے کا وعده کرکے اپنی اپنی قیام گاه پر چلے آئے۔

میں مقرره وقت پر سلویو کے هاں پہونچا تو تقریباً پوری رجمنٹ وهاں موجود تھی۔ سلویو کا سب سامان بندها هوا رکھا هوا تھا اور هر طرف گولیوں سے چھلنی خالی دیواروں کے سوا کچھ نظر نه آتا تھا۔ هم لوگ کھانے کی میز کے چاروں طرف جمع هو گئے۔ همارے میزبان کی طبیعت اسوقت بہت هی حاضر تھی۔ اس کی زنده‌دلی نے هم پر بھی اثر کیا۔ هر طرف بوتلوں کے کاگ اڑنے لگے۔ گلاسوں میں شراب سنسنانے لگی اور هم سب اپنے جدا هونے والے دوست کی کامیابی اور سلامتی

کے لئے جام پر جام خالی کرنے لگے۔ اسی طرح ساری شام گذر گئی۔ اندھیرا بڑھ جانے پر ہم لوگ اٹھے اور اپنی اپنی ٹوپیاں پہننے لگے۔ سلویو نے ہر ایک سے ہاتھ ملایا۔ میری باری آئی تو اس نے میرا ہاتھ دبا کر آہستگی سے کہا ''مجھے تم سے بات کرنی ہے''۔ میں جاتے جاتے رک گیا۔

یکے بعد دیگرے سب مہمان رخصت ہو گئے۔ صرف ہم دونوں رہ گئے۔ ہم نے اپنے اپنے پائپ سلگا لئے۔ سلویو اندر ہی اندر کسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا۔ شام کی زندہ دلی کا شائبہ تک باقی نہ تھا۔ چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ آنکھوں میں غیر قدرتی چمک تھی۔ پائپ کے سیاہ دھوئیں کے مرغولوں میں گھر کر وہ کوئی ڈراؤنی مخلوق ہو رہا تھا۔ چند منٹ اور گذر گئے۔ تب سلویو نے خاموشی کی زنجیر توڑی۔

''کیا خبر آج کے بعد ہم دونوں کبھی نہ مل سکیں۔ اس لئے روانگی سے پہلے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں کسی کی رائے کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا مگر تم مجھے پسند ہو۔ اور تم میرے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا رہے تو مجھے تکلیف ہوگی۔''

وہ رکا اور اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ میں چپ چاپ زمین کی طرف تکتا رہا۔

''تمہیں یقیناً تعجب ہوگا کہ میں نے اس دن اس شراب کے نشے میں چور شیخی خورے لونڈے سے اپنی ہتک کا بدلہ کیوں نہیں لیا؟ حالانکہ اسوقت اس کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی۔ اور چونکہ مجھے ہتھیار چننے کا حق تھا اس لئے مجھے کسی قسم کا خطرہ بھی نہ تھا۔ اگر چاہوں تو تمہیں اس غلط فہمی میں ڈال سکتا ہوں کہ اس دن کا عفو اور درگذر میری عالی ظرفی کی دلیل تھی۔ مگر میں تمہیں دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ اگر میں اپنی زندگی کو بالکل خطرے میں ڈالے بغیر اسے سزا دے سکتا تو ہرگز معاف نہ کرتا۔''

اس اعتراف سے میں بالکل حیران اور ششدر رہ گیا۔ مگر سلویو اسی طرح اپنی دھن میں بولتا چلا گیا۔

''ہاں مجھے اپنی زندگی کو کسی خطرے میں ڈالنے کا مجاز نہیں۔ چھ سال پہلے ایک شخص نے میرے منھ پر طمانچہ مارا تھا۔ اور میرا وہ دشمن آج تک زندہ ہے۔ اس ہتک کا بدلہ چکانے سے پہلے میں اپنی زندگی کو کسی قسم کے خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔''

میرے دل میں تجسس کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ ''تو کیا اس وقت تم اس سے ڈوئیل نہیں لڑے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''یا شاید کسی وجہ سے تمہیں لڑے بغیر ہی وہاں سے چلا آنا پڑا؟''

''میں اس سے ڈوئیل لڑا تھا'' سلویو نے جواب دیا۔ ''اس کی یادگار ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔''

وہ اٹھا اور گتے کے ڈبے میں سے ایک سرخ کا مدار فوجی ٹوپی نکالی جس میں گلٹ کا پھندنا لٹک رہا تھا۔ اس نے ٹوپی سر پر رکھی تو میں نے دیکھا ماتھے سے انچ بھر اوپر گولی کا آرپار نشان تھا۔

سلویو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''تمہیں شاید معلوم ہو کہ میں ایک زمانے میں ''ن'' رجمنٹ میں تھا۔ تم میری طبیعت کی افتاد سے واقف ہو کہ میں ہر بات میں سب سے آگے رہنا چاہتا ہوں۔ جوانی میں یہ دھن جنون کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں فتنہ اور فساد روزمرہ کی بات تھی۔ اور میں فوج میں فسادیوں کا سرغنہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگ بدمستی اور بدھوشی پر فخر کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک دفعہ مشہور شرابی بورتسوف کو بھی مات دے دی تھی۔ بورتسوف وھی شرابی ہے جس کو شاعر دنیس داویدوف نے اپنے شعروں میں امر کر دیا ہے۔ ہماری رجمنٹ میں آئے دن ڈوئیل ہوتے رہتے تھے اور شائد ہی کوئی ڈوئیل ایسا ہوتا ہو جس میں میرا کچھ دخل نہ ہو۔ میرے ساتھیوں نے مجھے آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔

لیکن رجمنٹ کے کمانڈر میرے وجود کو بلائے بیدرماں سمجھتے تھے۔

یوں میں بڑے ٹھاٹھ سے شہرت اور ہردلعزیزی کا لطف اٹھا رہا تھا کہ ہماری رجمنٹ میں ایک نیا افسر بھرتی ہوکر آیا۔ وہ ایک اعلی خاندان کا فرد تھا۔ میں نے آجتک اس جیسا نصیبه ور آدمی نہیں دیکھا۔ جوانی اور ذھانت، خوبروئی اور جوانمردی، شہرت اور ناموری غرض کونسی چیز تھی جو اس کے حصے میں نہ آئی تھی؟ وہ روپیه یوں پانی کی طرح بہاتا جیسے اس کے پاس قارون کا خزانه ھو۔ تم خود ھی سوچ لو کہ ایسے آدمی سے سب کس قدر مرعوب ھوئے ھونگے۔ میرے اقبال کا ستارہ غروب ھونے لگا۔ شروع شروع میں اس نے میری شہرت سنکر مجھ سے دوستی کرنی چاھی۔ مگر میں نے اس کی دوستانه پیشکش کو ایسی سرد مہری سے ٹھکرایا کہ اس دن سے وہ بھی مجھ سے بے اعتنائی برتنے لگا۔ مجھے اس سے انتہائی رقابت اور نفرت ھو گئی۔ رجمنٹ کے افسروں اور عورتوں میں اس کی کامیابی مجھے ایک آنکھ نه بھائی۔ میں ھر جگہه اسے چڑانے اور جھگڑا بڑھانے کی کوشش کرتا۔ اس پر فقرے چست کرتا جن کا وہ ایسا دنداں شکن جواب دیتا کہ میں کٹ کر رہ جاتا۔ اس کے جملے بذله سنجی اور ظرافت کی چاشنی سے پر لطف ھوتے اور میرے طنز کے زھر میں بجھے ھوئے۔ پھر ایک دن یه ھوا کہ ھم سب ایک پولش جاگیردار کے ھاں محفل رقص میں مدعو تھے۔ سب خواتین پروانوں کی طرح اس پر ٹوٹی پڑ رھی تھیں۔ میرے دل میں حسد کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ گھر کی مالکه بھی (جو پہلے مجھ سے معاشقه لڑا رھی تھی) اسی کی طرف مائل تھی۔ مجھ سے نه رھا گیا۔ اور میں نے اس کے کان میں ایک نہایت بے ھودہ فقرہ کہا جسے سنکر اس کا چہرہ سرخ ھو گیا۔ اس نے چٹاخ سے میرے گال پر طمانچه مارا۔ دونوں طرف میان سے تلواریں نکل آئیں۔ خواتین مارے خوف کے بے ھوش ھو گئیں۔ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرکے لوگوں نے ھمیں

علیحدہ کیا - اسی رات کو ہم دونوں میں ڈوئیل ہونا قرار پایا -

اگلی صبح پو پھٹنے سے پہلے ھی میں مع اپنے تین ساتھیوں کے مقررہ مقام پر پہونچ گیا اور اپنے حریف کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا - بہار کا موسم تھا - سورج سویرے نکل آیا تھا - گرمی ہو چلی تھی - میں نے دور سے اس کو آتے ہوئے دیکھ لیا - وہ پیدل آ رہا تھا - وردی تلوار پر لٹکی ہوئی ھاتھ میں تھی - اور صرف ایک آدمی ساتھ تھا - ہم اس سے ملنے بڑھے تو وہ ٹوپی ھاتھ میں لئے بڑی بےفکری کے ساتھ آگے آیا - ٹوپی میں سرخ سرخ چیری بھری تھیں - ھمارے ساتھیوں نے بارہ بارہ قدم کا فاصلہ ہم دونوں کے درمیان ناپا - مجھے پہلے گولی چلانے کا حق تھا - مگر میں غصہ سے اس قدر لرز رہا تھا کہ مجھے اپنے ھاتھ پر بھروسہ نہ تھا - اس لئے میں نے اسے پہلے گولی چلانے کا موقعہ دیا - وہ اس پر راضی نہ ھوا - آخر قرعہ ڈالنے کا فیصلہ ھوا - وہ سدا ھی سے تقدیر کا منظور نظر تھا - قرعہ بھی اسی کے نام نکلا - اس نے نشانہ لگایا اور گولی میری ٹوپی کو پار کر گئی - اب اس کی زندگی میرے ھاتھ میں تھی - میں نے اس کے آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں تاکہ اس کے چہرے پر گھبراھٹ اور پریشانی کی پرچھائیں دیکھ سکوں - مگر وہ اسی طرح لاپرواھی سے میرے پستول کی طرف منہ کئے ہوئے کھڑا رہا - اور ٹوپی میں سے پکی پکی چیری چن کر کھاتا اور ان کی گٹھلیاں میری طرف تھوکتا رہا - میں نے سوچا ''ایسے آدمی کو مارنے سے کیا حاصل جسے اپنی جان کی اتنی کم پرواہ ہو -'' اور پھر اسی لمحہ ایک اور شیطانی خیال میرے دل میں آیا - میں نے پستول والا ھاتھ نیچے گرا دیا -

چنانچہ میں نے کہا ''اس وقت آپ بہت ھی مصروف نظر آ رہے ھیں - آپ کا دھیان ڈوئیل کی طرف نہیں ہے - میں بھی آپ کے دلچسپ مشغلے چیری کھانے میں مخل ہونا نہیں چاھتا -'' ''نہیں، نہیں آپ میری ذرا فکر نہ کریں - آپ میرے مشغلے میں ذرا بھی خلل نہیں ڈال

رہے ہیں۔ گولی چلائیے۔ خیر اگر اس وقت آپ کی طبیعت حاضر نہیں ہے تو پھر سہی مجھ پر آپ کا قرض رہا۔ جب آپ چاہیں میں چکا دونگا،، اس نے جواب دیا۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور کہا کہ میں اسوقت گولی چلانا نہیں چاہتا۔ اور یہ معاملہ اس وقت یوں ختم ہو گیا۔

میں نے فوج سے استعفا دیدیا اور اس گمنام گوشے میں آ بسا۔ مگرتب سے آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب میرے دل میں انتقام کے شعلے دھیمے پڑے ہوں۔ بس یہی ایک خلش، یہی ایک خیال میری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ اور آخر آج وہ دن آگیا جس کا مجھے اتنی مدت سے انتظار تھا۔

سلویو نے اپنی جیب سے وہ خط نکالا جو اس دن صبح اس کو ملا تھا اور مجھے پڑھنے کو دیا۔ غالباً اس کے وکیل نے ماسکو سے لکھا تھا کہ ایک خاص شخص بہت جلد ایک حسین اور نوجوان لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔

سلویو نے کہا ’’یہ تو تم سمجھ ہی گئے ہوگے کہ یہ خبر کس شخص کے متعلق ہے۔ میں ابھی ماسکو جا رہا ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ اپنی شادی کی شام کو بھی موت کا اسی لاپرواہی سے استقبال کرتا ہے جیسا ایک دفعہ پہلے چیری کھاتے ہوئے کرچکا ہے۔،،

یہ کہکر وہ اٹھا، ٹوپی سر سے زمین پر پٹخ دی اور پنجرے میں بند شیر کی طرح ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ میں دم بخود کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ دل میں عجب متضاد جذبات چکر لگا رہے تھے۔

اتنے میں نوکر نے آکر کہا کہ گھوڑے تیار ہیں۔ سلویو نے میرا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا۔ ہم دونوں گلے ملے اور وہ گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں دو ٹرنک رکھے تھے، ایک میں اس کے پستول تھے اور دوسرے میں باقی سارا سامان تھا۔ ہم دونوں نے ایک بار پھر خدا حافظ کہا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

کئی برس اور گذر گئے۔ نجی حالات کی وجہ سے مجھے ایک بہت پس ماندہ گاؤں میں جو ضلع ''ن'' میں واقع تھا سکونت اختیار کرنی پڑی۔ یہاں مجھے اپنی جائداد کا سارا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ میں مستقل اپنی پرانی آزاد اور بےفکری زندگی کو یاد کرکے آنسو بہایا کرتا تھا۔ خاص طور پر خزاں اور جاڑے کے موسم میں تنہائی کی شامیں کاٹے نہ کٹتی تھیں۔ سہ پہر کے کھانے تک تو کسی نہ کسی طرح وقت گذر جاتا تھا۔ کبھی گاؤں کے نمبردار سے باتیں کرتا، کبھی جاگیر کا دورہ کرکے دیکھتا کہ کام کیسا ہو رہا ہے یا جو نئے کام شروع کرائے ہیں وہ کس ڈھنگ سے چل رہے ہیں۔ مگر اندھیرا ہوتے ہی دل گھبرانے لگتا۔ گھر کے گودام اور الماریوں میں جتنی کتابیں نظر پڑی تھیں انہیں بار بار پڑھ چکا تھا۔ بوڑھی منتظمہ کری‌لوونا کو جتنی کہانیاں یاد تھیں وہ کئی دفعہ مجھے سنا چکی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے گانوں کی آواز سن‌کر مجھ پر عجب اداسی طاری ہو جاتی۔ ممکن تھا کہ میں شراب کا عادی ہو جاتا۔ مگر زیادہ شراب پینے سے سر میں شدید درد ہونے لگتا۔ دوسرے یہ کہ بیکاری اور اکتاہٹ سے گھبرا کر شراب نوشی کرنے سے مجھے سخت چڑ تھی۔ ہمارے علاقہ میں اس قسم کے تباہ حال شرابیوں کی کمی نہ تھی جو زندگی کے خلا کو شراب کے نشے سے پر کرنا چاہتے تھے۔ میرے دو ہمسائے انہیں بدنصیبوں میں سے تھے۔ ان کی گفتگو میں کھنکھنارنے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ خدا بچائے ایسے لوگوں کی محبت سے، ان سے ملنے سے تو تنہائی غنیمت ہے۔

ہمارے یہاں سے چار کوس پرے کاؤنٹس ''ب'' کی جاگیر تھی جہاں صرف ان کی جائداد کا منتظم رہتا تھا۔ کاؤنٹس وہاں صرف ایک بار شادی کے فوراً بعد مہینے بھرکے لئے آئی تھیں مگر مجھے آئے سال بھر ہوا تھا کہ

سنا گیا کہ کاؤنٹس اور ان کے شوہر گرمی میں اپنے علاقہ پر آئینگے اور جون کے آغاز میں وہ لوگ سچ مچ آ گئے۔

دیہات میں رہنے والوں کے لئے کسی دولت‌مند پڑوسی کا آنا ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ آس پاس کے جاگیرداروں اور ان کے لواحقین میں ان کی آمد کا چرچا دو ماہ پہلے سے شروع ہوتا ہے اور تین سال تک ختم نہیں ہوتا۔ ہمسائے میں ایک حسین اور نوجوان خاتون کے آنے کی خوش خبری نے خود مجھ پر بھی بہت اثر کیا۔ مجھے ان کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ ان کو وہاں پہنچے ہفتہ بھر ہوا ہوگا۔ اتوار کا دن تھا کہ میں کھانے کے بعد اپنے معزز پڑوسیوں سے تعارف اور نیاز حاصل کرنے ''س،، گاؤں کی طرف چل پڑا۔

چوبدار نے مجھے کاؤنٹ کے درالمطالعہ میں پہنچا دیا اور خود میرے آنے کی اطلاع دینے اندر چلا گیا۔ یہ وسیع کمرہ بہت نفاست کے ساتھ انتہائی قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں دیواروں سے لگی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے اوپر کانسی کے بت سجے ہوئے تھے۔ سنگ مرمر کے آتش خانے پر چوڑا شیشہ لگا ہوا تھا۔ فرش پر سبز کپڑا بچھا ہوا تھا جس پر قالین اور نمدے پڑے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے تک اپنے کونے پر پڑے رہنے کے بعد اس آرائش و زیبائش کو دیکھکر میں بالکل مرعوب ہو گیا۔ اور کاؤنٹ کا انتظار ایسے اضطرابی انداز میں کرنے لگا جیسے کوئی دیہاتی امیدوار شہر میں وزیر کی آمد کا منتظر ہو۔ دروازہ کھلا اور ایک بتیس سالہ خوشرو شخص داخل ہوا، اس کے انداز میں پرخلوص سادگی تھی۔ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا تعارف کرانا چاہا۔ مگر کاؤنٹ نے خود سبقت کی اور ہم بیٹھ گئے۔ تنہائی میں رہتے رہتے میری طبیعت میں جھجک سی پیدا ہو گئی تھی جو اس کی شائستہ اور بےتکلف گفتگو سے کچھ ہی دیر میں غائب ہو گئی۔ عین اسی وقت کاؤنٹس داخل ہوئی اور مجھ پر دوبارہ گھبراہٹ

کا دورہ پڑ گیا۔ وہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ کاؤنٹ نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ میں چاھتا تھا کہ میری بدحواسی ظاھر نہ ھونے پائے مگر نا کام رھا۔ میری حالت کا اندازہ لگا کر ان دونوں نے آپس میں بات چیت شروع کر دی گویا میں ان کا پرانا واقف ھوں جس کے سامنے رسمی تکلف غیرضروری ھے۔ میں اپنے حواسوں پر قابو پانے کے لئے کمرے میں ادھر ادھر گھوم کر لٹکی ھوئی تصویریں دیکھنے لگا۔ تصویروں کے متعلق میرا علم بہت ھی واجبی ھے۔ مگر ایک تصویر پر میری نگاہ جم کر رہ گئی۔ یہ تصویر سوئیزرلینڈ کے ایک حسین منظر کی نقاشی تھی۔ مگر مجھے اس میں کوئی فنی دلچسپی نہ تھی۔ میری تمام تر توجہ گولی کے ان دو نشانوں پر مرکوز تھی جو تصویر میں ایک دوسرے کے عین اوپر نیچے تھے۔ میں نے کاؤنٹ کو مخاطب کرکے کہا ''افوہ یہ کسقدر غضب کا نشانہ ھے۔،، ''واقعی کمال کا ھے،، اس نے مجھ سے اتفاق کیا، پھر پوچھا ''آپ کا نشانہ کیسا ھے؟،، ''نمبر ایک،، میں نے جواب دیا اور خوش تھا کہ میرے پسندیدہ موضوع پر بات چیت چھڑ گئی۔ ''میں تیس قدم سے تاش کے پتے پر نشانہ لگا سکتا ھوں بشرطیکہ پستول میرا اپنا ھو۔،، ''سچ مچ؟،، کاؤنٹس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اپنے شوھر سے محبت بھرے انداز میں پوچھا ''کیا تم بھی تیس قدم سے بےچوک نشانہ لگا سکتے ھو؟،، ''کسی دن آزمائش کرنی چاھئیے،، کاؤنٹ نے جواب دیا۔ ''کسی زمانے میں میرا نشانہ برا نہ تھا مگر پچھلے چار سال سے میں نے پستول کو ھاتھ تک نہیں لگایا۔،، ''تب تو میں شرطیہ کہہ سکتا ھوں کہ سرکار بیس قدم سے تاش کے پتے پر نشانہ نہیں لگا سکتے۔ پستول کی اچھی نشانہ بازی کے لئے روزمرہ کی مشق نہایت لازمی ھے۔ اور یہ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتا ھوں۔ مجھے رجمنٹ کے بہترین نشانہ بازوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ میرے پستول مرمت کے لئے گئے ھوئے تھے۔ میں مہینے بھر تک مشق نہ کر سکا، اس کے

بعد جو میں نے پہلے دن گولی چلائی تو یقین کیجئے پچیس قدم کے فاصلے سے بوتل کا نشانہ خطا کر گیا۔ ھمارا کپتان جو بڑا ظریف اور فقرہ باز تھا کہنے لگا ”ارے یار ھٹاؤ تم شراب کی بوتل کا نشانہ بنانے کی بدمذاقی نہیں کر سکتے۔“ سرکار کو بھی اس معاملے میں غفلت نہیں برتنی چاھئے ورنہ مشق بالکل چھوٹ جائیگی۔ میں نے تو صرف ایک آدمی کا سو فیصدی بے خطا نشانہ دیکھا تھا اور وہ روز مرہ بلا ناغہ مشق کیا کرتا تھا۔ کھانے سے پہلے کم از کم تین بار، اس کے لئے نشانہ بازی ایسے ھی لازمی تھی جیسے کھانے سے پہلے وودکا* کا گلاس۔“ کاؤنٹ اور کاؤنٹس خوش تھے کہ میری زبان کا قفل ٹوٹا۔ کاؤنٹ نے کہا: ”اس شخص کے نشانے کے متعلق کچھ اور بتائیے۔“ سرکار کیا بتاؤں کبھی کبھار تو ایسا ھوتا کہ وہ دیوار پر مکھی کو بیٹھا دیکھتا... آپ ھنس رھی ھیں بیگم صاحبہ مگر میں جو کچھ کہہ رھا ھوں وہ بالکل سچ ھے، میں قسم کھا سکتا ھوں... ھاں تو وہ مکھی کو دیکھکر کہتا: لانا کزکا میرا پستول! کزکا بھرا ھوا پستول لاتا۔ ٹھائیں! اور مکھی دیوار پر ھی پس جاتی۔“ ”واقعی کمال تھا! کیا نام تھا اس شخص کا؟“ ”سلویو۔“ ”سلویو!!!“ کاؤنٹ تعجب سے اچھل پڑا۔ ”کیا تم سلویو کو جانتے تھے؟“ ”جی ھاں، جی ھاں ھم دونوں تو بڑے گہرے دوست تھے۔ ھماری رجمنٹ میں تو سب اس سے اس طرح پیش آتے تھے گویا وہ ھم ھی سے ایک ھو۔ مگر پانچ برس ھونے کو آئے کہ مجھے اس کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ھوئی... کیا عالی جاہ بھی سلویو کو جانتے تھے؟“ ”میں؟ ھاں میں اسے خوب اچھی طرح جانتا تھا... کیا اس نے کبھی تمہیں؟.. مگر یہ بات نا ممکن سی ھے کہ اس نے اپنی زندگی کے ایک غیر معمولی واقعہ کا کسی سے ذکر کیا ھو۔“ ”کیا سرکار اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رھے ھیں جب

---

* وودکا: نہایت تند روسی شراب۔ (مترجم)

ایک سر پھرے نوجوان نے اس کے طمانچہ رسید کیا تھا؟،،
،،کیا اس نے تمہیں اس نوجوان کا نام نہیں بتایا؟،، ،،نہیں سرکار ۔،، اور اچانک مجھ پر حقیقت کا انکشاف ہو گیا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا ،،اوہ۔ معاف کیجئے... میرا مطلب تھا... مجھے بالکل اندازہ نہ تھا... وہ آپ تھے کیا؟،، ،،ھاں،، کاؤنٹ کے چہرے پر کرب کی کیفیت تھی۔ ،،اور یہ تصویر میری اور سلویو کی آخری ملاقات کی یادگار ہے۔،، کاؤنٹس نے کہا ،،اف! اس واقعہ کو مت دھراؤ، تم تو جانتے ہو کہ اس کی یاد میرے لئے کسقدر تکلیف دہ ہے۔،، ،،مگر میں ضرور بتاؤنگا۔ اگر یہ جانتے ھیں کہ میں نے ان کے دوست کی کس طرح بے عزتی کی تھی تو انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ سلویو نے کس طرح مجھ سے اپنا انتقام لیا۔،، اس نے میرے لئے ایک آرام کرسی گھسیٹ دی اور میں ہمہ تن گوش ہوکر یہ قصہ سننے لگا۔

،، میری شادی کو پانچ سال ہوئے ھیں۔ ھم‌نے اپنا ماہ عسل یہیں دیہات میں بسر کیا تھا۔ میری زندگی کے سب سے پرمسرت دن یہیں گذرے ھیں اور زندگی کی سب سے المناک یاد بھی اسی جگہ سے وابستہ ہے۔

،، ایک شام ھم دونوں میاں بیوی گھوڑوں پر سوار سیر کےلئے جا رہے تھے۔ راستے میں میری بیوی کا گھوڑا بدکنے لگا۔ وہ ڈر گئی اور گھوڑے کی باگ مجھے پکڑا کر خود پیدل گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں گھوڑے پر سوار آگے نکل گیا۔ گھر کے قریب پہنچکر میں نے دیکھا کہ احاطہ میں ایک گاڑی کھڑی ہے۔ نوکر نے بتایا کہ کوئی صاحب مطالعہ کے کمرے میں میرا انتظار کر رہے ھیں۔ مگر انہوں نے اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا ہے، صرف اتنا کہا ہے کہ ضروری کام ہے۔ میں اندر گیا تو شام کے دھندلکے میں ایک آدمی نظر آیا۔ سفر کی گرد میں اٹا ہوا، حجامت بڑھی ہوئی، وہ آتشدان کے سامنے عین اس جگہ کھڑا تھا۔ میں قریب جاکر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ،، کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا، کاؤنٹ؟،،

اس نے مرتعش آواز میں پوچھا۔ ”سلویو!“ میرے منہ سے نکلا۔ یقین مانئے اسے پہچان کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ”بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔ اب میری باری ہے گولی چلانے کی۔ میں اپنا پستول خالی کرنے آیا ہوں۔ کہو تیارھو؟“ اس کی اوپر کی جیب میں سے پستول کی نالی نظر آ رہی تھی۔ میں نے بارہ قدم ناپے اور اس کونے میں کھڑا ہوگیا اور اس سے جلدی کرنے کو کہا تاکہ میری بیوی کے وہاں پہونچنے سے پہلے قضیہ چک جائے۔ مگر وہ دیر لگاتا رہا۔ پہلے روشنی لانے کو کہا۔ خیر شمعیں لائی گئیں۔ میں نے کمرہ اندر سے مقفل کر لیا کہ چاہے کچھ ہو کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ اور پھر اس سے پستول چلانے کو کہا۔ اس نے پستول نکال کر نشانہ باندھا... میں گھڑیاں گن رہا تھا۔ بیوی کا خیال دل کو مسوس رہا تھا۔ اف بیم و ہراس کا وہ ایک لمحہ کسقدر خوفناک تھا... سلویو کا ہاتھ نیچے گر گیا اور اس نے کہا ”افسوس میرے پستول میں چیری کی گٹھلیاں نہیں ہیں اور گولیاں بہت بھاری ہوتی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں ڈوئیل نہیں لڑ رہا ہوں قتل کر رہا ہوں۔ کیونکہ نہتے آدمی پر گولی چلانا میرا شیوہ نہیں۔ اسلئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ڈوئیل نئے سرے سے لڑیں اور قرعہ ڈالیں کہ پہلے کون گولی چلائے۔“ میرا سر چکرا رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اس کی یہ تجویز رد کر دی مگر پھر نہ جانے کیسے ایک اور پستول بھرا گیا، دو کاغذ کی پرچیوں پر کچھ لکھ کر انہیں توڑ موڑ کر اسی ٹوپی میں ڈالا گیا جسے میں نے ایکدن نشانہ بنایا تھا۔ اس دفعہ بھی قرعہ میرے ہی نام نکلا۔ اس نے ایسے زہر خند کے ساتھ جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا کہا: ”کاؤنٹ تمہاری قسمت تو شیطان سے بھی اچھی ہے۔“ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے مجھے کیونکر آمادہ کیا اور یہ سب کیسے ہوا کہ میں نے گولی چلا دی جو اس تصویر پر جا کر لگی۔“ (کاؤنٹ نے گولی کے نشانوں

والی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، کاؤنٹس کا چہرہ اس کے شال سے زیادہ سفید تھا اور میں اپنی اضطراری چیخ نہیں روک سکا۔)

" میں نے گولی چلائی "، کاؤنٹ نے اپنی داستان جاری رکھی " اور شکر ہے کہ میرا نشانہ خطا ہوگیا۔ اب سلویو نے شست باندھی، اس کا چہرہ اسوقت انتہائی غضبناک تھا۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور ماشا اندر گھس آئی اور چیخیں مارتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اسے دیکھکر میرا دماغ جو اتنی دیر سے ماؤف تھا پھر کام کرنے لگا۔ میں نے اطمینان کا لہجہ بناکر اس سے کہا " پیاری تم دیکھتی نہیں ہم لوگ مذاق کر رہے ہیں۔ ذرا دیکھو تو تم نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے، جاؤ جاکر پانی وانی پئیو پھر یہاں آنا۔ میں تمہیں اپنے پرانے عزیز دوست سے ملانا چاہتا ہوں۔ "، ماشا کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ " کیا میرے شوہر ٹھیک کہہ رہے ہیں؟ "، ماشا نے ہمت کرکے سلویو سے پوچھا۔ " کیا سچ مچ آپ دونوں مذاق کر رہے ہیں ؟ " " یہ تو سدا مذاق ہی کرتے رہتے ہیں، کاؤنٹس۔ ایک دفعہ مذاق ہی مذاق میں انہوں نے میرے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ پھر انہوں نے مذاق میں میری ٹوپی کا نشانہ بنایا۔ اور ابھی مذاق میں پھر ان کا نشانہ چوک گیا... اب ذرا میرا بھی مذاق کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ "، یہ کہکر اس نے ماشا کے سامنے ہی پھر میری طرف نشانہ باندھنے کی کوشش کی... ماشا اس کے قدموں پر گر پڑی، میں بےاختیار چلایا " ماشا! یہ کیا کر رہی ہو، شرم نہیں آتی، اٹھو! اور جناب ایک بے بس اور بدنصیب عورت کا مذاق اڑانا کونسی مردانگی ہے؟ آپ گولی چلائینگے یا نہیں؟ " " نہیں " سلویو نے کہا۔ " میں نے تمہارے چہرے پر خوف و ہراس کی جھلک دیکھ لی۔ تم نے مجھ پر دوسری بار گولی بھی چلا لی۔ اب مجھے تسکین ہو گئی۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اب تم مجھے کبھی نہ بھول سکوگے۔ تمہارا فیصلہ تمہارے ضمیر پر چھوڑتا ہوں۔ "، یہ کہکر

وہ جانے کے لئے مڑا مگر دروازہ پر رک کر اس نے تصویر کی طرف دیکھا جس پر میری گولی کا نشانہ لگا تھا۔ اور تقریباً بغیر نشانہ باندھے اس نے لبلبی دبا کر گولی چلا دی اور غائب ہو گیا۔ گولی کی آواز سن کر میری بیوی بے ہوش ہوگئی۔ نوکر اس واقعہ سے اسقدر سراسیمہ تھے کہ کسی کو سلویو کو روکنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے برساتی میں پھونچکر اپنے سائیس کو آواز دی اور قبل اس کے کہ میرے حواس ٹھکانے ہوں وہ جا چکا تھا۔ ،،

کاؤنٹ چپ ہو گیا اور یوں مجھے اس عجیب و غریب کہانی کا انجام معلوم ہوا جس کے آغاز نے مجھے اسقدر متاثر کیا تھا۔ میں اس کہانی کے ہیرو سے پھر کبھی نہ مل سکا۔ مگر کہا جاتا ہے کہ سلویو نے الیکساندر اپسلانتی کی بغاوت میں ایک فوجی دستے کی رہنمائی کی اور اسکولیانی کی لڑائی میں مارا گیا۔

برفانی طوفان

گھوڑے ناھموار زمین پر برف کو ٹاپوں سے
روندتے بجلی کی سی تیزی سے اڑے چلے جا رہے ھیں...
کہ اچانک تنہائی اور سناٹے میں سے
خدا کا گھر نمودار ھوتا ہے۔

. . . .

برف و باد کا طوفان، دم کے دم میں، ھر
شے کو رو پہلی چادر سے ڈھانک لیتا
ہے۔ برف کے گالے رقص کرتے ھوئے گر رہے ھیں۔
واھمے کا کوا پر پھڑپھڑا کر
ھچکولے کھاتی ھوئی برف گاڑی پر
جھپٹتا ہے ، اس کی منحوس چیخ ھول میں
اور اضافہ کر رھی ہے۔
برق رفتار گھوڑے یاس کے دھند لکے
میں منزل کو تکتے ھیں۔
اور ان کے جسم خوف سے لرزاں ھیں...

ژوکوفسکی

ھماری تاریخ کا ناقابل فراموش دور تھا۔ ۱۸۱۱ء کے اختتام کا ذکر ہے جب معزز گاوریلا گاوریلووچ اپنی جاگیر نینارادووا میں رہتے تھے۔ علاقہ بھر میں ان کی رحم‌دلی اور مہمان‌نوازی کا چرچا تھا۔ ان کے قریبی پڑوسی اکثر ان کے ھاں آتے رہتے تھے، بعض کھانے پینے کے شوق میں،

بعض ان کی بیوی کے ساتھ پانچ کوپک کی بازی لگا کر بوسٹن کھیلنے کے لئے، اور بعض ان کی بیٹی ماریا گاوریلوونا کے شوق دیدار میں ۔ اس سترہ سالہ نازک اندام دوشیزہ کے بہت سے امیدوار تھے، لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک امیر دلہن ثابت ہوگی ۔ کوئی خود شادی کرنا چاہتا تھا اور کوئی اپنے بیٹے سے اس کی شادی کا خواہشمند تھا ۔

ماریا گاوریلوونا بچپن سے رومانی فرانسیسی ناول پڑھ پڑھ کر پلی تھی ۔ لہذا عشق میں مبتلا تھی ۔ اس کا محبوب ایک غریب اور ادنی فوجی افسر تھا جو چھٹیاں گذارنے اپنے آبائی گاؤں میں آیا ہوا تھا ۔ عشق کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی ۔ لیکن جونہی ماریا کے والدین کو اس دو طرفہ رجحان کا پتہ چلا ، انہوں نے بڑی سختی سے اپنی بیٹی کو اس نوجوان کا خیال تک دل سے نکال دینے کا حکم دیا ۔ اور نوجوان سے ان کا برتاؤ اس قدر سرد مہری کا ہو گیا گویا وہ محکمۂ آبکاری کا ریٹائرڈ مجسٹریٹ ہو ۔

اس پر بھی یہ محبت کے دیوانے کسی نہ کسی طرح خط و کتابت کرتے رہے۔ اور ہر روز صنوبر کے جھنڈ کی سنسان چھاؤں میں یا پرانے گرجا میں چھپ چھپ کر ملتے رہے جہاں وہ ابدی محبت کے عہد و پیمان باندھتے، کبھی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتے، کبھی آئندہ کے لئے تجویزیں سوچتے ۔ ان روز روز کی ملاقاتوں اور خط و کتابت کا یہ انجام ہوا کہ دونوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں جی سکتے ۔ اور اگر بے رحم والدین کو ان کی خوشی کا کچھ خیال نہیں تو وہ بھی ان کی رضامندی کی پرواہ کیوں کریں؟ یہ خیال پہلے تو نوجوان عاشق کے ذہن میں آیا مگر بعد میں رومان پسند ماریا گاوریلوونا نے بھی قبول کرلیا ۔

سردی کا موسم آتے ہی ان کی خفیہ ملاقاتیں تو ختم ہو گئیں مگر خط و کتابت میں اور بھی گرمجوشی پیدا ہوگئی ۔ ولادیمیر نیکولائےوچ ہر خط میں اپنی محبوبہ سے التجا کرتا کہ وہ اس کے ساتھ خفیہ شادی کرکے ہمیشہ

کےلئے اس کی ہو جائے۔ کچھ دنوں پوشیدہ رہنے کے بعد وہ دونوں ماریا کے والدین کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگ لیں گے۔ اور یقین ہے کہ ان کا دل بھی ان باوفا عاشقوں کی بہادری اور مصیبتوں کے خیال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہےگا۔ وہ یقیناً انہیں اپنی شفقت بھری آغوش میں پناہ دے دیں گے۔

شروع میں ماریا گاوریلوونا کو یہ تجویز قبول کرنے میں کافی ہچکچاہٹ تھی۔ بھاگنے کی کتنی ہی تجویزیں پیش ہوئیں اور مسترد ہو گئیں۔ مگر آخرکار وہ بھی راضی ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ فرار ہونے کے دن وہ کھانے پر نہ جائے اور سر کے درد کا بہانہ کرکے کمرے میں لیٹی رہے۔ اپنی ایک خادمہ کو شریک راز بنالے۔ رات گئے دونوں لڑکیاں پچھلی طرف سے باغ میں اتر جائیں جہاں ان کو برف گاڑی تیار ملے گی۔ اس میں بیٹھ کر وہ نینارادووا سے پانچ کوس دور ژادرینو کے گاؤں میں پہنچ کر سیدھی گرجا گھر کے سامنے جا اتریں۔ وہاں ولادیمیر ان کا منتظر ہوگا۔

بھاگنے سے ایک دن پہلے ماریا گاوریلوونا رات بھر نہ سوئی۔ کچھ دیر تو ساتھ لیجانے کے لئے کپڑے وغیرہ رکھتی رہی، پھر ایک طویل درد بھرا خط اپنی ایک جذباتی سہیلی کے نام لکھا۔ ایک اور خط اپنے والدین کو لکھا جس میں اس نے نہایت پراثر انداز میں ان سے رخصت چاہی اور لکھا کہ جذبۂ عشق سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھا رہی ہوں۔ لیکن سچی خوشی مجھے اس وقت ہو گی جب آپ مجھے معاف کرکے اپنے قدموں پر سر جھکانے کی اجازت دیں گے۔ پھر اس نے دونوں خطوں پر شہر تولا کی بنی ہوئی مہر لگائی جس پر ایک با موقع تحریر کے اوپر دو بھڑکتے ہوئے دل کندہ تھے، دن نکلنے سے پہلے وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑی اور کچھ دیر کو اس کی آنکھ جھپک گئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ ڈراؤنے خواب دیکھکر چونک اٹھتی۔ کبھی دیکھتی کہ گرجا جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اس کا باپ عین وقت پر آجاتا ہے اور اسے ایک اتھاہ تاریک غار میں پھینک دیتا ہے، وہ نہایت تیزی

سے نیچے کی طرف گرتی جا رہی ہے اور جیسے اس کے دل کی حرکت بند ہونے کو ہے۔ دوسری دفعہ سوئی تو اس نے ولادیمیر کو خون میں شرابور نیم جان گھاس پر پڑے دیکھا۔ مرتے وقت وہ بڑے دلخراش لہجے میں شادی میں جلدی کرنے کی التجا کرتا ہے۔ اس طرح کے بے ربط خوفناک ہیولے خواب میں اس کی نگاہوں کے سامنے سے گذرتے رہے۔ آخر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ اور سر میں سچ مچ درد شروع ہوگیا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی حالت دیکھکر متفکر ہو گئے۔ اور بہت محبت سے پوچھا : ''ماشا، کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ؟،، ان کی دل جوئی دل پر برچھی کی طرح لگی۔ اس نے چاہا کہ ان کی فکر دور کرنے کو چہرے پر خوشی پیدا کر سکے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں اس خیال سے ہوک اٹھ رہی تھی کہ خاندان والوں کی محبت بھری آغوش میں یہ اس کی آخری شام ہے اس کا دم جیسے گھٹ رہاتھا۔ دل ہی دل میں اس نے گھر کے ہر فرد کو، اپنی جانی پہچانی ہر چیز کو الوداع کہا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور ماں باپ کو شب بخیر کہا۔ انہوں نے حسب معمول پیار کیا اور دعائیں دیں۔ ماریا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ بڑی مشکل سے کمرے تک پہنچی اور دروازہ بند کرتے ہی کرسی پر بےقابو ہوکر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خادمہ نے اسے تسلی تشفی دی۔ جانے کی سب تیاریاں مکمل تھیں، آدھہ گھنٹے بعد ماشا اپنے والدین کے گھر، اپنے کمرے، اپنی بچپن کی الھڑ اور بےفکر زندگی سے ہمیشہ کےلئے رخصت ہونے والی تھی۔ باھر طوفانی برفباری ہو رہی تھی۔ ہوا غرا رہی تھی، جھلملیاں چرچرا رہی تھیں، اسے یہ سب چیزیں کسی بدشگونی کی علامتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر میں سارا گھر نیند کے جادو میں مدھوش ہوگیا۔ ماشا نے سر پر شال اوڑھی، گرم لبادہ لپیٹا، اپنے زیور کا صندوقچہ اٹھایا اور پچھلے دروازے سے باھر نکل آئی۔ پیچھے پیچھے خادمہ

ھاتھ میں دو پارسل اٹھائے تھی۔ دونوں باغ میں پہنچیں۔ طوفان کی تیزی میں ذرا کمی نہ ھوئی تھی، منہ پر ھوا کے تھپیڑے نوعمر مجرم کو گناہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ھوئے معلوم ھوتے تھے۔ غرض وہ بمشکل باغ کے دوسرے سرے تک پہنچیں۔ سڑک پر سلج ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔ گھوڑے سردی سے شل ھو چکے تھے اور دوڑنے کے لئے بیقرار ھوکر ٹاپیں مار رھے تھے۔ ولادیمیر کا کوچوان گاڑی کے بموں کے سامنے ٹہل رھا تھا تاکہ کسی طرح جوشیلے گھوڑوں کو قابو میں رکھ سکے۔ اس نے سہارا دے کر ماریا اور اس کی خادمہ کو گاڑی میں بٹھایا۔ بنڈل اور صندوقچہ اندر رکھا۔ لگامیں تھامتے ھی گھوڑے سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگے۔ اب ھیروئن کو قسمت اور کوچوان تریشکا کی مہارت کے سپرد کر کے ھم نوجوان عاشق کی طرف توجہ مبذول کرتے ھیں۔

ولادیمیر دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رھا۔ صبح کو پہلے تو ژادرینو کے پادری صاحب کے پاس گیا اور ان کو بڑی مشکل سے شادی کی رسم ادا کرنے پر راضی کیا۔ پھر وہ گواھوں کی تلاش میں آس پاس کے زمینداروں کے ھاں جانے کے ارادہ سے نکلا۔ سب سے پہلے وہ دراون نامی ایک چالیس سالہ ریٹائرڈ عہدیدار کے ھاں گیا جو فوراً گواھی دینے پر راضی ھو گیا۔ اور کہنے لگا کہ اس تذکرے سے مجھے پرانے زمانے کی فوجی زندگی کی ھنگامہ خیزیاں یاد آ گئیں۔ اس نے ولادیمیر کو کچھ دیر ٹھہرنے اور اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت بھی دی اور یقین دلایا کہ اسے بقیہ دو گواہ بھی باسانی مل جائیں گے۔ اور ھوا بھی یہی۔ کھانے کے فوراً بعد انسپکٹر اراضی شمت مونچھیں چڑھائے، سہمیز لگائے، قصبہ کے پولس انسپکٹر کے بیٹے کی ھمراہ داخل ھوئے۔ یہ نوجوان جس نے عمر کی سولہ بہاریں دیکھی تھیں حال ھی میں الانز کی رجمنٹ میں بھرتی ھوا تھا۔ جب انھوں نے ولادیمیر کی درخواست سنی تو نہ صرف وہ خوشی سے گواہ بننے پر ارضی ھو گئے بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ اس کی خاطر جان تک دینے میں دریغ نہ کریں گے۔ ولادیمیر

جوش و خروش کے ساتھ ان سے گلے ملا اور خوش خوش باقی تیاریاں کرنے اپنے گھر چلدیا ۔

شام کا دھندلکا چھا چکا تھا ۔ اس نے اپنی تین گھوڑوں کی گاڑی اپنے معتمد تریشکا کے ساتھ مکمل ہدایات دے کر نینارادووا روانہ کی اور خود اپنی چھوٹی ایک گھوڑے کی برف گاڑی لیکر ژادرینو کی طرف روانہ ھو گیا جہاں دو گھنٹے بعد ماریا گاوریلوونا کے آنے کی امید تھی ۔ راستہ اس کا جانا بوجھا تھا ۔ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا ۔

لیکن ولادیمیر گاؤں سے باھر نکلا ھی تھا کہ ھوا میں تندی پیدا ھو گئی اور برفانی طوفان نے وہ شدت اختیار کی کہ ولادیمیر کو کچھ نظر نہ آتا تھا ۔ منٹ بھر میں سڑک پر برف کی تہ بچھ گئی اور ارد گرد کی سب چیزیں ایک بےنور پیلے دھندلکے میں ڈوب گئیں جس میں برف کے سفید گالے تیر رہے تھے ۔ زمین اور آسمان مل کر ایک ھو گئے ۔ اتنے میں ولادیمیر کو احساس ھوا کہ اس کی گاڑی کسی کھیت میں گھس گئی ھے، اس نے دوبارہ سڑک پر گاڑی ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ۔ گھوڑا کسی نا معلوم سمت میں اڑا چلا جا رہا تھا ۔ کبھی برف کے تودوں میں جا پھنستا، کبھی کسی گڑھے میں بھٹک جاتا ۔ ہر لمحہ گاڑی الٹ جاتی تھی ۔ ولادیمیر کی تمامتر کوشش یہی تھی کہ راستے کا سراغ نہ کھو جائے ۔ اسی حالت میں (اس کے خیال میں) اسے آدھہ گھنٹہ گذر گیا ۔ مگر وہ ژادرینو کے جنگل تک نہ پہنچ سکا ۔ دس منٹ اور گذر گئے ۔ پھر بھی درختوں کا جھنڈ نہ دکھائی دیا ۔ اب وہ ایک ایسے کھلے میدان میں جا پہنچا تھا جسے گہری گھاٹیوں نے آڑا ترچھا کاٹ رکھا تھا ۔ طوفان اسی شدت سے جاری تھا ۔ آسمان بادلوں سے چھپا ھوا تھا ۔ گھوڑا تھک چکا تھا ۔ اور ولادیمیر برف میں کمر تک دھنسا ھونے کے باوجود پسینے میں شرابور تھا ۔

بہت دیر بعد اسے اندازہ ھوا کہ وہ بالکل غلط طرف جا رہا ھے۔ اس نے لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور اندازہ کرنا چاھا

کہ وہ کس طرف ہے اور اب اسے کدھر مڑنا چاہئیے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اسے دائیں ہاتھ کی طرف مڑنا چاہئیے تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اسی طرف چل پڑا۔ گھوڑا بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح راستے پر ایک گھنٹے سے زیادہ گذر گیا۔ اور اس نے سوچا کہ اب ژادرینو زیادہ دور نہ ہوگا۔ وہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ ان کھیتوں کا کہیں اختتام ہی نہیں ہے۔ ہر طرف برف کے انبار اور گھاٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر قدم پر گاڑی الٹ الٹ جاتی تھی اور ولادیمیر ہر بار گاڑی کو ٹھیک اور سیدھا کرتا تھا۔ وقت گذرتا گیا۔ ولادیمیر کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

بہت دیر بعد اسے افق پر ایک سیاہ دھبہ نظر آیا۔ ولادیمیر نے فوراً گھوڑے کا رخ ادھر موڑ دیا۔ نزدیک آیا تو اسے ایک جنگل دکھائی دیا۔ اس نے یہ سمجھ کر کہ اب وہ منزل مقصودکے قریب پہنچ گیا ہے، خدا کا شکر ادا کیا، گھوڑے کو تیز کیا تاکہ جلد از جلد جنگل کو پار کرکے دوسری طرف جانی پہچانی سڑک پر پہنچ جائے جہاں سے وہ بھٹک گیا تھا۔ اسی سڑک کے دوسری طرف ژادرینو تھا۔ چند منٹ میں وہ سڑک پر پہنچ گیا۔ گاڑی موسم سرما کے بےبرگ‌وبار درختوں کے اداس سایوں کے نیچے چلنے لگی۔ یہاں ہوا کا زور کم تھا۔ سڑک ہموار تھی۔ گھوڑے میں بھی کچھ دم آگیا تھا۔ اور ولادیمیر کے حواس بھی کچھ درست ہوئے۔

وہ یونہی بڑھتا گیا۔ مگر حد نظر تک ژادرینو کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جنگل کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتاتھا۔ پر تھوڑی دیر بعد اسے اس خیال سے وحشت ہونے لگتی کہ اب وہ کسی اور انجانے جنگل میں بھٹک گیا ہے۔ پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے گھوڑے کو بے تحاشا مارنا شروع کیا۔ بےچارہ گھوڑا پہلے تو بوکھلا کر سرپٹ بھاگا مگر پندرہ منٹ بعد تھک کر پھر قدم قدم چلنے

لگا۔ اور پھر مصیبت زدہ ولادیمیر کی انتہائی کوشش پر بھی اس کی رفتار میں چستی پیدا نہ ہوئی۔

رفتہ رفتہ گھنا جنگل چھٹ گیا۔ مگر جب ولادیمیر باہر نکلا تو بھی ژادرینو نظر نہ آیا۔ اسے یقین تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے اندھا دھند گاڑی چلانی شروع کردی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ بادل اڑ گئے تھے۔ حد نظر تک سفید برف سے ڈھکا ہوا میدان لہریں لے رہا تھا۔ رات خاصی روشن تھی۔ دفعتاً ذرا فاصلے پر اسے ایک چھوٹی سی بستی نظر آئی۔ گھوڑے کو تیز کرکے اس کے قریب پہنچا۔ اور پہلے جھونپڑے کے قریب گاڑی سے کود پڑا اور کھڑکی کا پٹ دھڑ دھڑانے لگا۔ منٹ بھر بعد چوبی جھلملی کھلی اور ایک بوڑھے آدمی نے سفید داڑھی باہر نکال کر جھانکا۔ ”کیا کام ہے؟“ ”کیا ژادرینو یہاں سے بہت دور ہے؟“ ”نہیں زیادہ دور نہیں ہے، کوئی دس کوس ہوگا۔“ یہ سن کر ولادیمیر نے اپنے سر کے بال نوچ لئے۔ اس وقت اس کی حالت اس آدمی کی سی تھی جس نے سزائے موت کا حکم سنا ہو۔

”تم کہاں سے آ رہے ہو؟“ مگر ولادیمیر کی جواب دینے کی طاقت گویا سلب ہو چکی تھی۔ ”بڑے میاں کیا مجھے ژادرینو تک جانے کے لئے گھوڑا مل سکتا ہے؟“ ”اجی، ہمارے ہاں کیا گھوڑے بندھے ہوئے ہیں؟“ ”اچھا کوئی مجھے وہاں کا راستہ دکھا سکتا ہے؟ میں اسے منہ مانگا انعام دوں گا۔“ ”ایک منٹ ٹھیرو“ اس نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے بیٹے کو بھیجتا ہوں۔ وہ تمہیں راستہ بتا دے گا۔“ ولادیمیر انتظار کرنے لگا۔ لیکن اسے ایک ایک منٹ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے پھر کھڑکی پر ہاتھ مارا۔ کھڑکی کھلی اور وہی سفید داڑھی دوبارہ نمودار ہوئی۔ ”کیا ہے؟“ ”تمہارا بیٹا کہاں رہ گیا؟“ ”ابھی آتا ہے۔ ذرا جوتے پہن رہا ہے۔ اندر آ جاؤ۔ اگر سردی لگ رہی ہو تو آگ تاپ لو۔“ ”نہیں، نہیں مجھے بہت جلدی ہے۔ اپنے بیٹے کو بھیجو جلدی سے۔“

دروازہ چرچرایا اور ایک نوجوان لڑکا سونٹا ھاتھ میں لئے باھر نکلا اور آگے آگے چلنے لگا۔ کبھی وہ اشارے سے راستہ دکھاتا، کبھی رک کر راستے کا کھوج لگاتا کیونکہ برف نے سب نشانات مٹا دئے تھے۔ ولادیمیر نے اس سے وقت پوچھا۔ ''صبح ھونے والی ھے،، وہ بولا۔ یہ سنتے ھی ولادیمیر کی زبان گنگ ھوگئی۔

جب وہ ژادرینو پہنچے تو مرغ بانگ دے رھے تھے۔ پوپھٹ چکی تھی۔ گرجا کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔ ولادیمیر نے رھبر کو انعام دیا۔ اور پادری کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مگر گاڑی وھاں بھی نہ تھی۔ پتہ نہیں آگے کیا ھونے والا تھا!

اب ھم نینارادووا کے مکینوں کی طرف لوٹتے ھیں تاکہ دیکھیں کہ وھاں کیا ھو رھا ھے۔

مگر وھاں کوئی خاص بات معلوم نہیں ھوتی۔

لوگ حسب معمول اٹھے۔ ماریا کے معمر والدین روز کے معمول کے مطابق ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھ گئے۔ گاوریلا گاوریلووچ شب خوابی کی ٹوپی اور فلالین کی واسکٹ پہنے ھوئے تھے۔ اور پراسکوویا پتروونا روئی کے فرغل میں ملبوس تھیں۔ سماوار کمرے میں لاکر رکھا گیا۔ گاوریلا گاوریلووچ نے ایک خادمہ سے کہا کہ جاکر ماریا گاوریلووِنا کی طبیعت پوچھے اور معلوم کرے کہ ان کو رات کو کیسی نیند آئی؟ خادمہ ذرا دیر بعد واپس آئی اور کہنے لگی کہ ''بی‌بی کو نیند تو اچھی طرح نہیں آئی مگر طبیعت بہتر ھے۔ وہ ابھی نیچے آ رھی ھیں،، اسی وقت دروازہ کھلا اور ماریا گاوریلوونا نے داخل ھو کر اپنے والدین کو سلام کیا۔

''ماشا تمہارے سر کا درد اب کیسا ھے؟،، گاوریلا گاوریلووچ نے پوچھا۔ ''بہتر ھے پاپا،، اس نے جواب دیا۔ ''کل دیر تک آتشدان کے پاس بیٹھے رھنے سے سر میں درد ھوا ھوگا،، پراسکوویا پتروونا نے کہا۔ ''شاید یہی بات ھو، اماں،، ماشا نے کہا۔

دن بخیر و خوبی گذر گیا۔ مگر رات کو ماشا بیمار

پڑ گئی۔ قریب کے قصبے سے ڈاکٹر کو بلوایا گیا جو اگلے دن شام ہوئے وهاں پہنچا۔ اس وقت تک ماشا کی سرسامی کیفیت هو چکی تھی۔ بخار بہت تیز تھا۔ غریب لڑکی دو هفتے تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رهی۔

گھر میں کسی کو اس کے فرار هونے کا علم نه تھا۔ ماشا نے جانے سے پہلے جو خط لکھے تھے واپسی پر جلا دئیے۔ ماشا کی خادمه نے اپنے آقا کے ڈر سے کسی کے سامنے ایک لفظ تک منه سے نه نکالا۔ پادری، ریٹائرڈشده فوجی عہدیدار، مونچھوں والا انسپکٹر اراضی اور نوجوان فوجی سبھی اپنی اپنی مصلحتوں سے خاموش تھے یہاں تک که سائیس تریشکا کے منه سے بھی کبھی کوئی بات نه نکلی، نشے کی حالت میں بھی نہیں۔ اور اس طرح یه راز جس میں چھهسات آدمی شامل تھے راز هی رها۔ لیکن ماریا گاوریلوونا نے اپنی طویل هذیانی حالت میں خود هی یه راز اگل دیا۔ مگر اس کی باتیں اتنی ناقابل فهم تھیں که اس کی ماں جو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رهتی تھیں صرف اتنا سمجھ سکیں که ان کی بیٹی ولادیمیر نیکولائےوچ سے بے تحاشا محبت کرتی هے اور شاید یه محبت هی اس کی بیماری کی جڑ هے۔ اس نے اس بات کا اپنے شوهر سے ذکر کیا۔ انهوں نے اپنے دوستوں سے مشوره کیا اور سب کی یهی رائے هوئی که شاید لڑکی کی قسمت میں یهی لکھا هے اور تقدیر کے لکھے سے کوئی مفر نہیں۔ انهوں نےاپنے دل کو یه کهکر بھی سمجھایا که مفلسی کوئی جرم نہیں اور زندگی روپیوں کی تھیلی کے ساتھ نہیں گذاری جاتی بلکه انسان کی رفاقت میں بسر هوتی هے۔ غرض اس قسم کے اور سب فرسوده قول دهرائے گئے جو ایسے موقعوں پر کام آتے هیں جب هم اپنے فیصلوں کی اور کوئی توجیه نہیں کر سکتے۔

اسی دوران میں لڑکی رفته رفته صحتیاب هونے لگی۔ ولادیمیر بهت عرصے سے گاوریلا گاوریلووچ کے هاں نه آیا تھا کیونکه وه ان لوگوں کے برتاؤ سے کافی خائف هو چکا تھا۔ اب تجویز هوئی که ایک دن اسکو بلایا جائے

اور شادی پر رضامندی کی غیرمتوقع خوش خبری سنائی جائے۔ لیکن نینارادووا کے مالکوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جواب میں انہیں اس نوجوان کا ایک نیم مجنونانہ خط ملا جس مین اس نے لکھا تھا کہ آئندہ کبھی وہ ان کی دھلیز پر قدم نہ رکھےگا اور یہ کہ وہ اس قسمت کے ستائے بدنصیب کو بالکل بھول جائیں جس کے لئے اب سوائے موت کے کوئی چارہ نہیں... چند دن بعد سنا گیا کہ وہ فوج کو واپس چلا گیا ہے۔ یہ واقعہ ۱۸۱۲ء کا ہے۔

زمانہ گزرتا رہا۔ کسی کو بیمار ماشا کے سامنے اس واقعہ کا ذکر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خود ماشا نے کبھی ولادیمیر کا نام تک زبان سے نہ نکالا۔ کئی مہینے بعد اتفاق سے اس نے ان لوگوں کی فہرست دیکھی جنہیں بوردینو کی جنگ میں جانبازی کے انعام میں تمغے عطا ہوئے تھے اور جو خطرناک طور پر زخمی ہو گئے تھے۔ اس فہرست میں ولادیمیر کا نام دیکھکر وہ بیہوش ہو گئی۔ سب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں پھر بخار نہ رہنے لگے مگر شکر ہے کہ اس بیہوشی کا کوئی خطرناک نتیجہ نہیں نکلا۔

چند ہی دنوں بعد اس غریب کو ایک اور صدمہ سہنا پڑا۔ یعنی اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ ساری جائداد کی تنہا وارث تھی مگر اس ورثے سے اسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کا دل اپنی غمزدہ ماں کی بیوگی کے دکھ سے اتنا بیقرار تھا کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ کبھی اس سے جدا نہ ہوگی۔ نینارادووا سے بہت سی غمگین یادیں وابستہ تھیں اس لئے دونوں ماں بیٹیاں وہاں سے اپنی جاگیر کے ایک گاؤں ”خ“ میں رہنے چلی گئیں۔

وہاں بھی اس حسین امیرزادی کے گرد امیدواروں کا ایک جمگھٹ ہو گیا۔ مگر اس نے کبھی کسی کی ہمت افزائی نہ کی۔ اس کی ماں اکثر اس کو زندگی کا ساتھی چننے پر اکساتی بھی تو ماریا گاوریلوونا سر ہلاکر خاموش ہو جاتی۔ ولادیمیر اب اس دنیا میں نہ تھا۔ جس دن فرانسیسی ماسکو میں داخل ہوئے اس شام اس نے

دم توڑ دیا۔ ماشا نے اس کی یاد کے مقدس سرمائے کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی یادگار محفوظ تھی۔ اس کی کتابیں، اس کی بنائی ہوئی تصویریں، اشعار اور موسیقی جو اس نے ماریا کےلئے نقل کئے تھے، سب جوں کے توں محفوظ تھے۔ جب ہمسایوں کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اس کی وفاپرستی پر دنگ رہ گئے۔ اور سوچنے لگے کہ نہ معلوم وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس پاکباز آرتمس کی سوگوار وفا شعاری پر فتح پائیگا۔

اسی دوران میں جنگ ختم ہو گئی اور ہماری فتحیاب فوجیں دوسرے ملکوں سے واپس آنے لگیں۔ لوگ استقبال کےلئے اپنے گھر چھوڑ کر باھر نکل پڑے۔ بینڈ پر فاتحانہ نغموں ”ویو ھنری کاتر،،، ترولیز والز اور ”لا جوکوند،، کی دھنیں بجائی جانے لگیں۔ افسر جو بھرتی کے وقت محض کمسن لڑکے تھے، میدان جنگ سے پختہ کار اور باشعور ہوکر بہادری کے تمغے سینوں پر لگائے واپس لوٹے۔ ہر طرف فوجی خوش خوش آپس میں چہلیں کرتے۔ تو ان کی گفتگو میں فرانسیسی اور جرمن لفظوں کی آمیزش ہوتی۔ وہ بھی کیسے ناقابل فراموش دن تھے! فتح و کامرانی کے دن! ہر روسی کا دل لفظ وطن کی پکار پر کس شدت سے دھڑکتا تھا! برسوں کی جدائی کے بعد ملاقات کے آنسو کس قدر شیریں تھے! سب روسیوں کے دل میں قومی فخر و مباھات اور زار کی محبت کا جذبہ ہم معنی ہو چکے تھے اور خود زار کے لئے یہ لمحہ کس قدر بہجت آفریں تھا!

اور اس زمانے میں روسی عورتوں کی دلنوازی بےمثال تھی۔ ان کی فطری سردمہری غائب ہو چکی تھی۔ وہ خوشی کے نشے میں سرشار تھیں۔ جب وہ فاتح نوجوانوں سے ملتیں تو ”اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھال اچھال کر نعرے بلند کرتیں،،۔

اس زمانے کا کوئی فوجی افسر ایسا نہیں جو یہ نہ مانے کہ اس کی جانبازی کا سب سے بیش قیمت صلہ کسی روسی نازنین کا مرہون‌منت تھا۔

اس خیرہ کن زمانے میں ماریا گاوریلوونا اپنی ماں کے ساتھ ”خ“ میں رہتی تھی۔ اس نے وہ جوش و خروش نہیں دیکھا جو فوجوں کی آمد کے جشن پر دونوں دارالخلافوں میں تھا۔ لیکن ہر طرف ایک عام جوش پھیلا ہوا تھا جو گاؤں میں شہروں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ ان جگہوں میں کسی افسر کا نظر آنا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس کے سامنے اور نوجوانوں کی کوئی بات تک نہ پوچھتا۔

ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ باوجود سرد مہری کے ماریا گاوریلوونا چاہنے والوں کے مجمع میں گھری رہتی تھی۔ مگر اس زمانے میں ایک زخمی فوجی افسر جس کا نام کرنل برمن تھا اس علاقے میں آیا اور چند ہی دنوں میں اور سب نوجوان پس پشت پڑگئے۔ اس کے سینے پر سینٹ جارج کا تمغہ آویزاں تھا۔ اور مقامی نوجوان لڑکیوں کے خیال میں اس کے چہرے کی رنگت میں ایک دلکش زردی تھی۔ اس کی عمر کوئی چھبیس سال کی ہوگی۔ وہ چھٹیوں میں اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کرنے آیا تھا جو ماریا گاوریلوونا کی جاگیر کے بالکل قریب تھی۔ ماریا گاوریلوونا بھی اس کے ساتھ کچھ خصوصیت برتتی تھی۔ اس کی موجودگی میں ماریا کے چہرے کی غمگینی شگفتگی میں تبدیل ہو جاتی۔ اور گو اس کے انداز میں عشوہ و ناز کا شائبہ تک نہ تھا مگر کوئی شاعر اس کو دیکھتا تو کہہ اٹھتا ”اگر یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے؟“

برمن کی شخصیت بڑی دلاویز تھی۔ اس کی طبیعت اس قسم کی تھی جو عورتوں کےلئے خاص طور پر پرکشش ہوتی ہے: شائستہ اور بااخلاق، تصنع اور بناوٹ سے پاک، ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی ظرافت کی چاشنی انداز میں۔ ماریا گاوریلوونا کے سامنے اس کے انداز میں نہایت سادگی ہوتی مگر وہ جو کچھ کہتی، جہاں کہیں جاتی برمن کا خیال اور نظریں اس کا پیچھا کرتے۔ بظاہر وہ بڑا خاموش طبیعت اور محتاط تھا۔ لیکن یہ افواہ سنی گئی تھی کہ کسی زمانے میں وہ بڑا منچلا تھا۔ مگر ماریا گاوریلوونا کی نظروں میں اس وجہ سے اس کی قدر کچھ کم نہ ہوئی کیونکہ

اور نوجوان لڑکیوں کی طرح وہ بھی گرمی جذبات اور جرأت کی مداح تھی۔

مگر جس چیز نے ماریا کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ برمن کا شریفانہ انداز، مزاحیہ اور دلچسپ گفتگو، چہرے کا دلکش حزن اور زخمی بازو نہ تھا بلکہ وہ ضبط اور جھجک تھی جو برمن کے انداز سے ظاہر تھی۔ ماریا گاوریلوونا کو یقین تھا کہ برمن کے دل پر محبت کا نقش پڑ چکا ہے۔ دوسری طرف برمن بھی اپنی فراست اور تجربے کی مدد سے یہ جانتا تھا کہ ماریا گاوریلوونا اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے۔ اسی لئے ماریا گاوریلوونا کو حیرت تھی کہ آج تک برمن نے اس کے قدموں پر جھک کر اظہار محبت کیوں نہیں کیا۔ کس خیال نے اسے روک رکھا ہے؟ یہ سچی محبت کی بے زبانی تھی یا خودداری اور تکبر، یا تجربہ‌کار کھل کھیلے ہوئے مرد کی عیاری۔ وہ ماریا گاوریلوونا کے لئے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ آخر بڑے غوروفکر کے بعد اس نے یہی طے کیا کہ پاس محبت ھی برمن کو اظہار جذبات سے روکے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس کی ہمت افزائی کرنے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اور بھی خصوصیت کا اظہار کرے گی بلکہ موقع پڑنے پر تھوڑے بہت التفات سے پیش آئے گی۔ اس نے ایک ایسی تجویز سوچی جو بالکل غیرمتوقع اور برمن کو اپنے دل کا حال کہنے پر مجبور کرنے والی تھی۔ عورت کے دل کو معموں سے بڑی الجھن ہوتی ہے، خیر ماریا گاوریلوونا کی یہ کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ برمن ہر وقت کسی خیال میں کھویا رہنے لگا۔ اس کی نگاہ شوق اس والہانہ انداز سے ماریا گاوریلوونا کے چہرے کی بلائیں لیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا ہے۔ پڑوسیوں میں شادی کا تذکرہ اس طرح ہونے لگا گویا یہ کوئی طے شدہ بات ہو، نیک دل پراسکوویا پتروونا بھی خوش تھیں کہ آخر ان کی بیٹی نے اپنے لئے ایک لائق بر چن لیا۔

ایک دن معمر خاتون ڈرائنگ روم میں تاش پھیلائے پیشنس کھیل رہی تھیں کہ برمن داخل ہوا اور ماریا

گاوریلوونا کے متعلق پوچھا ۔ ''وہ باغ میں ہے،، معمر خاتون نے جواب دیا ۔ '' تم وھیں چلے جاؤ۔ میں یہاں تم دونوں کا انتظار کرتی ہوں ۔ ،، برمن باھر چلا گیا ۔ بڑی بی نے مارے خوشی کے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا، انہیں یقین تھا کہ آج سب معاملہ طے ہو جائے گا ۔

برمن نے دیکھا کہ ماریا گاوریلوونا سفید لباس میں ملبوس تالاب کے کنارے بیدمجنوں کے درخت کے سائے میں کتاب پڑھ رھی ہے۔ بالکل جیسے کسی ناول کی ھیروئن ہو ۔ معمولی علیک سلیک کے بعد ماریا گاوریلوونا جان بوجھ کر خاموش ہوگئی ۔ اس خاموشی نے دونوں کے درمیان جھجھک اور ھلکی سی گھبراھٹ پیدا کر دی، جس کو ختم کرنے کا ایک ھی طریقہ تھا کہ برمن اپنی محبت کا اظہار کر دے ۔ اور ھوا بھی یہی : برمن کو اس وقت کی خاموشی کے بےتکے پن کا احساس تھا ۔ ایک دم اس کی زبان کو گویائی مل گئی ۔ اس نے کہا کہ مدت سے وہ ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ اپنا حال دل ماریا گاوریلوونا کے سامنے بیان کر سکے ۔ پھر اس نے التجا کی کہ لمحے بھر کےلئے اس کی بات توجہہ سے سنے ۔ ماریا گاوریلوونا نے کتاب بند کردی اور آنکھیں جھکا کے اسے عرض شوق کی اجازت دے دی ۔

'' مجھے تم سے محبت ہے، انتہائی محبت ہے ۔ ،، (ماریا گاوریلوونا کے گال شرم سے تمتمانے لگے اور سر اور بھی جھک گیا ۔) '' میں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی، میں جانتا ہوں کہ تمہیں روز دیکھنے اور تمہاری شیرین گفتگو سننے کی آرزو میری بڑی نادانی تھی ۔ ،، (ماریا گاوریلوونا کو سینٹ پرے کے پہلے خط کا خیال آیا ۔) '' مگر آہ اب بہت دیر ہو چکی ہے، اب میں اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتا ۔ تمہاری یاد، تمہاری حسین اور بے مثل تصویر ھمیشہ میرے دل پر نقش رھیگی، جو میری زندگی کی واحد خوشی بھی ہوگی، اور رنج کا باعث بھی... اب مجھے ایک ناخوشگوار فرض اور انجام دینا ہے، میں ایک راز تمہارے سامنے کھولنے پر مجبور ہوں جو ھمارے

درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دیگا۔ ،،
ماریا گاوریلوونا نے بڑی بے تابی سے اس کی بات کاٹی ''یہ رکاوٹ تو ہمیشہ سے موجود تھی، میں تمہاری کبھی نہیں ہو سکتی... ''مجھے معلوم ہے،، اس نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم کسی اور سے محبت کرتی تھیں، لیکن موت نے تین سال ہوئے تمہیں اس سے جدا کر دیا۔ مگر پیاری رحمدل ماریا گاوریلوونا! زندگی میں صرف ایک خوش فہمی میرے لئے تسکین کا باعث ہوسکتی ہے، اس سے مجھے محروم نہ کرو، مجھے اس خوش فہمی سے نہ نکالو کہ شاید تم میری خوشی کی خاطر میری بات مان جاتیں اگر... ذرا خاموشی سے میری بات سنو۔ میں التجا کرتا ہوں کہ ذرا خاموش رہو۔ اف، مجھے کس قدر اذیت ہو رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ تم میری ہوتیں۔ لیکن... میں بڑا بدقسمت ہوں کیونکہ میری شادی ہو چکی ہے! ،،

ماریا گاوریلوونا حیرت سے اسے تکتی رہ گئی۔

''میری شادی ہوچکی ہے،، اس نے اپنی بات جاری رکھی ''میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں، لیکن مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ میری بیوی کون ہے اور کہاں ہے؟ نہ معلوم میری قسمت میں اس سے کبھی مجھے ملنا ہے بھی کہ نہیں۔ ،،

''کیا مطلب؟ ،، ماریا گاوریلوونانے تعجب سے پوچھا۔
''عجیب بات ہے۔ پوری بات بتاؤ، میں بھی پھر قصہ سناؤنگی، مگر تم خدارا بتاؤ پھر کیا ہوا۔ ،،

''۱۸۱۲ء کے شروع کی بات ہے،، برمن نے کہا ''میں جلدی میں ولنا جا رہا تھا جہاں ہمارا فوجی دستہ ٹھیرا تھا۔ اس دفعہ میں رات کو ایک چوکی پر پہونچا۔ میں نے حکم دیا کہ فوراً گھوڑے جوتے جائیں لیکن اسی وقت طوفانی ہوا چلنا شروع ہوگئی۔ داروغہ اور کوچوان دونوں نے مجھے انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے ان کی بات تو مان لی، پر ایک عجیب سی بیچینی مجھ پر طاری ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے کوئی ڈھکیل رہا

ہے۔ اس عرصہ میں طوفان کسی طرح کم نہ ہوا، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے پھر گھوڑے جوتنے کا حکم دیا اور طوفان ہی میں چل کھڑا ہوا۔ کوچوان کو دریا کے برابر چلنے کی سوجھی کیونکہ اس طرح راستہ تین کوس کم ہو جاتا تھا۔ دریا کے کگار گر گئے تھے اور کوچوان اس جگہ سے آگے نکل گیا جہاں مڑ کر راستہ پر آنا تھا۔ اس طرح ہم نامعلوم علاقہ میں پھونچ گئے۔ طوفان تھا کہ کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا، میں نے دور سے روشنی دیکھی اور ادھر ہی چلنے کا حکم دیا۔ ہم گاؤں میں پھونچ گئے۔ لکڑی کے گرجا میں روشنی تھی۔ گرجا کھلا ہوا تھا اور منڈیر کے پاس کچھ برف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ برساتی میں لوگ گھوم رہے تھے۔ ”ادھر آؤ! ادھر آؤ!“ کچھ لوگ چلانے لگے۔ میں نے کوچوان سے ادھر چلنے کو کہا۔ ”کمال ہے، تم نے اتنی دیر کہاں لگائی؟“ کسی نے مجھ سے کہا۔ ”دلہن بیہوش ہے، پادری کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے، ہم تو واپس جانے کی سوچ رہے تھے۔ چلو اتر بھی چکو۔“ میں خاموشی سے گاڑی سے نیچے کود پڑا اور گرجا میں داخل ہوا جہاں دو تین موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی۔ گرجے کے ایک تاریک کونے میں لڑکی ایک بنچ پر بیٹھی تھی، کوئی دوسری اس کی کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔ ”چلو شکر ہے“ یہ دوسری بولی ”آپ پھونچ تو گئے۔ بی بی کو تو آپ نے مار ہی ڈالا تھا۔“ بوڑھے پادری نے میرے پاس آ کر پوچھا ”کیا شروع کرنے کا حکم ہے؟“ ”شروع کیجئے، شروع کیجئے فادر“ میں نے کھوئے ہوئے جواب دیا۔ لڑکی کو اٹھایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صورت شکل کی بری نہیں... عجیب سی ناقابل معافی شرارت مجھے سوجھی... میں اس کے برابر آلٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پادری جلدی میں تھا، تین مرد اور خادمہ لڑکی کو پکڑے تھے اور صرف اسی کی طرف متوجہ تھے۔ ہمارا نکاح کردیا گیا۔ ”پیار کرو“ ہمیں حکم ملا۔ میری بیوی نے اپنا زرد چہرہ میری طرف پھیرا۔ میں اسے چومنے ہی والا تھا کہ وہ چلا اٹھی ”ارے، یہ وہ نہیں ہے،

وہ نہیں ہے!،، اور بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ گواہوں نے مجھ کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں مڑا اور گرجے سے باہر آیا، کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔ جلدی سے میں گاڑی میں بیٹھا اور چلایا — ”چلاؤ!،،

”او خدایا!،، ماریا گاوریلوونا چلا اٹھی۔ ”اور تمہیں یہ تک معلوم نہیں کہ تمہاری بدنصیب بیوی پر کیا گذری؟،،

”نہیں مجھے تو اس گاؤں کا نام تک معلوم نہیں جہاں میری شادی ہوئی تھی اور نہ یہ یاد ہے کہ میں کس چوکی سے آیا تھا۔ اس وقت اس پورے واقعہ کو میں نے اتنی کم اہمیت دی کہ گرجا سے نکلتے ہی مجھے نیند آگئی۔ اور اگلے دن صبح میں تین چوکیوں تک سوتا رہا۔ میرے ساتھ جو نوکر تھا لڑائی میں کام آگیا۔ اب مجھے قطعاً امید نہیں کہ میں اس لڑکی کا پتہ چلا سکوں، جس کے ساتھ میں نے اس قدر بے رحمی سے مذاق کیا تھا۔،،

”خدایا،، ماریا گاوریلوونا نے اس کی آستین پکڑ کر کہا۔ ”وہ تم تھے؟ اور تم نے مجھے پہچانا نہیں؟،،

برمن کا رنگ فق ہو گیا اور وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔

تابوت ساز

” یہ جو ہر طرف تابوت نظر آتے ہیں گویا ہمارے عالم پیری کے سفید بال ہیں “

درژاوین

تابوتساز آدریان پروخوروف کے گھر کا سارا ساز و سامان جنازہ لے جانے والی گاڑی پر لد چکا تھا۔ مریل گھوڑے چوتھی دفعہ بسمانیا سڑک سے نکتسکایا سڑک کی طرف چلے جہاں اس نے نیا مکان خریدا تھا۔ اس نے دکان مقفل کرکے باہر دروازہ پر اس اعلان کی تختی لٹکا دی کہ گھر کرایہ یا فروخت کے لئے خالی ہے اور خود پیدل اپنے نئے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس مکان کی اسے مدت سے آرزو تھی اور اس نے بھاری رقم ادا کرکے اسے خریدا تھا۔ مگرجب وہ نئے گھر کی پیلی دیواروں کے قریب پہونچا تو اسے یہ محسوس کرکے بہت تعجب ہوا کہ اس کے دل میں ذرا خوشی نہ تھی۔ نئے گھر کی اجنبی دہلیز سے گذر کر اس نے دیکھا کہ سارا سامان ابھی تک گڈمڈ پڑا ہے۔ اس وقت اسے اپنا پرانا ٹوٹا پھوٹا مکان یاد آیا جہاں وہ اٹھارہ سال تک رہا تھا، جہاں ہر چیز قرینے سے لگی رہتی تھی۔ اس نے اپنی نوکرانی اور دونوں لڑکیوں کو ان کی سستی پر ڈانٹ بتائی اور خود گھر کی درستگی میں ان کی مدد کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہر چیز قاعدے سے رکھدی گئی۔ مقدس شبیہیں،

چینی کے برتنوں کی الماری، میز، صوفہ اور پلنگ پچھلے کمرے میں ترتیب سے لگا دئے گئے۔ آدریان پروخوروف کے کام کا سامان یعنی مختلف قسم، مختلف رنگوں اور مختلف پیمائش کے تابوت، ماتمی لباس، ماتمی عبائیں اور دستاریں اور مشعلوں سے بھری ہوئی الماریاں باورچی خانے اور دالان میں رکھ دی گئیں۔ باہر کے دروازے پر سائن بورڈ لٹکا دیا گیا جس پر ایک موٹے سے کیوپڈ کی تصویر بنی تھی جس کے ہاتھ میں ایک الٹی مشعل تھی، نیچے لکھا تھا کہ ”سادے اور رنگین تابوت یہاں بنائے جاتے ھیں، نیز کرایہ پرھر وقت مہیا کئے جا سکتے ھیں، پرانے تابوتوں کی مرمت کا بھی انتظام ھے۔“ اس کی بیٹیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں، نئے گھر کا معائنہ کرنے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور سماوار گرم کرنے کا حکم دیا۔

ھمارے پڑھے لکھے قارئین واقف ھیں کہ شیکسپئیر اور سر والٹر اسکاٹ نے اپنی تصانیف میں گورکنوں کو بڑا خوش طبع اور زندہ دل دکھایا ھے تاکہ اس طرح کے تضاد سے وہ ھمارے ذھن پر گہرا اثر چھوڑ سکیں۔ مگر ھمیں سچائی زیادہ عزیز ھے اسلئے ھم ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہنا پڑیگا کہ ھمارے تابوت ساز کی طبیعت اس کے منحوس پیشے کےلئے بالکل مناسب تھی۔ آدریان پروخوروف بہت خاموش اور افسردہ مزاج آدمی تھا۔ اس کی چپ صرف دو موقعوں پر ٹوٹتی تھی: ایک جب اسے اپنی بیٹیاں کھڑکی میں سے تاک جھانک کرتی نظر آتیں تو انہیں ڈانٹنے پھٹکارنے کو اس کی زبان کھل جاتی اور یا جب اسے کسی بدنصیب (یا خوش نصیب) گاھک سے اپنی محنت کی زیادہ سے زیادہ اجرت وصول کرنی ھوتی۔ اس وقت بھی حسب معمول آدریان گم سم کھڑکی کے پاس بیٹھا چائے کی ساتویں پیالی پی رھا تھا اور اپنے افسردہ خیالات میں کھویا ھوا تھا۔ اسے وہ موسلادھار بارش یاد آئی جو پچھلے ھفتہ ریٹائرڈشدہ بریگیڈیر کا جنازہ عین قبرستان میں پہونچتے ھی ھوئی تھی۔ پانی پڑنے سے نہ جانے کتنی عبائیں سکڑ گئی ھونگیں، ٹوپیوں کے پٹے تڑمڑ گئے ھونگے۔ اس کے ھاں کا سامان بہت پرانا

اور خستہ حالت میں تھا ۔ اس لئے اسے ڈر تھا کہ چیزوں کو ٹھیک کرانے میں کافی روپیہ خرچ ہو جائیگا ۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ نقصان سوداگر کی بوڑھی بیوہ تریوخینا کی تجہیز و تکفین سے پورا ہو جائیگا جو پچھلے سال سے گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ وہ محلہ رازگلیائی میں رھتی تھی جو وھاں سے کافی دور تھا ۔ پروخوروف کو ڈر تھا کہ اس کے وارث وعدہ کرنے کے باوجود وقت پر اسے بھول جائینگے اور کسی پاس کے تابوت ساز سے معاملہ کرلینگے ۔

وہ اسی سوچ میں پڑا تھا کہ باھر کے دروازے پر کسی نے تین بار کمزور دستک دی ۔ ” کون ھے؟ “ آدریان نے چلا کر پوچھا ۔ دروازہ کھلا اور ایک آدمی جو کوئی جرمن کاریگر معلوم ھوتا تھا کمرے میں داخل ھوا اور بشاش لہجے میں آدریان سے کہنے لگا ” معاف کرنا ھمسائے “ اس نے ٹوٹی پھوٹی روسی میں کہا جسے سن کر کوئی ھنسے بنا نہیں رہ سکتا ۔ ” اگر میری وجہ سے تمہارے کام میں ھرج ھوا تو معاف کرنا، مگر میں کئی دن سے تم سے ملنا چاہ رھا تھا ۔ میں موچی کا کام کرتا ھوں، میرا نام گوٹلب شلٹز ھے۔ تمہاری کھڑکی میں سے جو چھوٹا سا گھر نظر آتا ھے نا، میں اسی میں رھتا ھوں ۔ کل میری شادی کی پچیسویں سالگرہ ھے، میں چاھتا ھوں کہ تم اور تمہاری لڑکیاں آکر ھمارے ھاں کھانا کھائیں ۔ “ یہ دعوت بڑی خوشی سے قبول کر لی گئی ۔ آدریان نے موچی سے بیٹھنے اور چائے پینے کو کہا اور کچھ ھی دیر میں گوٹلب شلٹز کی سادہ اور پر خلوص طبیعت کی وجہ سے دونوں گھل مل کر باتیں کرنے لگے ۔ آدریان نے پوچھا ” سناؤ تمہارے کاروبار کا کیا حال ھے؟ “ ” شکر ھے چل رھا ھے “ شلٹز نے جواب دیا ” اونچ نیچ تو ھمارے ھاں بھی ھوتی ھی رھتی ھے مگر اس کی شکایت کیا؟ میرا کام تمہاری طرح کا نہیں ھے کیونکہ زندہ آدمی بغیر جوتوں کے گذارہ کر سکتا ھے مگر مردہ بغیر تابوت کے نہیں رہ سکتا ۔ “ ” بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک “ آدریان نے اتفاق

کرتے ہوئے کہا ''مگر ساتھ ساتھ یہ بھی تو ہے کہ زندہ آدمی کے پاس جوتے خریدنے کو دام نہ ہوں تو وہ ننگے پاؤں پھر لیگا تمہارا نقصان نہیں کریگا۔ مگر مردہ بھک منگوں کو مفت تابوت دینا پڑتا ہے۔،، کچھ دیر تک یوں ھی بات چیت چلتی رھی۔ آخر موچی اٹھا اور جانے کی اجازت چاھی، چلتے چلتے ایک دفعہ پھر اپنے ھاں آنے پر اصرار کیا۔

اگلے دن عین دو پہر کے وقت آدریان اور اس کی بیٹیاں اپنے نئے گھر سے پڑوسی کے گھر چلیں۔ میں آج کل کے ناول نگاروں کی طرح آدریان پروخوروف کی روسی کفتان اور اس کی بیٹیوں اکولینا اور داریا کے یورپین لباسوں کا بہ‌تفصیل تذکرہ نہیں کرونگا۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ دونوں خواتین پیلے رنگ کی ٹوپیاں اور سرخ سلیپر پہنے ہوئے تھیں جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنتی تھیں۔

موچی کا ننھا سا کمرہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ان میں زیادہ تر جرمن اھل حرفہ، ان کی بیویاں اور ان کے شاگرد شامل تھے۔ صرف پولیس کانسٹبل یورکو روسی تھا۔ گو اس کا عہدہ بہت معمولی تھا مگر میزبان کی اس پر نظر عنایت تھی۔ پچیس سال تک وہ پوگوریلسکی کے مشہور ڈاکیہ کی طرح اپنے فرائض کی انجام دھی کرتا رھا تھا۔ مگر ١٨١٢ء میں جب آگ نے ماسکو کے قدیم دارالحکومت کو جلاکر تہس نہس کر دیا تو پولیس کانسٹبل کا زرد چوبی کمرہ بھی جل کر راکھ ھوگیا۔ مگر دشمن کے بھاگتے ھی اس کی جگہہ ایک نیا سنتری خانہ تعمیر ھوا جس پر خاکستری روغن ھوا تھا اور بھدے سفید ستون تھے۔ یورکو نے حسب سابق سر سے پاؤں تک مسلح ھو کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ نکتسکی دروازے کے آس پاس کی گلیوں میں بسنےوالے تقریباً سب جرمنوں سے وہ واقف تھا جن میں سے بعض کو کبھی کبھی اتوار کی رات اس کے پہرے خانے میں بسر کرنی پڑتی تھی۔ آدریان اس سے تعارف کرنے بڑھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر ایسے کانسٹبل صاحب کی مدد کی ضرورت ھوگی۔

جب مہمان میز پر بیٹھے تو دونوں ایک دوسرے کے پاس پاس تھے - شلٹز، اس کی بیوی اور ان کی سترہ سالہ لڑکی لوٹ خین مہمانوں کے ساتھ شریک طعام بھی تھے اور کھانا پیش کرنے میں نوکروں کی مدد بھی کر رہے تھے - بیر پانی کی طرح پی جا رہی تھی - یورکو نے چار آدمیوں کے برابر کھایا - آدریان بھی کچھ پیچھے نہ تھا، مگر اس کی بیٹیاں بڑے تکلف سے کھا رہی تھیں - گفتگو زیادہ‌تر جرمن زبان میں ہو رہی تھی - آوازیں بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں کہ اتنے میں میزبان نے سب کو اپنے طرف متوجہ کر کے ایک بوتل کھولی اور پھر بہ‌آواز بلند روسی میں کہا '' میری نیک شریک زندگی لوئیزا کا جام صحت! ،، ہلکے رنگ کی شامپین بوتل میں سے ابلنے لگی - میزبان نے اپنی ادھیڑ عمر شریک زندگی کے شگفتہ چہرے کو پیار کیا اور مہمان خوشی خوشی نیک لوئیزا کا جام صحت پینے لگے - میزبان نے دوسری بوتل کا کاگ اڑاتے ہوئے کہا '' اور یہ ہے میرے عزیز مہمانوں کا جام صحت! ،، مہمانوں نے شکریہ ادا کر کے گلاس پھر خالی کر دئے - اب کیا تھا پے درپے جام صحت پئے جانے لگے - پہلے ہر مہمان کا جام صحت پیا گیا - پھر ماسکو شہر کا، پھر جرمنی کے چھوٹے چھوٹے درجن بھر غیر معروف شہروں کا، پھر ہر قسم کے کاروبار کا، پھر ہر کاریگر اور اس کے شاگرد کا - آدریان نے نہایت ایمانداری سے ہر دفعہ گلاس خالی کیا - آخر میں وہ نشہ میں اتنا دھت ہو چکا تھا کہ ترنگ میں آکر اس نے بھی ایک جام صحت تجویز کیا جو سب نے خوشی خوشی پیا - اتنے میں ایک مہمان نان بائی نے اپنا گلاس اٹھا کر پرجوش لہجے میں کہا '' ان کا جام صحت جن کے لئے ہم کام کرتے ھیں یعنی ھمارے گاھکوں کے لئے! ،، یہ جام بھی اوروں کی طرح متفق طور پر جوش و خروش کے ساتھ پیا گیا - اب مہمانوں نے ایک دوسرے سے معانقہ شروع کیا - درزی نے موچی سے، موچی نے درزی سے اور نان بائی نے ان دونوں سے، اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا... ان باھمی معانقوں کے کے دوران یورکو نے تابوت ساز سے کہا '' پڑوسی! تم

اپنے مردوں کا جام صحت پئیو نا؟ ،، اس پر سب ہنس پڑے سوائے تابوت‌ساز کے جس‌نے غصے سے بھوئیں سکیڑ لیں - مگر سب پینے پلانے میں اتنے مشغول تھے کہ کسی نے اس کی اس حرکت پر توجہ نہ دی - جب سب رخصت ہونے کےلئے اٹھے تو گرجا سے شام کے گھنٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں -

مہمانوں کے رخصت ہوتے ہوتے کافی دیر ہو گئی - سب نشے میں دھت تھے - موٹے نان‌بائی اور ایک جلدساز نے جس کا چہرہ سرخ مراکو چمڑے میں مجلد معلوم ہوتا تھا کانسٹبل کو بغلوں میں ہاتھ دےکر اس کے ٹھکانے تک پہونچا دیا - اور اس طرح یہ روسی کہاوت پوری کر دکھائی کہ ” قرض کی ادائیگی نعمت ہے ،، - تابوت‌ساز گھر پہونچا تو ناراض اور جھنجلایا ہوا تھا - ” آخر یہ کیا بات ہے،، اس نے بہ‌آواز بلند سوچتے ہوئے کہا ” کہ اور سب پیشے تو قابل عزت ہیں، میرا پیشہ کس بات میں گھٹیا ہے؟ کیا تابوت‌ساز جلاد کا بھائی‌بند ہوتا ہے؟ آخر یہ غیرملکی احمق جرمن کس بات پر ہنس رہے تھے؟ کیا ان کے خیال میں تابوت‌ساز احمق یا مسخرہ ہے؟ اور میں... میں سوچ رہا تھا کہ اپنے نئے گھر کی خوشی میں جو دعوت کرونگا تو ان سب کو بلاؤنگا، مگر اب؟ اب نہیں... بس اب تو میں ان لوگوں کو بلاؤنگا جن کی میں خدمت کرتا ہوں - یعنی عیسائی لاشوں کو - ،، ” جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ،، اس کی نوکرانی نے اس کے جوتے اتارتے ہوئے کانپ کر کہا - ” ذرا آپ سوچئیے تو... خدا کے لئے اپنے پر صلیب کا نشان بنائیے - مردوں کو اپنے گھر دعوت پر بلائیےگا؟ اف خدایا میری توبہ! ،، ” ہاں تو کیا ہوا، خدا گواہ ہے میں ایسا ہی کرونگا ،، آدریان نے کہا ” اور کل ہی بلاؤنگا! اے میرے محسنوں کی روحو کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ اور جو کچھ روکھا سوکھا میرے پاس ہے اس میں شریک ہوکر میری عزت بڑھاؤ - ،، یہ کہہ کر تابوت ساز اپنے پلنگ پر لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا -

صبح کا اندھیرا پوری طرح غائب نہ ہوا تھا کہ آدریان کو اٹھنا پڑا۔ تاجر کی مالدار بیوہ تریوخینا کا انتقال رات کو ہو گیا تھا۔ اس کے مختار خاص کے پاس سے ایک آدمی یہ خبر لیکر گھوڑے پر آدریان کے پاس آیا۔ تابوت‌ساز نے اسے دس کوپک ووڈکا پینے کے لئے انعام دئے اور خود عجلت کے ساتھ کپڑے تبدیل کرکے ایک گھوڑا گاڑی میں سوار ہوکر رازگلیائی میں پہونچا۔ متوفی خاتون کے دروازے پر پولیس کا پہرہ تھا۔ تاجر گدھوں کی طرح منڈلاتے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ میت میز پر رکھی تھی۔ بے‌جان مومی چہرے کے نقش و نگار ابھی تک بگڑے نہ تھے۔ رشتہ‌دار، پڑوسی اور نوکر چاکر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اندر مومی شمعیں جل رہی تھیں اور پادری دعائیں پڑھ رہے تھے۔

آدریان متوفیہ کے بھتیجے کے پاس گیا جو نہایت فیشن‌ایبل کوٹ میں ملبوس ایک نوجوان تاجر تھا۔ آدریان نے جا کر کہا کہ تابوت، شمعیں، تابوت بردار اور جنازے کے ساتھ کی اور ضروری چیزیں جلد از جلد اچھی حالت میں مہیا کر دی جائینگی۔ وارث نے بے‌خیالی کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ مول‌تول کرنا نہیں چاہتا ہر بات اس کے ایمان پر چھوڑتا ہے۔ تابوت‌ساز نے حسب عادت قسم کھا کر کہا کہ وہ ایک کوپک زیادہ لینا بھی حرام سمجھتا ہے۔ اس کے بعد اس نے مختار خاص سے نظروں ھی نظروں میں کچھ طے کیا اور اپنے گھر آ کر تیاری میں مصروف ہو گیا۔ سارے دن وہ نکتسکی دروازے سے رازگلیائی تک پھیرے کرتا رہا اور شام تک ہر چیز قاعدے کے مطابق وھاں پہونچ گئی۔ اور وہ کوچوان کو چھٹی دے کر اپنے گھر پیدل روانہ ھوا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ تابوت‌ساز بخیریت نکتسکی دروازے تک پہونچ گیا۔ جب وہ شہیدوں کے گرجا کے پاس سے گذرا تو ھمارے دوست یورکو نے ڈپٹ کر پوچھا ”کون ھے؟“ مگر پھر تابوت‌ساز کو پہچان کر اس نے اسے شب بخیر کہا۔ رات زیادہ گزر چکی

تھی۔ آدریان گھر کے قریب پہونچا تو اسے ایسا لگا کہ کوئی چپکے سے اس کے دروازے میں غائب ہو گیا۔ ”اس کا کیا مطلب؟“ آدریان سخت حیران تھا۔ ”اس وقت کس کو میری ضرورت ہو سکتی ہے؟ کیا خبر کوئی چور ڈاکو ہو؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی میری احمق لڑکیوں کے پاس رات گزارنے آیا ہو؟“ اسے فوراً اپنے دوست یورکو کو مدد کے لئے بلانے کا خیال آیا۔ اتنے میں ایک آدمی دروازے کے پاس پہونچا اور اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ اس کی نظر آدریان پر پڑی جو تیزی سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ٹھہر گیا، اس نے اپنی وردی کی ٹوپی سلام کے طور پر اٹھائی۔ آدریان کو اس کا چہرہ کچھ دیکھا دیکھا معلوم ہوا۔ ”آپ کو کیا مجھ سے ملنا ہے؟“ اس نے تقریباً ہانپتے ہوئے سوال کیا۔ ”اندر تشریف لائیے۔“ ”تکلف کی ضرورت نہیں صاحب“ اجنبی نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا ”آپ پہلے تشریف لے چلئے اور اپنے مہمانوں کو راستہ دکھائیے۔“ آدریان کو گھر پہونچنے کی اتنی جلدی تھی کہ اسے خود ہی تکلف گوارا نہ تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ گھر کی سیڑھیوں تک پہونچ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے دوسرا بھی۔ آدریان کو لگا کہ اس کے گھر میں کچھ لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ ”لعنت خدا کی، آخر یہ بات کیا ہے؟“ اس نے تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی سوچا اور... اس کے گھٹنے جواب دے گئے جب اس نے دیکھا کہ سارا کمرہ لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چاندنی ان کے سرد اور نیلگوں چہروں، دھنسے ہوئے دھانوں، دھندلی نیم‌وا آنکھوں، اور ستی ہوئی ناکوں پر پڑ رہی تھی۔ آدریان نے خوف‌زدہ نگاھوں سے ان لوگوں کو پہچانا جن کے کفن دفن میں اس نے مدد کی تھی۔ اس کے پیچھے آنےوالا وھی فوجی افسر تھا جو پچھلے ہفتے موسلادھار بارش میں دفن ہوا تھا۔ سب مرد اور عورتیں اس کے چاروں طرف جمع ہوگئے اور اسے سلام اور مبارکباد پیش کرنے لگے۔ سوائے ایک

غریب کے جو چند ہی دن ہوئے مفت دفنایا گیا تھا۔ اسے قریب آنے کی جرأت نہ ہوئی، وہ کمرے کے کونے میں ایسی عاجزی سے کھڑا تھا جیسے اسے اپنے چیتھڑوں پر شرم آ رہی ہو۔ سوائے اس کے سبھی کے لباس ڈھنگ کے تھے۔ خواتین ربن والی ٹوپیاں پہنے تھیں، فوجی افسر اپنی کرم خوردہ یونیفارم میں تھے۔ سب کی حجامتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ تاجر نہایت بڑھیا لباس میں تھے۔ فوجی افسرنے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا ”پروخوروف! ہم سب لوگ تمہارے بلاوے پر اٹھ کر آئے ہیں۔ صرف وہ جو بالکل خاک در خاک ہو چکے تھے یا وہ جو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے اور اٹھنے سے معذور ہیں نہیں آ سکے، مگر ان میں سے بھی ایک آنے کا اتنا خواہش‌مند تھا کہ نہ رک سکا ...“ اس پر ایک چھوٹا سا ڈھانچہ مجمع میں گھس کر راہ بناتا ہوا آدریان کی طرف آیا۔ اس کے بےرونق چہرے پر محبت بھری خوفناک مسکراہٹ تھی۔ شوخ سبز اور سرخ رنگ کے کپڑے کی دھجیاں اس کے چاروں طرف اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے وہ کوئی کھمبا ہو۔ ٹانگوں کی ہڈیاں اس طرح کھڑکھڑا رہی تھیں جیسے ہاون میں موسلی۔ ”ارے پروخوروف! کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟“ ڈھانچے نے کہا۔ ”کیا تم ریٹائرڈ سارجنٹ پیوتر پتروو‌چ کریل‌کن کو بھول گئے جس کے لئے تم نے پہلا تابوت بیچا تھا (جو تھا تو صنوبر کی لکڑی کا مگر تم نے بلوط کا کہکر بیچا) ۱۷۹۹ء میں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ڈھانچے نے اپنے بازو بغل گیر ہونے کے لئے بڑھائے۔ آدریان نے پوری طاقت سے چیخ ماری اور اسے دھکا دے کر اپنے سے پرے کر دیا۔ پیوتر پتروو‌چ جھوما اور زمین پر ہڈیوں کا ڈھیر بنکر آ رہا۔ لاشوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سب اپنے ساتھی کی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے، کوسنے اور دھمکیاں دیتے ہوئے آدریان کی طرف بڑھے۔ بدقسمت میزبان ان کی چیخوں سے تقریباً بہرا اور ان کے حملے سے اتنا بدحواس ہوا کہ بےہوش ہوکر مرحوم سارجنٹ کی ہڈیوں کے ڈھیر پر گر پڑا۔

سورج کی شعاعیں تابوت‌ساز کے پلنگ پر پڑ رہی تھیں ۔ گرمی سے اس نے آنکھیں کھولیں تو خادمہ کو سماوار میں انگارے سلگانے میں مصروف پایا ۔ آدریان کو گذشتہ رات کے خوفناک واقعات یاد آئے ۔ تریوخینا، فوجی افسر اور سارجنٹ کریل کن، ابھی تک اس کے تخیل میں دھندلے دھندلے سایوں کی طرح منڈلا رہے تھے ۔ پہلے تو وہ چپ‌چاپ انتظار کرتا رہا کہ شائد ملازمہ خود ہی بات چھیڑے اور رات کے واقعہ کا انجام بتائے ۔

" آدریان پروخوروچ، آج آپ بہت دیر تک سوتے رہے " اکسینیا نے اسے لباس دیتے ہوئے کہا ۔ " ہمارا پڑوسی درزی آپ سے ملنے آیا تھا اور پولیس کانسٹبل یہ بتانے کہ آج پولیس انسپکٹر صاحب کی سالگرہ ہے۔ مگر آپ تو ایسے بےخبر سو رہے تھے کہ ہمارا جی نہ چاہا کہ آپ کی نیند خراب کریں ۔ "

" مرحومہ تریوخینا کے ہاں سے تو کوئی نہیں آیا؟ "

" مرحومہ؟ یعنی کیا... کیا وہ مر گئیں؟ "

" تم بھی کتنی احمق ہو۔ کیا کل تم نے ان کے کفن دفن کا سامان تیار کرنے میں میرا ہاتھ نہیں بٹایا تھا؟ "

" آپ کا دماغ درست ہے جناب؟ یا ابھی تک رات کی شراب کا خمار باقی ہے؟ کل کس کا کفن دفن ہوا تھا؟ سارے دن تو آپ جرمن کے ہاں دعوت میں رہے۔ رات کو بالکل مدھوش واپس آئے ۔ اور آتے ہی ایسے بے سدھ پلنگ پر پڑ گئے کہ اب جاگے ہیں ۔ گرجا کے گھنٹے بھی بج بج کر بند ہو گئے ۔ "

" اچھا؟ سچ مچ؟ " تابوت‌ساز نے اطمینان کی سانس لے کر کہا ۔

" سچ مچ نہیں تو کیا؟ " ملازمہ نے جواب دیا ۔

" اگر ایسا ہے تو لاؤ چائے جلدی سے، اور میری بیٹیوں کو بھی بلا لو ۔ "

گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ

”وہ ایک معمولی درجہ کا کلرک تھا
پر اپنی گھوڑوں کی چوکی کا مطلق العنان
فرماں روا۔“
شہزادہ ویازیمسکی

مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائیں، جسے کبھی نہ کبھی کسی گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کو گالیاں کوسنے دینے یا اس سے تو تو میں میں کرنے کا واقعہ نہ پیش آیا ہو یا کوئی ایسا جس نے غصے سے بےقابو ہوکر رجسٹر طلب نہ کیا ہو تاکہ وہ اس کے خلاف بدتمیزی، گستاخی اور بدانتظامی کی شکایت لکھ سکے۔ کون ہے جو داروغہ کو انسانی شکل میں شیطان، معزول سرکاری افسروں کی طرح ناقابل اصلاح اور کچھ نہیں تو مورم جنگل میں رہنےوالے ڈاکوؤں سے کم سمجھتا ہو۔ مگر ہم انصاف کرنے کی کوشش کرینگے، ہم اپنے کو اس کی جگہ رکھ کر دیکھینگے اور اس طرح ممکن ہے کہ ہم اس کو زیادہ نرمی کے ساتھ جانچ سکیں۔ ایک گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ ہوتا ہی کیا ہے؟ وہ چھوٹے موٹے افسروں کے سامنے ایک نہایت ہی مظلوم اور حقیر ہستی ہے جو مکے اور لاتیں کھانے سے صرف اسلئے بچ جاتا ہے کہ وہ سرکاری عہدہ‌دار ہے، مگر ایسا بھی ہمیشہ نہیں ہوتا (پڑھنےوالے خود ہی ایمان سے کہہ دیں)۔ اس بیچارے جابر فرمانروا کی

حیثیت کیا ھے؟ (شہزادے ویازیمسکی نے ایک جگہہ مذاق میں گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کو مطلق العنان فرمانروا کے لقب سے یاد کیا ھے۔) کیا اس کا کام انتہائی مشکل نہیں ھے؟ نہ دن کو چین ھے نہ رات کو آرام۔ مسافر راستے بھر کی کوفت اور تھکن کا سارا غصہ بےچارے داروغہ پر اتارتے ھیں۔ موسم انتہائی خراب ھے، سڑکیں ناقابل برداشت ھیں، کوچوان سرکش ھے، گھوڑے سست رفتار ھیں۔ مگر ان سب کا ذمہ‌دار ھے تو بےچارہ داروغہ۔ مسافر جب اس کے غریبامئو مکان میں داخل ھوتا ھے تو شروع ھی سے اسے اپنا دشمن سمجھ کر بات کرتا ھے، اور وہ بڑی خوش نصیب گھڑی ھوتی ھے جب داروغہ اس بن‌بلائے مہمان سے چھٹکارا پاتا ھے۔ اور اگر اسی وقت گھوڑے نہ ھوئے تو؟ بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ کیا کیا گالیاں اور دھمکیاں سننی پڑتی ھیں۔ بارش اور کیچڑ میں گھر گھر مارا مارا پھرتا ھے۔ بارش کے دوران، جنوری کی ٹھٹھرا دینے والی سردی میں سرائے کے باھر برساتی میں جا کھڑا ھوتا ھے تاکہ اسی طرح جھلائے ھوئے مسافر کے دھکوں اور ڈانٹ سے بچ سکے۔ یا مثلاً کبھی کوئی جرنیل صاحب تشریف لائے اور غریب داروغہ نے مارے ڈرکے کانپتے ھوئے دونوں تین گھوڑوں کی گاڑیاں انہیں دیدیں، جن میں سے ایک گاڑی ڈاک کےلئے تھی۔ جرنیل صاحب تو شکریہ ادا کئے بغیر روانہ ھوگئے، پانچ منٹ بعد گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ اور ایک افسر نے اندر داخل ھوکر سرکاری حکم‌نامہ میز پر پٹخ دیا جس میں ڈاک کےلئے تازہ دم گھوڑوں کے مہیا کرنےکا مطالبہ ھے۔ ان سب حالات پر غور کیجئے اور آپ کا دل بجائے غصے کے پرخلوص ھمدردی سے بھر جائیگا۔ اس موضوع پر چند جملے اور سن لیجئے۔ میں تقریباً بیس سال تک روس کے کونے کونے میں پھرا ھوں۔ ڈاک گاڑی کے تقریباً سب راستوں سے واقف ھوں، کوچوانوں کی کئی نسلوں کو جانتا ھوں۔ شاید ھی ایسا کوئی داروغہ ھو جسے میں نہ جانتا ھوں اور جس سے میرا واسطہ نہ پڑا ھو۔ میرا ارادہ اپنے سفر کے

دلچسپ مشاھدات کے متعلق کتاب چھپوانے کا ھے۔ مگر فی الحال اتنا کہنا کافی ھوگا کہ داروغہ لوگوں کے متعلق بہت ھی غلط سلط باتیں عام لوگوں کو بتائی گئی ھیں اور یہ بےچارے مفت میں بدنام ھیں۔ وہ عام طور پر نہایت صلح پسند، ملنسار اور ضرورت سے زیادہ خاکسار ھوتے ھیں۔ ان میں نہ لالچ ھوتا ھے، نہ اپنا حق زبردستی منوانے کی عادت ھوتی ھے۔ ان کی گفتگو سے بہت سی مفید اور دلچسپ اطلاعات فراھم کی جا سکتی ھیں جن کو عام طور پر مسافر قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور یہ ان کی بڑی غلطی ھے۔ مجھے تو ان کی گفتگو تھرڈ کلاس سرکاری افسروں کی بات چیت سے کہیں بہتر معلوم ھوتی ھے۔

آپ کو اندازہ ھوگیا ھوگا کہ اس معزز پیشے میں میرے بہت سے دوست ھیں۔ ان میں سے ایک کی یاد مجھے بہت ھی عزیز ھے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کو اس وقت اسی کی کہانی سنانا چاھتا ھوں۔

مئی ١٨١٦ء میں مجھے صوبہ ”خ“ میں ایسے راستے سے سفر کرنے کا اتفاق ھوا جو اب مدت سے غیر مستعمل ھے۔ اس زمانے میں میری حیثیت ایک ادنی سرکاری افسر کی تھی۔ مجھے ڈاک گاڑی سے سفر کرنا پڑتا تھا۔ اور میری حیثیت صرف دو گھوڑوں کی گاڑی میں سفر کرنے کی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر داروغہ مجھ سے توھین‌آمیز برتاؤ کرتے اور مجھے بزور اپنا حق منوانا پڑتا، کیونکہ میں اس زمانے میں نوجوان اور شوریدہ سر تھا۔ اگر کبھی کوئی داروغہ کسی بڑے افسر کو وہ گھوڑے دے دیتا جن پر میرا حق تھا تو مجھے اس کمینےپن اور چاپلوسی پر بہت ھی غصہ آتا۔ اسی طرح گورنر کی میز پر اگر کوئی گستاخ نوکر کھانا پیش کرتے ھوئے مجھے نظر انداز کرتا تو مجھے بہت ھی ناگوار گزرتا۔ اس قسم کے برتاؤ کا عادی ھونے میں مجھے کافی عرصہ لگا۔ آج مجھے یہ دونوں دستور بالکل مناسب بلکہ ایک حد تک ضروری معلوم ھوتے ھیں۔ بھلا آپ ھی بتائیے کہ اگر یہ قانون ھٹا دیا جائے کہ چھوٹے رتبے والے اعلی رتبے والوں کو جگہہ دیں اور اس

کے بجائے یہ ہونے لگے کہ ادنی دماغ والے اعلی دماغ والوں کو جگہہ دیں تو کس قدر گڑبڑ ہو۔ کیا کیا جھگڑے اٹھیں۔ نوکر پہلے کس کا کام کریں؟... مگر خیر مجھے ان باتوں سے کیا غرض، میں تو آپ کو ایک کہانی سنا رہا تھا۔

بڑا ہی گرم دن تھا۔ ”خ“ کے ڈاک اسٹیشن سے تقریباً تین کوس ادھر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی جو تھوڑی دیر میں موسلادھار میں تبدیل ہو گئی اور میں بالکل شرابور ہو گیا۔ اسٹیشن پر پہونچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ جلدی جلدی کپڑے بدلے، اور پھر دل چاہا کہ کاش ایک پیالہ گرم چائے میسر آ سکتی۔ داروغہ نے آواز دی ”اے دونیا! سماوار گرم کر جلدی سے اور جا کر کچھ بالائی بھی لے آ۔“ اس کے جواب میں درمیان کی دیوار کے پیچھے سے ایک چودہ سالہ لڑکی نکلی اور برساتی کی طرف چلی گئی۔ میں اس کے حسن وجمال کو دیکھکر ھکابکا رہ گیا۔ ”کیاتمہاری لڑکی ہے؟“ ”ہاں“ داروغہ نے بڑی دلجمعی سے جواب دیا ”بڑی ہی تیز، سمجھدار، اور پھرتیلی ہے، بالکل اپنی مرحومہ ماں کی طرح۔“ اس نے سرکاری حکم‌نامے کی نقل کرنی شروع کر دی۔ میں وقت گزارنے کےلئے دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔ اس کا گھر غریبانہ مگر صاف ستھرا تھا۔ تصویریں ”شاہ‌خرچ بیٹے“ کی کہانی کے متعلق تھیں۔ پہلی تصویر میں ایک معزز بزرگ لمبی عبا اور شب خوابی کی ٹوپی پہنے ایک بےچین صورت نوجوان کو روپوں کی تھیلی اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت کررہا تھا۔ دوسری تصویر میں نوجوان جھوٹے دوستوں اور بےحیا عورتوں کے مجمع میں بیٹھا اپنی پونجی شراب اور جوے میں لٹا رہا تھا۔ تیسری تصویر میں نوجوان بیٹا چیتھڑے کپڑے اور پرانا ہیٹ پہنے سوروں کی گلہ‌بانی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے انتہائی افسوس اور شرمندگی ٹپکتی تھی۔ آخری تصویر میں اس کی واپسی دکھائی گئی تھی۔ نیک بزرگ ابھی تک عبا اور شب خوابی کی ٹوپی پہنے ہوئے ہے۔ وہ بیٹے کو

دیکھ کر دوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ بیٹا اس کے قدموں پر جھک جاتا ہے۔ پس منظر میں نوکر ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کر رہا ہے۔ اور بڑا بھائی اس سے جشن کی وجہ پوچھ رہا ہے۔ تصویروں کے نیچے مناسب شعر جرمن زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں پڑھا۔ ان تصویروں، گل مہندی کے پودوں، مسہری اور اس کے شوخ رنگ کے گل بوٹوں والے پردوں اور ادھر ادھر رکھی ہوئی چیزوں کی یاد آج بھی میرے دماغ میں ویسی ھی تازہ ہے۔ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے اس گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کی صورت ہے۔ پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا تندرست اور زندہ دل انسان۔ اس کے لمبے سبز کوٹ پر رنگ اڑے ہوئے ربن میں تین تمغے آویزاں تھے۔

میں نے کوچوان کو کرایہ دے کر رخصت ھی کیا تھا کہ دونیا سماوار لئے واپس آ گئی۔ اس شوخ نازنین کو اندازہ ھو گیا تھا کہ مجھ پر اس کے حسن کا کیا اثر ہوا ہے۔ اس نے اپنی حسین نیلگوں آنکھیں بناوٹی شرم سے جھکا لیں۔ مگر جب میں‌نے اس سے بات کی تو اس نے بغیر گھبرائے ہوئے ایسی لڑکی کی طرح جواب دیا جو دنیا دیکھ چکی ھو۔ میں نے اس کے باپ کو شراب کا گلاس پیش کیا اور اسے چائے کی پیالی۔ تھوڑی دیر میں ھم تینوں اس طرح باتیں کرنے لگے گویا برسوں کی جان پہچان ھو۔

اتنے میں گھوڑے تیار ھو گئے۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ داروغہ اور اس کی بیٹی کو چھوڑ کر جاؤں مگر مجبور تھا۔ آخر بادل ناخواستہ ان سے اجازت چاھی۔ باپ نے خدا حافظ کہا۔ بیٹی باھر گاڑی تک میرے ساتھ آئی۔ میں نے برساتی میں جا کر اسے پیار کرنا چاھا، وہ راضی ھو گئی۔ جب سے میں نے پیارومحبت کا سلسلہ شروع کیا مجھے ایسے ان گنت بوسے یاد ھیں۔ مگر ان میں سے کسی میں مجھے اتنا لطف نہ آیا تھا، نہ کسی نے میرے حافظے پر ایسی دل نواز یاد چھوڑی تھی۔

برسوں گزر گئے، ایک بار پھر میرا اسی راستے سے گذار ہوا۔ مجھے داروغہ کی لڑکی یاد تھی۔ اس سے دوبارہ ملنے کا خیال بڑا خوش آئند تھا۔ پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ کون جانے داروغہ اب کہاں ہو؟ کیا خبر اسے نوکری سے ہٹا دیا گیا ہو؟ کیا پتہ دونیا کی شادی ہو چکی ہو۔ نہ جانے دونوں زندہ بھی ہیں یا نہیں؟ اور اس خیال سے میرا دل غمگین ہو گیا، یہی سوچتا ہوا میں ''خ'' کی چوکی تک پہونچا۔

میری گاڑی گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کے چھوٹے سے مکان کے سامنے رکی۔ کمرے میں گھستے ہی میں نے دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو پہچان لیا۔ وہی ''شاہ خرچ بیٹے'' کی کہانی کے متعلق تھیں۔ پلنگ اور میز پرانی جگہہ پر تھے۔ مگر کھڑکی کے چھجے پر پھول نہیں تھے۔ کمرے کی ہر چیز سے غفلت اور بوسیدگی ٹپک رہی تھی۔ گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ ایک طرف بھیڑ کی کھال کا کوٹ اوڑھے سو رہا تھا۔ میرے آنے پر وہ جاگ اٹھا۔ تھا تو وہ سمسون ویرن ہی مگر افوہ کس قدر معمر ہو چکا تھا! اس نے میرے حکم نامے کی نقل کرنی شروع کی تو میں نے دیکھا کہ اس کے سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی بڑھے ہوئے چہرے پر گہری لکیریں پڑ چکی تھیں۔ شانے جھک گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ تین چار سال کے عرصہ میں یہ تندرست و توانا شخص کس طرح اس قدر کمزور اور معمر ہو گیا۔ ''ارے تم نے مجھے پہچانا بھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں تمہارا پرانا دوست ہوں۔'' ''ہاں ہونگے'' اس نے بیدلی سے جواب دیا ''اس راستے سے بہت مسافر گزرتے ہیں۔'' ''اب تمہاری بیٹی دونیا کا کیا حال ہے؟'' میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بڑے میاں نے تیوری چڑھا کر جواب دیا ''خدا جانے۔'' میں نے پھر پوچھا ''تو کیا اس کی شادی ہو گئی؟'' بڑے میاں نے ایسا ظاہر کیا گویا انہوں نے میری بات سنی ہی نہیں اور اسی طرح دھیمی آواز میں حکم نامہ پڑھتے رہے۔ یہ

دیکھکر میں نے اور سوال کرنے مناسب نہ سمجھے اور کیتلی گرم کرنے کو کہا۔ میرا تجسس کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پنچ (شراب) کے ایک گلاس سے میرے بوڑھے دوست کی زبان کھل جائے گی۔

میرا اندازہ کچھ غلط نہ تھا۔ بڑے میاں نے شراب کا گلاس قبول کر لیا۔ اسے پیتے ھی ان کی افسردگی کم ہو گئی۔ دوسرے گلاس سے زبان بھی کھل گئی۔ اور انہوں نے مجھے پہچان بھی لیا یا کم سے کم ظاھر یہی کیا کہ انہیں میں یاد ھوں۔ ان کی زبانی میں نے جو کہانی سنی اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔

''تو آپ بھی میری دونیا کو جانتے تھے؟ ارے کون ایسا تھا جو اسے نہ جانتا ھو۔ وہ لڑکی تھی ھی ایسی۔ دونیا! دونیا! ھائے کیا لڑکی تھی! جو یہاں آتا اس کی تعریف کرتا ھوا جاتا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس نے کبھی اس کے خلاف کچھ کہا ھو۔ خواتین آتیں تو اسے تحفے تحائف دے جاتیں۔ سرکا قصابہ، کانوں کے بندے۔ امرا گذرتے تو اس طرح یہاں رک جاتے گویا ان کو کوئی کام ھے یا کھانا کھانا ھے۔ مگر اصل میں ان کا مقصد صرف یہ ھوتا تھا کہ اس کو کچھ دیر اور دیکھتے رھیں۔ چاھے کسی کو کتنا ھی غصہ چڑھا ھو مگر اس کو دیکھتے ھی طوفان اتر جاتا اور وہ مجھ سے نرمی سے بات کرنے لگتا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر یہ بالکل سچ بات ھے کہ سرکاری ھرکارے اور قاصد آدھہ آدھہ گھنٹے تک اس سے باتیں کرتے رھتے تھے۔ میری تو ساری گھرداری اسی کے سہارے چلتی تھی۔ اسے گھر صاف کرنے، سجانے، کھانے پکانے، ھر چیز کا بڑا سلیقہ تھا۔ اور میں؟ احمق پیر فرتوت اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ھوتا تھا۔ خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ کیا مجھے اپنی بچی سے محبت نہ تھی، کیا میں اس کی قدر نہ جانتا تھا؟ ھر طرح اسے آرام پہنچانے کی کوشش نہ کرتا تھا؟ مگر آسمانی مصیبتوں کو دعاؤں سے نہیں ٹالا جا سکتا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ھے؟''

یہاں اس نے اپنی مصیبت کی پوری داستان سنائی جو یہ تھی۔

تین سال پہلے کی بات ہے۔ داروغہ ایک نئے رجسٹر میں لائنیں کھینچ رہا تھا اور اس کی بیٹی پردے کے پیچھے بیٹھی اپنے کپڑے سی رہی تھی۔ اتنے میں تین گھوڑوں کی ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے ایک مسافر سر پر چرکیسی ٹوپی دئے، لمبا سا فوجی کوٹ پہنے، گلے میں مفلر لپیٹے کمرے میں داخل ہوا، اور آتے ہی گھوڑوں کا مطالبہ کیا۔ اس وقت گھوڑوں کی چوکی میں ایک بھی گھوڑا نہ تھا۔ یہ سنتے ہی مسافر غصے سے گرجنے لگا۔ اور داروغہ کو مارنے کے لئے چابک اٹھایا۔ دونیا جو ایسے بہت سے منظر دیکھ چکی تھی پردے کے پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی اور بڑی دلربائی سے مسافر سے چائے پینے کو پوچھنے لگی۔ دونیا کو دیکھتے ہی مسافر کا غصہ فرو ہو گیا، اور وہ گھوڑوں کے لئے انتظار کرنے پر راضی ہو گیا اور کھانا لانے کا حکم دیا۔ بھیگی ہوئی سمور کی ٹوپی، مفلر اور لمبا کوٹ اتارنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک کشیدہ قامت نوجوان فوجی افسر تھا۔ وہ بہت جلد گھل مل گیا اور داروغہ اور اس کی بیٹی سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا۔ کھانا میز پر چن دیا گیا۔ اسی دوران میں گھوڑے بھی آ گئے، داروغہ نے گھوڑوں کو مسافر کی سلج میں جوتنے کا حکم دے دیا۔ مگر جب وہ واپس کمرے میں پہونچا تو اس نے دیکھا کہ نوجوان افسر بنچ پر نیم بےہوش پڑا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا اور غشی محسوس ہو رہی تھی غرض یہ کہ وہ اس قابل نہ تھا کہ سفر کر سکے۔ اب کیا ہو؟.. داروغہ نے اپنا پلنگ اسے دیدیا اور یہ طے ہوا کہ اگر وہ اگلے دن تک تندرست نہ ہوا تو اس کے علاج کے لئے شہر ''س،، سے معالج کو بلوایا جائیگا۔

اگلے دن نوجوان کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اس کا نوکر پاس کے شہر سے ڈاکٹر کو لانے گیا۔ دونیا نے سرکے میں رومال ڈبو ڈبو کر اس کے ماتھے پر رکھا اور پلنگ کے قریب سلائی لیکر بیٹھ گئی۔ مریض داروغہ

کے سامنے مستقل کراھتا رھا گو منہھ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ مگر دو پیالی کافی پی اور کراہ کر کھانا لانے کو کہا۔ دونیا لمحہ بھر کو بھی اس کے پہلو سے نہ ہٹی۔ وہ باربار پیاس کی شکایت کرتا۔ اس لئے دونیا اپنے ھاتھ سے لیمو کی شکنجبین بنا کر لائی۔ مریض باربار شکنجبین سے اپنے ھونٹ تر کرتا اور ڈونگا واپس کرتے ھوئے دونیا کا ھاتھ اپنے کمزور ھاتھ میں لیکر احسان مندی ظاھر کرنے کو دباتا۔ ڈاکٹر کھانے کے وقت تک پھونچ گیا۔ اس نے مریض کی نبض دیکھی اور اس سے جرمن میں کچھ بات چیت کی۔ پھر روسی میں کہا کہ اسے فقط آرام کی ضرورت ھے، چند ھی دنوں میں وہ سفر کے قابل ھو جائیگا۔ فوجی افسر نے پچیس روبل فیس کے طور پر پیش کئے اور اپنے ساتھ کھانا کھانے کو کہا۔ ڈاکٹر نے دعوت بخوشی قبول کرلی۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ ایک بوتل شراب پی۔ دونوں بہت خوش اور مطمئن معلوم ھوتے تھے۔

یوں ھی ایک دن اور گزر گیا۔ افسر بالکل تندرست ھو گیا۔ وہ بہت خوش معلوم ھوتا تھا۔ کبھی دونیا، کبھی داروغہ سے ھنسی مذاق کرتا، کبھی سیٹیاں بجاتا، کبھی مسافروں سے گپ مارتا۔ ان کے پروانہ راہداری کا اندراج رجسٹر میں کرتا۔ یہاں تک کہ نیک دل داروغہ اس سے اتنا خوش ھو گیا کہ منٹ بھر کو بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ کرنا چاھتا۔ اگلے دن اتوار تھا۔ دونیا چرچ جانے کو تیار ھوئی، اتنے میں فوجی افسر کی سلج بھی آ گئی۔ اس نے داروغہ سے رخصت چاھی، اتنے دنوں کی میزبانی کا دل کھول کر معاوضہ دیا۔ دونیا کو خدا حافظ کہا اور پھر اسے اپنے ساتھ سلج میں چرچ تک پہنچا دینے کی تجویز کی، کیونکہ چرچ گاؤں کے دوسرے سرے پر تھا۔ دونیا کچھ چپ سی ھو گئی، تو اس کے باپ نے کہا ”تم بھی عجیب لڑکی ھو، آخر تمہیں کیا ڈرھے؟ عالی جاہ کوئی بھیڑیا تھوڑے ھی ھیں جو تمہیں کھا جائینگے۔ جاؤ تمہیں چرچ تک چھوڑ دینگے۔“

دونیا سلج میں فوجی کے پاس بیٹھ گئی، نوکر اچھل کر سامنے کی نشست پر ہو بیٹھا، کوچوان نے سیٹی بجائی اور گھوڑے سرپٹ روانہ ہو گئے۔

بدقسمت داروغه کی آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس دن اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کس طرح ایسا اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی دونیا کو فوجی کے ساتھ جانے دیا۔ مگر آدھا ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ اس کے دل میں عجب بےچینی اور اضطراب محسوس ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی پریشانی اس قدر بڑھی کہ وہ دونیا کو لینے چرچ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچ کر اس نے دیکھا کہ لوگ گرجا سے نکل رہے ہیں۔ مگر دونیا نہ چرچ کے باہر تھی، نہ برساتی میں۔ وہ تیزی سے اندر گھسا، پادری منبر سے اتر کر جا چکا تھا۔ گرج کا محافظ شمعیں بجھا رہا تھا۔ دو بوڑھی عورتیں کونے میں سر جھکائے دعا مانگ رہی تھیں۔ مگر دونیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بدنصیب باپ نے بہ مشکل محافظ گرجا سے پوچھا کہ کیا دونیا عبادت کے وقت گرجا میں تھی؟ اس نے انکار کیا۔ داروغه نیم جان گھر واپس آیا۔ اب صرف ایک امید باقی تھی کہ شاید دونیا جوانی کی ترنگ میں سلج میں بیٹھے بیٹھے اگلی چوکی تک چلی گئی ہو جہاں اس کی دینی ماں رہتی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں ان گھوڑوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، جو اس نے دونیا کا حال معلوم کرنے کےلئے ڈاک کے ساتھ بھیجے تھے۔ سارا دن گزر گیا مگر گاڑی بان واپس نہ آیا۔ آخر رات گئے وہ شراب کے نشے میں بدمست یہ وحشت بھری خبر لیکر آیا کہ ”دونیا اگلے اسٹیشن سے فوجی کے ساتھ اور آگے چلی گئی“۔

غریب داروغه پر اس خبر سے گویا بجلی گر پڑی۔ وہ اسی دن سے بیمار ہو گیا۔ اور اسی پلنگ پر پڑ گیا جہاں ایک دن پہلے وہ حیلہ‌جو نوجوان مکر کئے لیٹا تھا۔ جب داروغه نے سب واقعات پر غور کیا تو اسے یقین ہو گیا کہ نوجوان کی بیماری سراسر دھوکہ تھی۔ ہر وقت سوچتے سوچتے اس پر دماغی بخار کا زبردست

حملہ ھوا۔ علاج کے لئے اسے شہر ''س،، لیجایا گیا۔ اور کوئی دوسرا داروغہ عارضی طور پر اس کی جگہہ مقرر کر دیا گیا۔ شہر میں اس کا معالج وھی ڈاکٹر تھا جو چند دن پہلے نوجوان فوجی کا علاج کرنے گیا تھا۔ اس نے داروغہ کو بتایا کہ فوجی کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ محض مکر تھا۔ اور وہ اسی وقت اس کے بداردے کو بھانپ گیا تھا۔ مگر اس کے چابک کے خوف سے داروغہ کو کچھ نہ بتا سکا۔ نہ جانے جرمن ڈاکٹر سچ بول رھا تھا یا داروغہ پر محض اپنی فراست کا رعب جمانا چاھتا تھا۔ بہر حال اس اطلاع سے داروغہ کو خاک تسلی نہ ھوئی۔ کچھ بہتر ھوتے ھی اس نے شہر ''س،، میں اپنے حکام بالا سے دو ماہ کی چھٹی لی، اور کسی کو اپنے ارادہ کی اطلاع دئے بغیر وہ بیٹی کی تلاش میں چل پڑا۔ رجسٹر کے اندراج سے اسے اتنا معلوم تھا کہ کپتان مینسکی سمولنسک سے پیٹرزبرگ جا رھا تھا۔ کوچوان نے اسے بتایا تھا کہ دونیا سارے راستے روتی رھی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی رضامندی سے گئی تھی۔ داروغہ نے سوچا ''خدا نے چاھا تو میں اپنی بھکی ھوئی بھیڑ کو واپس گھر لے آؤنگا۔،، اسی خیال میں ڈوبا ھوا وہ پیٹرزبرگ پہنچا۔ وھاں اسمعیلوف رجمنٹ کی بارکوں میں اپنے ایک پرانے فوجی ساتھی کے ھاں ٹھیرا جو ایک معمولی ریٹائرڈ افسر تھا۔ اور دونیا کی تلاش شروع کر دی۔ اسے بہت جلد معلوم ھو گیا کہ کپتان مینسکی پیٹرزبرگ میں دیموتوف کی سرائے میں رھتا ھے۔ داروغہ نے اس سے ملنے کی ٹھان لی۔

اگلے روز سویرے ھی وہ مینسکی کی رھائش کے بیرونی دروازے پر پہنچا، اور اس کے نوکر سے کہا کہ ایک بوڑھا سپاھی اس کے آقا سے ملنے کا خواھشمند ھے۔ نوکر نے جو سواری کا بوٹ فرمے پر چڑھائے پالش کر رھا تھا، کہا کہ آقا ابھی تک سو رھے ھیں اور گیارہ بجے تک کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ داروغہ واپس چلا گیا اور وقت معینہ پر لوٹ آیا۔ مینسکی ڈریسنگ گون اور سرخ ترکی ٹوپی پہنے خود اس سے ملنے آیا۔ ''کیوں بھائی

میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟،، اس نے پوچھا۔ داروغہ کا دل جذبات کی شدت سے امنڈ آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوچھلکنے لگے، منہ سے بس اتنا نکلا ’’حضور! جناب عالی! خدا کے لئے... حضور!،، مینسکی نے اس پر ایک تیز سی نگاہ ڈالی، اور اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ’’حضور عالی! جو گیا وہ تو اب کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ مگر میری غریب بچی کو مجھے واپس دیدیجئے۔ آپ نے اپنا شوق پورا کر لیا۔ اب اسے اور تباہ نہ کیجئے۔،، نوجوان نے متاثر ہوکر جواب دیا ’’بیشک جو ہو چکا سو ہو چکا، میں تمہارا قصوروار ہوں اور تم سے معافی چاھتا ہوں، مگر میں دونیا کو نہیں چھوڑ سکتا، میں تم سے اپنی عزت کی قسم کھا کر اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ وہ خوش رھیگی۔ اچھا تم اسے واپس لے جا کر کیا کروگے؟ اسے مجھ سے محبت ھے۔ اب وہ اپنی پرانی زندگی دوبارہ اختیار نہیں کر سکتی۔ جو واقعہ ہو چکا ھے نہ تم ھی اسے بھلا سکوگے نہ وہ۔،، پھر اس نے داروغہ کی آستین میں کچھ ٹھونستے ہوئے دروازہ کھولا، اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ سکے داروغہ سڑک پر تھا۔

دیر تک وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا، پھر اس نے محسوس کیا کہ کف کے نیچے کاغذوں کا پلندہ سا ھے، نکال کر دیکھا تو پچاس روبل کے مڑے ہوئے بہت سے نوٹ تھے۔ ان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے شرم اور غصے کے مارے برسات برسنے لگی۔ اس نے نوٹوں کو توڑ مروڑ کر ان کا گولہ سا بنا کر زمین پر پٹخ دیا، پھر اسے پاؤں سے خوب روندا اور آگے چلدیا۔ مگر کچھ دور چل کر رک گیا، اور پھر وہ سوچنے لگا۔ واپس آیا تو نوٹوں کا گولہ غائب تھا۔ ایک خوش پوش نوجوان اس کو دیکھتے ھی ایک گاڑی کی طرف لپکا اور اس میں بیٹھ کر کوچوان سے بولا ’’جلدی چلو!،، مگر داروغہ نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس نے اپنے کام پر واپس جانے کا ارادہ کر لیا۔ مگر جانے سے پہلے وہ ایک بار اپنی بچی کو دیکھنا چاھتا تھا۔ چنانچہ دو دن بعد پھر وہ مینسکی کے گھر گیا۔ مگر اس دفعہ فوجی نوکر نے یہ کہکر کہ اس کا آقا کسی سے ملتا نہیں دروازہ جھٹ سے بند کر دیا۔ داروغہ دیر تک باھر کھڑا رہا اور پھر واپس چلا گیا۔

اسی شام کو وہ لتی‌نایا سڑک پر گھوم رہا تھا جہاں وہ شہیدوں کے چرچ میں عبادت کر چکا تھا۔ کہ اتنے میں ایک بڑی شاندار گاڑی اس کے پاس سے تیزی کے ساتھ گزر گئی۔ داروغہ نے مینسکی کو پہچان لیا۔ گاڑی ایک تین منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ مینسکی کود کر برساتی میں چلا گیا۔ داروغہ کو ایک ترکیب سوجھی۔ گاڑی کے قریب پہنچکر اس نے کوچوان سے پوچھا ”کیوں بھائی یہ گاڑی کس کی ھے؟ کہیں مینسکی کی تو نہیں ھے؟“ ”ھاں ھاں انہیں کی ھے“ کوچوان نے جواب دیا۔ ”مگر تم کیوں پوچھتے ھو؟“ ”میں اس لئے پوچھتا ھوں کہ تمہارے آقانے مجھے ایک پرچہ دیا تھا کہ میں ان کی دونیا کو پہنچا دوں۔ مگر میں بدقسمتی سے یہ بھول گیا کہ وہ کہاں رھتی ھے۔“ ”اسی مکان میں دوسری منزل پر رھتی ھے۔ مگر بھیا اب تمہارا پرچہ پہنچانا بیکار ھے۔ آقا خود اس وقت اس کے پاس گئے ھیں۔“ ”کچھ پرواہ نہیں“ داروغہ کا دل عجب طرح دھڑکنے لگا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے ٹھیک جگہ بتا دی۔ مجھے تو اپنا کام کرنا ھی ھے۔“ یہ کہکر وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

دروازہ مقفل تھا۔ اسّ نے گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر تک امید وبیم میں غوطے لگاتا رہا۔ قفل میں کنجی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ ”کیا اودوتیا سمسونوونا یہیں رھتی ھیں؟“ اس نے پوچھا۔ ”ہاں“ نوجوان خادمہ نے جواب دیا۔ ”آپ کو ان سے کیا کام ھے؟“ داروغہ جواب دئے بغیر ھی ھال میں داخل ھو گیا۔ ”آپ اندر نہیں جا سکتے!“ ملازمہ نے اس کے پیچھے پیچھے آتے

ہوئے کہا ''اودوتیا سمسونوونا اس وقت اکیلی نہیں ہیں۔''
مگر داروغہ نے ایک نہ سنی اور آگے بڑھتا گیا۔ شروع کے دو کمروں میں اندھیرا تھا، تیسرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ اس کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا، مگر ایکدم ٹھٹھک گیا۔ مینسکی نفیس فرنیچر سے آراستہ کمرے میں کسی سوچ میں غرق بیٹھا تھا۔ دونیا بہت فیشن ایبل لباس پہنے اس کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی تھی، جیسے انگریزی انداز میں ایک رخی کاٹھی پر سواری کر رہی ہو۔ وہ محبت بھری نگاہ سے مینسکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سیاہ گھنگریالے بالوں کو اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ اس کی انگلیوں میں جڑاؤ انگھوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ غریب داروغہ! اس کو اپنی بیٹی کبھی اتنی خوبصورت نہ لگی تھی۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی بے اختیار تعریفی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔
''کون ہے؟'' دونیا نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔ وہ گم سم بت بنا کھڑا رہا۔ جواب نہ ملا تو دونیا نے سر اٹھا کر دیکھا... نظر پڑتے ہی چیخ مار کر قالین پر گر پڑی۔ مینسکی گھبرا کر اسے اٹھانے کو جھکا مگر دروازے کے قریب داروغہ کو کھڑا دیکھ کر اس نے دونیا کو چھوڑ دیا اور غصے سے کانپتے ہوئے اس کی طرف جھپٹا۔ ''کیا چاہئے تمہیں؟'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''تم چوروں کی طرح میرے پیچھے پیچھے کیوں پھرتے ہو؟ کیا میری جان لینا چاہتے ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے!'' اس نے بوڑھے کے کوٹ کا کالر اپنے مضبوط ہاتھ سے پکڑ کر اسے باہر سیڑھیوں تک دھکیل دیا۔

بوڑھا اپنے قیام گاہ پر واپس آیا۔ اس کے دوست نے عدالتی چارہ جوئی کرنے کی صلاح دی۔ مگر داروغہ نے سوچ بچار کرنے کے بعد اس خیال کو رد کر دیا اور یہی فیصلہ کیا کہ معاملے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

دو دن بعد وہ پیٹرزبرگ چھوڑ کر اپنی گھوڑوں کی چوکی پر واپس آ گیا اور اپنے روزمرہ کے فرائض میں مشغول ہو گیا۔ ''اس واقعہ کو تین سال گزر چکے

ھیں،، اس نے کہانی کو ختم کرتے ھوئے کہا ۔ ،،تب سے میں دونیا کے بغیر زندگی گزار رھا ھوں ۔ اس عرصہ میں مجھے اس کے متعلق ایک حرف بھی معلوم نہیں ھوا ۔ خدا جانے زندہ بھی ھے یا مر گئی ۔ ایسی صورت میں کچھ نا ممکن نہیں ۔ وہ نہ پہلی لڑکی ھے نہ آخری جسے اس طرح کسی راہ چلتے من چلے نوجوان نے اغوا کیا اور کچھ دنوں داشتہ بنا کر چھوڑ دیا ۔ پیٹرزبرگ میں اس جیسی نہ جانے کتنی احمق لڑکیاں ھوں گی جو آج تو مخمل اور اطلس میں ملبوس ھیں اور کل... آپ دیکھیں گے کہ وہ گرے پڑے لوگوں کے ساتھ چوراھوں پر جھاڑو دے رھی ھیں ۔ کبھی کبھی جب مجھے خیال آتا ھے کہ دونیا بھی اسی طرح اپنی زندگی کے دن کاٹ رھی ھوگی تو میرے دل میں یہ گناہآلود خواھش پیدا ھوتی ھے کہ کاش وہ مر چکی ھوتی... ،،

یہ کہانی تھی جو میرے بوڑھے دوست نے نہ جانے کتنی بار آنسو پونچھ پونچھ کر سنائی ۔ وہ دمیتریف کی حسین داستانی نظم کے پرجوش ترینتیچ کی طرح آنسوؤں کو بڑے تصویری انداز میں اپنے کوٹ کے دامن سے پونچھتا جاتا تھا ۔ آنسوؤں کی ایک وجہ شراب کے وہ پانچ گلاس بھی تھے جو کہانی سنانے کے دوران میں اس نے یکے بعد دیگرے خالی کئے ۔ مگر میرے دل پران آنسوؤں کا بہت اثر ھوا اور اس سے رخصت ھونے کے بعد دیر تک میں اس کا اور بدنصیب دونیا کا خیال اپنے ذھن سے نہ نکال سکا ۔

کچھ عرصہ ھوا کہ میرا گزر پھر شہر ،،خ،، سے ھوا، مجھے اپنا پرانا دوست یاد آیا ۔ تحقیق کرنے پر معلوم ھوا کہ وہ گھوڑوں کی چوکی جہاں اس کا ایک زمانے میں راج تھا اب موجود نہ تھی ۔ مگر کوئی اس سوال کا جواب ٹھیک سے نہ دے سکا کہ بوڑھا داروغہ زندہ ھے یا نہیں ۔ مجھے ان جانے پہچانے مقامات کو پھر سے دیکھنے کی ایسی زبردست خواھش ھوئی کہ میں نے سات روبل میں گھوڑے کرایہ پر لئے اور ،،ن،، گاؤں کی طرف روانہ ھو گیا ۔

خزاں کا دور دورہ تھا۔ آسمان پر خاکستری بادل چھائے ہوئے تھے۔ اناج سے خالی کھیتوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوا درختوں کے سرخ و زرد پتے اڑائے لئے آ رھی تھی۔ سورج کے غروب ھوتے ھوتے میں گاؤں پہونچ گیا۔ اور ڈاک گھر کے سامنے رک گیا۔ ایک موٹی سی عورت اندر سے نکل کر برساتی میں آئی۔ (ھائے یہیں ایک دن دونیا نے مجھے پیار کیا تھا!) عورت نے میرے سوال کے جواب میں کہا کہ بوڑھا داروغہ سال بھر ہوئے انتقال کر چکا ھے، اسکا گھر اب ایک شراب کشید کرنے والے کے پاس ھے اور وہ خود اس شراب ساز کی بیوی ھے۔ مجھے سفر کی زحمت اور سات روبل کا خرچ رائگاں معلوم ھوا۔ میں نے پھر پوچھا ''اس کو کیا عارضہ ھوا تھا؟'' ''عارضہ تو کچھ نہیں۔ اس نے تو شراب کے پیچھے اپنی جان کھوئی۔'' ''اور دفن کہاں ھوا؟'' ''گاؤں کے دوسرے سرے پر اپنی بیوی کے پاس۔'' ''کیا کوئی مجھے اس کی قبر تک لے جا سکتا ھے؟'' ''ھاں ھاں کیوں نہیں۔ اے وانکا چھوڑ اس بلی کو اور ان صاحب کو قبرستان لے جاکر داروغہ کی قبر کا پتہ بتا دے۔''

ایک کانا لڑکا پھٹے پرانے کپڑے پہنے دوڑتا ھوا اندر سے آیا اور مجھے اپنے ساتھ گاؤں کے دوسرے سرے تک لے گیا۔

''کیا تم جانتے تھے گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کو؟'' میں نے راستے میں لڑکے سے پوچھا۔

''ھاں خوب اچھی طرح، انہوں نے مجھے سیٹیاں بنانی سکھائی تھیں۔ اور جب وہ شراب کی دکان سے نکلتے تھے تو ھم لڑکے ان کے پیچھے پیچھے چلاتے تھے ''چاچا! چاچا! ھمیں میوہ دو!'' اور وہ ھمیں ڈھیر سا میوہ دے دیتے۔ وہ ھمیشہ ھمارے ساتھ کھیلتے تھے۔''

''کیا اور مسافر بھی ان کے بارے میں پوچھتے ھیں؟''

''اب اس طرف زیادہ مسافر آتے ھی نہیں، سوائے محکمہ آبکاری کے جج کے اور وہ کبھی مر جانے والوں کے متعلق نہیں سوچتے۔ مگر اس سال گرمی میں ایک

خاتون آئی تھیں۔ انہوں نے داروغہ کو پوچھا اور پھر ان کی قبر دیکھنے گئیں۔،،

،،خاتون؟ کس قسم کی خاتون؟ میں نے تجسس سے پوچھا۔

،،بڑی ھی خوبصورت تھیں۔ چھہ گھوڑوں کی گاڑی میں سوار تھیں۔ اور ساتھ میں تین بچے اور ان کی آیا اور ایک چھوٹا سا کالا کتا تھا۔ جب ان سے کہا کہ داروغہ مر چکے ھیں تو رونے لگیں۔ بچوں سے کہا کہ ،،تم چپ چاپ یہاں ٹھہرو۔ میں ذرا قبرستان ھو آؤں۔،، میں نے کہا ،،چلو میں راستہ دکھا دوں۔،، تو بولیں ،،میں سب راستے جانتی ھوں،، اور پھر مجھے چاندی کا پانچ کوپک کا سکہ دیا۔ بڑی ھی اچھی خاتون تھیں!،،

اس عرصہ میں ہم قبرستان تک پہونچ چکے تھے۔ بڑی غم گین اور ویران جگہہ تھی۔ چاروں طرف باڑ تک نہ تھی۔ جگہہ جگہہ لکڑی کی صلیبیں آویزاں تھیں۔ دھوپ کی تیزی سے بچنے کو سایہ تک نہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ پر حسرت قبرستان نہ دیکھا تھا۔

،،یہ ھے بوڑھے داروغہ کی قبر،، لڑکے نے مٹی کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک سیاہ صلیب لگی تھی اور پیتل کی شبیہہ لٹکی ھوئی تھی۔

،،کیا وہ خاتون بھی یہاں آئی تھیں؟،،

،،آئی تھیں،، وانکا نے جواب دیا۔ ،،میں نے دور کھڑے ھوکر دیکھا تھا کہ وہ بہت دیر تک یہاں پڑی رھیں اور پھر گاؤں واپس گئیں اور پادری کو بلایا اور کچھ روپیہ دیا... اور مجھے پانچ کوپک دئے۔ بڑی اچھی خاتون تھیں...،،

میں نے بھی بچے کو پانچ کوپک کا سکہ دیا۔ اب مجھے یہاں تک سفر کرنے اور سات روبل خرچ کرنے کا ذرا بھی افسوس نہ تھا۔

بھروپ

"تم ہر لباس میں حسین و دلکش
نظر آتی ہو میری دلربا!"
بوگدانووچ

ایوان پتروویچ بیرستوف کی جاگیر ایک دورافتادہ صوبے میں واقع تھی - جوانی میں وہ فوجی گارڈ کے دستے میں تھے - مگر ۱۷۹۷ء میں انہوں نے فوجی نوکری کو خیرباد کہا اور اپنے علاقے پر مستقل سکونت اختیار کرلی - ان کی بیوی ایک غریب مگر اعلی خاندان سے تعلق رکھتی تھی - بچے کی ولادت کے وقت اس کا انتقال ہو گیا - ایوان پتروویچ اس روز شکار پر گئے ہوئے تھے - اس لئے یہ حادثہ ان کی غیر حاضری میں ہوا - بیوی کے صدمے کو انہوں نے علاقہ کی دیکھ بھال اور جائداد کے انتظام میں مصروف ہو کر بھلانے کی کوشش کی - اپنا پرانا مکان نئے سرے سے اپنی پسند کا تعمیر کرایا - اپنے علاقہ میں کپڑے کا کارخانہ کھولا - اس طرح ان کی آمدنی دن بدن بڑھتی گئی - اور وہ اپنے کو علاقہ کا سب سے عقلمند آدمی سمجھنے لگے - ان کی اس خوش فہمی کو پختہ کرنے میں ان کے چاپلوس پڑوسیوں کا بھی کچھ ہاتھ تھا - یہ لوگ اکثر اپنے کنبوں بلکہ کتوں سمیت آکر کئی کئی دن ایوان پتروویچ کے مہمان رہتے اور موقع بے موقع

ان کی تعریف کرتے رہتے۔ ایوان پتروو‌چ روز مرہ کام کاج کے وقت نقلی مخمل کی صدری پہنتے اور چھٹی کے دن ہاتھ کے عمدہ بنے ہوئے کپڑے کا فراک کوٹ۔ خود اپنا حساب کتاب رکھتے۔ اخبار میں صرف سینیٹ کی کارروائی کے متعلق خبریں پڑھتے۔ مجموعی طور پر سب لوگ انہیں پسند کرتے تھے اگرچہ بعض لوگ انہیں مغرور اور خود پسند سمجھتے تھے۔ گریگوری ایوانووچ موروسکی ان کا سب سے قریبی پڑوسی تھا۔ اور صرف وہی ایک ایسا آدمی تھا جس سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ موروسکی پرانی طرز کا روسی جاگیردار تھا۔ اس نے اپنی مال و دولت کا بڑا حصہ فضول خرچیوں میں اڑا دیا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد وہ بھی ماسکو چھوڑکر اپنے گاؤں میں آبسا کیونکہ ساری جائداد میں سے بس یہی گاؤں باقی بچ رہا تھا۔ یہاں بھی اس نے دولت اڑانے کا سلسلہ ذرا مختلف انداز میں جاری رکھا۔ اس نے اپنے مکان کے سامنے انگریزی طرز کا باغ لگایا، جس پر رہی سہی پونجی خرچ ہو گئی۔ اس کے اصطبل میں کام کرنے والے لڑکے انگریزی سائیسوں جیسا لباس پہنتے۔ بیٹی کی تعلیم کے لئے انگریز گورنس مقرر تھی۔ یہاں تک کہ زمین کی کاشت بھی انگریزی طریقے سے کرتا۔ مگر مثل مشہور ہے کہ روسی اناج کے لئے غیرملکی طریقے موزوں نہیں۔ گریگوری ایوانووچ نے اپنے اخراجات کم کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر آمدنی میں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہوا تھا، اس لئے گاؤں میں رہتے ہوئے بھی وہ اور زیادہ مقروض ہو گیا۔ ان سب باتوں کے باوجود لوگ اس کی قابلیت کے قائل تھے کیونکہ وہ پہلا آدمی تھا جس نے اپنی جائداد سرپرستوں کی عدالتی کمیٹی میں گروی رکھنے کی بات سوچی تھی۔ اور یہ کام اس وقت بڑا ہی پیچیدہ اور ہمت کا تھا۔ بعض لوگوں کو اس کی اس حرکت پر اعتراض تھا۔ ان میں سب سے زیادہ کٹر نکتہ چین بیرستوف تھا جسے ہر قسم کی نئی بات ناپسند تھی۔ اسے اپنے پڑوسی کی انگریزیت سے اسقدر چڑ تھی کہ اس کا ذکر وہ ٹھنڈے دل سے نہ کر سکتا

تھا ۔ ہمیشہ اس میں عیب نکالنے کے درپے رہتا ۔ مثلاً جب اپنے مہمانوں کو علاقے کی سیر کراتا اور وہ اس کی خوش انتظامی کی تعریف کرتے تو کہتا ''جی ہاں! اصل میں بات یہ ہے کہ ہم لوگ پڑوسی گریگوری ایوانووچ جیسے تو ہیں نہیں کہ انگریزوں کے نقل میں اپنے آپ کو تباہ کر لیں ۔ ہمارے لئے تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے روسی ڈھنگ سے پیٹ بھر سکیں اور عزت کی زندگی گذار سکیں ۔،، پڑوسیوں کی عنایت سے اس قسم کے سب جملے پھول پھندنے لگاکر گریگوری ایوانووچ کے کانوں تک پہنچائے جاتے ۔ انگریزیت پسند موروسکی بھی ہر قسم کی نکتہ چینی سے ایسے ہی بگڑتے تھے، جیسے ہمارے اخباروالے ۔ چنانچہ انہوں نے بھی مارے غصے کے دیہاتی زوئی‌لس بیرستوف کو گنوار، جنگلی ریچھ وغیرہ کے ناشائستہ نام دئے تھے ۔

غرض یہ کہ ان دونوں جاگیرداروں کے تعلقات کافی حد تک کشیدہ تھے کہ اسی زمانے میں بیرستوف کا بیٹا کچھ عرصہ کے لئے اپنے باپ کے پاس رہنے کیلئے آیا ۔ اس نے ''خ،، یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی اور فوج میں بھرتی ہونے کا خواہشمند تھا ۔ باپ اس کو فوج میں بھیجنے پر راضی نہ تھا ۔ اور صاحب زادے کو یقین تھا کہ وہ سرکاری نوکری کے بالکل اہل نہیں ہیں ۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ہٹ چھوڑنے پر راضی نہ تھا ۔ اسلئے یہ معاملہ ابتک طے نہ ہو سکا تھا ۔ اور نوجوان الکسی اپنے باپ کی جاگیر پر ٹھاٹ سے وقت گذار رہا تھا ۔ صرف احتیاطاً مونچھیں رکھ لیں تھیں کہ شاید فوج میں جانے کی اجازت مل جائے ۔

الکسی بڑا خوش‌رو نوجوان تھا ۔ اور اس کے موزوں قد و قامت پر فوجی وردی بہت پھبتی اور اگر کہیں شہسواری کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے کی جگہ اسے سرکاری کاغذات پر سر جھکائے جھکائے جوانی بسر کرنی پڑی تو یہ اس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی ۔ وہ جب کبھی شکار پر جاتا تو اس کا گھوڑا راستے کی رکاوٹوں کو پھلانگتا

ہمیشہ سب سے آگے رہتا۔ اور سب پڑوسی متفق طور پر کہتے ''اوں ہوں! یہ لڑکا ہرگز اچھا سرکاری افسر نہیں بن سکتا۔ یہ تو فوج کے لئے ہی موزوں ہے۔،، نوجوان لڑکیوں کی پرشوق نگاہیں اکثر اس پر پڑتیں۔ اور یہی دلچسپی بعض اوقات پسندیدگی میں تبدیل ہو جاتی۔ مگر الکسی کسی لڑکی کی طرف توجہ نہ کرتا۔ اور لڑکیاں اس کی سردمہری سے یہ نتیجہ نکالتیں کہ اسے ضرور کسی سے محبت ہے۔ اس کے ثبوت میں کاغذ کا ایک پرزہ دست بدست گشت کرایا گیا، جس پر اس کے خطوں میں سے ایک کے مکتوب علیہ کا پتہ لکھا تھا جو یہ تھا: اکولینا پترو ونا کورچکینا، ماسکو، سینٹ الکسی کی خانقاہ کے متصل ٹھٹھیرے ساویلیو کے مکان پر پہنچے۔ اور درخواست ہے کہ مہربانی کرکے یہ خط ا۔ ن۔ ر۔ کو پہنچا دیا جائے۔

ہمارے پڑھنے والوں میں سے جو لوگ دیہات میں نہیں رہے ہیں ان کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ دیہاتی لڑکیاں کسقدر من موہنی ہوتی ہیں۔ دیہات کی کھلی ہوا اور سیبوں کے باغوں کے سایوں میں پل کر سوسائٹی اور زندگی کے متعلق ان کا سارا علم کتابوں کا مرہون منت ہوتا ہے۔ خاموشی اور تنہائی، آزادی اور کتابیں پڑھنے کا شوق ان میں ان جذبات اور حسیات کی نشوونما کر دیتا ہے، جو ہمارے شہروں کی فیشن زدہ نازنینوں میں عنقا ہیں۔ ان الھڑ دیہاتی دوشیزاؤں کے لئے گھنٹیوں کی آواز میں ایک عجیب سحر ہے۔ قریبی شہر کا سفر ان کی زندگی کا یادگار واقعہ ہے۔ اور کبھی کبھار آنے والے پردیسی ان کے دل پر دیرپا بلکہ کبھی کبھی اٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ بعض لوگ ان لڑکیوں کی نرالی خصوصیات پر ہنسیں گے۔ مگر ان سرسری نظر سے دیکھنے والوں کی ہنسی ان کی ذاتی خوبیوں پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی وہ دلفریب انفرادیت ہے جس کے بغیر ژان پال ریختر کے قول کے مطابق کوئی انسان ممتاز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بڑے شہروں میں عورتیں زیادہ تعلیم یافتہ ہوں۔ مگر سوسائٹی کے اثر سے ان کی شخصیت

بہت جلد ایک رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دماغ ان کے سر کی پوشش کی طرح یکساں ہو جاتے ھیں۔ اس بات سے نہ کسی پر اعتراض مقصود ہے نہ مقابلہ بلکہ یہ محض ذاتی رائے ہے۔

اس سے اندازہ ھو سکتا ہے کہ نوجوان الکسی نے ہمارے علاقے کی سادہ دل دوشیزاؤں کو کس حدتک متاثر کیا ہوگا۔ ان کے لئے وہ پہلا نوجوان تھا جس کے انداز میں افسردگی اور محرومیوں کی تلخی تھی۔ جس نے پہلی بار ان سے خوشی کے تیزپا لمحوں اور اپنے شباب کی یاس انگیزیوں کا تذکرہ کیا۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اس کی انگلی میں ایک سیاہ انگوٹھی تھی جس پر مردے کی کھوپری منقش تھی۔ اس علاقے میں یہ سب چیزیں اسقدر انوکھی تھیں کہ سب لڑکیاں اس کی دیوانی تھیں۔

مگر الکسی سے سب سے زیادہ دلچسپی انگریزیت پسند موروسکی کی بیٹی لیزا کو تھی (جسے اسکا باپ بیٹسی کہتا تھا)۔ دونوں کے باپ ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ اس لئے لیزا نے ابتک الکسی کو نہیں دیکھا تھا۔ اور آس پاس کی لڑکیاں ہر وقت الکسی ھی کا ذکر کرتی تھیں۔ لیزا کی عمر سترہ سال کی تھی۔ زیتونی رنگ کے دل کش چہرے پر سیاہ بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں۔ وہ اکلوتی لڑکی تھی اسلئے تھوڑی سی سرکش اور لاڈ پیار میں بگڑی ہوئی ضرور تھی۔ اس کی شوخیاں اور شرارتیں اس کے باپ کو بہت پسند تھیں۔ مگر بیچاری گورنس کے لئے باعث عذاب تھیں۔ اس کی گورنس مس جیکسن چالیس سال کی بےحد سنجیدہ کنواری عورت تھی۔ چہرے پر ڈھیروں پاؤڈر تھوپتی اور بھوئیں بناتی تھی۔ ہر چھٹے مہینے اپنا پسندیدہ ناول ''پامیلا،، دو بارہ پڑھتی۔ ان سب خدمات کے عوض اس کو دو ہزار روبل سالانہ ملتے تھے۔ وہ اس وحشی ملک روس سے حددرجہ نالاں اور اکتائی ہوئی تھی۔

لیزا کی ایک ملازمہ تھی ناستیا جو عمر میں اس سے ذرا بڑی مگر اپنی مالکہ کی طرح تیز طرار تھی۔ لیزا

کو اس سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اسے اپنے رازوں میں شریک کرتی تھی اور اپنی شرارتوں کو عملی جامہ پہنانے میں اس کی مدد لیتی تھی۔ غرض یہ کہ پری لوچنو گاؤں میں فرانسیسی ناولوں کے رازدار کیریکٹروں سے زیادہ ناستیا کو اہمیت حاصل تھی۔

"کیا آج میں باہر کسی سے ملنے جا سکتی ہوں؟" ناستیا نے ایکدن صبح کو اپنی مالکہ کو لباس تبدیل کراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ہاں ضرور مگر کہاں جا رہی ہو؟"

"توگی‌لوو گاؤں، بیرستوف کے ہاں۔ ان کے باورچی کی بیوی کا آج جنم دن ہے۔ وہ کل ہمیں کھانے کا بلاوا دینے آئی تھی۔"

"اچھا تو یہ بات؟ دونوں گھروں کے مالکوں میں تو میل ملاپ نہیں اور نوکر ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے ہیں۔ ہوں؟"

"ہمیں مالکوں کے جھگڑے میں دخل دینے کی کیا ضرورت؟" ناستیا نے فوراً جواب دیا۔ "اور پھر تو میں تمہاری ملازمہ ہوں، تمہارے ابا کی تھوڑی ہی ہوں۔ اور تمہارا اب تک نوجوان بیرستوف سے کوئی جھگڑا ہوا نہیں۔ بڑے بوڑھے جانیں اور ان کے لڑائی جھگڑے جانیں۔"

"اچھا ذرا کوشش کر کے الکسی بیرستوف کو دیکھ کر آنا اور آکر مجھے بتانا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔"

ناستیا نے وعدہ کر لیا۔ لیزا سارے دن اپنی ملازمہ کا بے چینی سے انتظار کرتی رہی، جب وہ شام کو واپس آئی تو کمرے میں گھستے ہی بولی:

"لیزاویتا گریگوریونا! آج میں نے بیرستوف کو دیکھ لیا اور دیکھا بھی خوب اچھی طرح کیونکہ تقریباً سارے دن وہ اور ہم ساتھ رہے۔"

"ہیں! سچ مچ مجھے سارا حال بتاؤ شروع سے!"

"ہاں تو ہم سب اکٹھے وہاں پہونچے۔ میں، انیسیا یوگورونا، نیلا، دونیا..."

"ہاں ہاں، جانتی ہوں۔ پھر کیا ہوا؟"

"نہیں بھئی ساری بات شروع سے سنانے دیجئے۔ ہاں تو ہم لوگ عین کھانے کے وقت وہاں پہونچے۔ سارا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، کولبین اور زخاریف کے نوکر بھی تھے، داروغہ کی بیوی اور بیٹیاں بھی تھیں، خلوپن کے نوکر..."

"مجھے تو بیرستوف کے متعلق بتاؤ۔"

"ارے آپ سنئیے تو سہی۔ ہم لوگ میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ داروغہ جی کی بیوی میزبان کے پاس بیٹھیں۔ ان کے پاس میں بیٹھی تھی۔ اس پر ان کی بیٹیوں نے کچھ منہ بنایا۔ مگر میں نے ذرا پرواہ نہ کی۔"

"افوہ! ناستیا تمہیں فضول بکواس کا کتنا شوق ہے!"

"اور آپ؟ کس قدر بے صبر ہیں! ہم لوگ کھانا کھا کر اٹھے۔ کھانا تقریباً تین گھنٹے تک چلتا رہا، ہر چیز بہت مزیدار تھی، رنگ برنگے میٹھے سموسے اور نہ جانے کیا کچھ۔ کھانا کھا کر ہم لوگ باغ میں آنکھ مچولی کھیلنے چلے گئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ نو عمر آقا بھی وہاں موجود ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ وہ بہت خوبصورت ہے؟"

"خوبصورت تو واقعی بہت ہے۔ کشیدہ قامت، سرخ و سفید۔"

"سرخ و سفید؟ اور مجھے نہ جانے کیوں خیال تھا کہ اس کا رنگ زعفرانی ہوگا۔ خیر! اور کیسا لگا وہ؟ اداس؟ فکرمند؟"

"ارے نہیں، بالکل نہیں ایسا منچلا آدمی تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔"

"تم لوگوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی؟ کیا کہہ رہی ہو ناستیا؟"

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جو کوئی ان کے ہاتھ آجاتا اسے پیار کرتے۔"

''ارے ناستیا تم کیا من گھڑت باتیں کر رہی ہو!''

''میں کیوں من گھڑت باتیں کرتی۔ میں نے تو بڑی مشکل سے ان سے اپنی جان بچائی۔ سارے دن وہ ہم لوگوں ہی میں رہے۔''

''مگر ہر ایک تو کہتا ہے کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے، اس لئے وہ لڑکیوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔''

''بھلے ہی ایسا ہو، مگر میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اس نے میری طرف بھی دیکھا۔ داروغہ جی کی لڑکی تانیا کی طرف بھی بلکہ کولبینو کی پاشا کو بھی معاف نہیں کیا... سچ تو یہ ہے کہ اس نے ایک لڑکی کو بھی نہیں چھوڑا، رسیا کہیں کا!''

''حیرت ہے! اچھا وہاں ان سب لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''یہی کہ وہ بہت اچھا آدمی ہے، رحم دل، خوش مزاج اور ہنس مکھہ، مگر اس میں ایک ہی خرابی ہے کہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے بہت پھرتا ہے، مگر میرے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں۔ عمر کے ساتھ یہ عادت خود بخود چھٹ جائے گی۔''

لیزا نے ٹھنڈی سانس بھری ''ہائے مگر میں اسے کس طرح دیکھوں؟''

''ارے یہ کونسی مشکل بات ہے؟ توگی لووو کونسا اتنا دور ہے؟ بس تین کوس ہی ہے۔ چاہو تو ٹہلتے ٹہلتے وہاں جا سکتی ہو یا گھوڑے پر چلی جاؤ کہیں نہ کہیں ضرور اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ روز صبح اپنی بندوق لے کر باہر نکل جاتا ہے۔''

''اری میں یہ کیسے کر سکتی ہوں؟ وہ سمجھے گا کہ میں اس سے ملنے کو مری جا رہی ہوں، اور پھر میرے اور اس کے والد کے تعلقات خراب ہیں، ہائے میں تو اس سے کسی طرح بھی نہیں مل سکتی... ارے ناستیا ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے... بتاؤں میں کیا کروں گی۔ دھقان لڑکی کا بھیس بدل کر چلی جاؤنگی۔''

"ہاں ہاں یہ ٹھیک رہیگا۔ ایک گاڑھے کا بلاؤز اور صرافان پہن لینا۔ اور بلا جھجھک توگی‌لووو چلی جانا۔ مجھے یقین ہے کہ بیرستوف تمھیں نظر انداز نہیں کریگا۔"

"اور میں دیہاتی بولی تو بول ہی سکتی ہوں۔ ناستیا، میری پیاری ناستیا، کیا مزے کی ترکیب سوجھی ہے۔" لیزا سونے گئی تو یہی ٹھان کر کہ اگلے دن ضرور اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنائیگی۔

چنانچہ اگلے دن بازار سے موٹا نیلے رنگ کا کھدر منگایا اور گلے میں لگانے کو پیتل کے بٹن۔ ناستیا کی مدد سے بلاؤز اور صرافان کاٹا اور سب ملازم لڑکیوں کو سلائی میں لگا لیا۔ شام تک سب چیزیں سل سلا کر تیار ہو گئیں۔ لیزا نے اپنے نئے کپڑے پہن کر شیشے میں دیکھا تو ماننا پڑا کہ یہ لباس اس پر بہت پھب رہا تھا۔ اس‌نے آزمائش کے طور پر دیہاتیوں کی طرح سر کو ادھر ادھر جھٹکا۔ ان مٹی کی بلیوں کی طرح جن کے سر ہلتے رہتے ہیں۔ اپنے ہاں کی دیہاتی بولی میں بات کرتے ہوئے ہنس کر آستین منہ پر رکھہ لی۔ اس کامیاب نقل کو ناستیا نے بالکل پاس کر دیا۔ مگر اب ایک اور مشکل تھی کہ صحن میں ننگے پاؤں پھرتے ہوئے نکیلی گھاس بری طرح اس کے پیروں میں چبھ رہی تھی اور بجری اور ریت نرم پاؤں میں بری طرح کاٹنے لگی تھی۔ اسوقت بھی ناستیا اس کے کام آئی۔ اس نے لیزا کے پاؤں کا ناپ لیا اور کھیت میں جاکر تروفیم چرواہے سے دیہاتی جوتے بنانے کو کہا۔ اگلے دن لیزا صبح ہونے سے پہلے اٹھ بیٹھی۔ گھر کے اور لوگ ابھی تک سو رہے تھے۔ ناستیا دروازے پر کھڑی چرواہے کا انتظار کر رہی تھی۔ اتنے میں گجر بجا اور گاؤں بھر کے مویشیوں کے گلے زمیندار کے گھر کے پاس سے گذرنے لگے۔ تروفیم نے جاتے ہوئے ناستیا کو ایک جوڑی شوخ رنگ کی جوتیاں دیں جس کے بدلے میں ناستیا نے پچاس کوپک ادا کئے۔ لیزا نے چپکے سے اپنے دھقانی کپڑے پہنے ناستیا کو مس جیکسن کے سلسلے

میں کچھ ہدایات دیں۔ اور پچھلی برساتی کی طرف سے نکل کر ترکاریوں کے باغ میں ہوتی ہوئی کھیتوں کی طرف نکل گئی۔

مشرق کی طرف پوپھٹ رہی تھی۔ آسمان پر بادل سنہری صفوں میں آراستہ سورج کا انتظار کر رہے تھے۔ گویا درباری زار کے منتظر ہوں۔ شفاف آسمان، صبح کی تازگی، شبنم کے موتیوں کی جگمگاہٹ، سویرے کی نرم ہوا، اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے لیزا کا دل طفلانہ خوشی سے بھر گیا۔ اس ڈر سے کہ کوئی جاننےوالا نہ مل جائے وہ زمین پر ایسے ہولے ہولے پیر رکھ رہی تھی کہ چلنے کی جگہہ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ درختوں کے اس جھنڈ تک پہونچی جو اس کے باپ کے علاقہ کی آخری حد پر تھا تو اس کے قدم سست پڑ گئے۔ اسے یہیں ٹھیر کر الکسی کا انتظار کرنا تھا... اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر یہی دھڑکن اور گھبراہٹ تو ہے جو جوانی کی نادان حرکتوں میں دلکشی کا رنگ بھرتی ہے۔ لیزا درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئی۔ وہاں ابھی تک دھندلکا باقی تھا۔ دبی دبی آوازیں جو کسی گہرائی میں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اس کے کانوں میں پڑیں۔ اس کی زندہ دلی دب سی گئی اور وہ رفتہ رفتہ شیریں خیالات میں گم ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی... مگر کون لکھ سکتا ہے کہ ایک سترہ سالہ دوشیزہ بہار کی ایک سنہری صبح کو درختوں کے جھنڈ میں پانچ یا چھ بجے کیا سوچ رہی ہوگی؟ وہ یوں ھی اپنے خیالات میں گم ایک پگڈنڈی پر چل رہی تھی جس کے دونوں طرف لمبے لمبے سایہ‌دار درخت تھے کہ اتنے میں ایک بڑھیا نسل کا کتا بھونکتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ لیزا گھبرا کر چیخی۔ عین اسی وقت ایک آواز سنائی دی ”بس چپ، سبوگار، ادھر،، اور ایک نوجوان شکاری جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ ”پیاری گھبراؤ نہیں، میرا کتا بھونکتا ہے کاٹتا نہیں،، اس نے لیزا کو مخاطب کرکے کہا۔ لیزا اب خوف زدہ نہ تھی۔ لیکن اس نے موقع سے

فائدہ اٹھا کر شرم اور ڈر کے ملے جلے جذبات ظاہر کرتے ہوئے کہا ''مگر جناب! مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے، دیکھئے نا کتنا ڈراؤنا کتا ہے، اگر پھر مجھ پر لپکا تو؟،، الکسی (امید ہے کہ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ اجنبی نوجوان کون تھا) نے دیہاتی دوشیزہ کو چند لمحے تک غور سے دیکھا۔ ''اگر تمھیں ڈر لگ رہا ہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں؟،، اس نے پوچھا۔ ''کیا تم مجھے اپنے ساتھ آنے کی اجازت دوگی؟،، ''کون کسی کو روک سکتا ہے؟،، لیزا نے اٹھلا کر کہا۔ ''سڑک تو سبھی کے چلنے کے واسطے ہے۔،، ''تم کہاں رہتی ہو؟،، ''پری لوچنو میں۔ میں واسیلی لوہار کی لڑکی ہوں اور یہاں سانپ چھتریاں جمع کرنے آئی تھی (لیزا ہاتھ میں ایک ٹوکری لٹکائے چلی آ رہی تھی)۔ اور جناب کیا توگی لوو سے آئے ہیں؟،، ''بالکل ٹھیک! میں چھوٹے سرکار کا ملازم خاص ہوں۔،، الکسی چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی سے برابر کی حیثیت سے ملے۔ لیزا اس کی طرف دیکھکر ہنسی اور بولی ''اوں ہوں آپ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے، مجھے پتہ ہے کہ آپ خود ہی چھوٹے سرکار ہیں۔،، ''یہ تمھیں کیسے پتہ چلا؟،، ''ہر بات سے۔،، ''مگر کس بات سے؟ ''واہ کیا نوکر اور مالک میں فرق کرنا مشکل ہے؟ تمہارے کپڑے اور طرح کے ہیں، تمہاری بات چیت جدا ہے اور تم نے کتے کو بلایا تو ہم لوگوں کی طرح نہیں بلایا۔،، الکسی کی نظروں میں لیزا کی دلربائی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گاؤں کی چنچل حسیناؤں سے بے تکلفی برتنے کا عادی تھا، چنانچہ اس نے لیزا کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا مگر لیزا اس تیزی سے پیچھے ہٹی اور اس کے چہرے پر اسقدر بےرخی اور رکھائی تھی کہ الکسی حیران رہ گیا۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور چھیڑ چھاڑ سے باز رہا۔ ''اگر آپ مجھ سے میل جول بڑھانا چاہتے ہیں،، لیزا نے بڑی دیدہ دلیری سے کہا ''تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔،، ''ارے واہ تم تو بڑی وہ نکلیں۔ تمھیں اس طرح بات کرنی کس نے

سکھائی؟،، اور الکسی ہنسنے لگا ''کیا ہماری دوست ناستنکا نے جو تمہاری مالکن کی خادمہ ہے، میں دیکھتا ہوں کہ عورتوں میں تعلیم کا چرچا عام ہو رہا ہے!،،
لیزا پچھتائی کہ اس نے اپنے پارٹ کے مطابق بات نہیں کی۔ چنانچہ اس نے بات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''مجھے ناستیا کیوں سکھاتی؟ کیا میں خود کبھی بڑی حویلی نہیں جاتی؟ وہاں ہر طرح کی بات دیکھتی سنتی ہوں... ارے اگر میں یوں کھڑی کھڑی باتیں کرتی رہی تو سانپ چھتریاں جمع ہوچکیں! سرکار آپ اب اپنے رستے جائیے اور میں اپنے رستے۔ سلام!،، لیزا نے جانے کو قدم بڑھایا تو الکسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور روکتے ہوئے کہا ''مجھے اپنا نام تو بتاتی جاؤ میری جان!،، ''اکولینا،، لیزا نے اپنی انگلیاں الکسی کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جانے دیجئے سرکار، اب گھر لوٹنے کا وقت ہو گیا۔،، ''اچھا اکولینا میں کسی دن تمہارے ابا سے ملنے آؤنگا۔،، ''ارے کہیں ایسا نہ کرنا غضب ہی ہو جائیگا۔ اگر گھر میں کسی کو پتہ چل گیا کہ میں کسی صاحب سے اکیلے جنگل میں باتیں کر رہی تھی تو میری شامت آ جائیگی۔ میرے بابا تو مار مار کے میری ہڈی پسلی ایک کر دینگے۔،، ''پھر تم سے کیسے ملوں؟،، ''میں پھر سانپ چھتریاں اکھٹی کرنے آؤنگی۔،، ''کب؟،، ''کیا پتہ کل ہی آجاؤں۔،، ''اکولینا! اگر کر سکتا تو اسوقت میں تمہیں ضرور پیار کرتا۔ اچھا کل ضرور آنا اسی وقت۔،، ''اچھا۔،، ''دیکھو مجھے دھوکہ نہ دینا۔،، ''نہیں۔،، ''اچھا قسم کھاؤ۔،، ''پاک صلیب کی قسم ضرور آؤنگی۔،،

اتنا کہہ کر دونوں جدا ہو گئے۔ لیزا جنگل سے نکل کر کھیتوں کو پار کرتی ہوئی اپنے باغیچے میں گھس گئی۔ اور وہاں سے سیدھی فارم پہونچی جہاں ناستیا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہاں پہنچکر کپڑے بدلتے ہوئے اس نے اپنی رازدار کے پرشوق سوالوں کے جواب تو دئے مگر جیسے کچھ کھوئی کھوئی ہو۔

کپڑے بدل کر جلدی جلدی گھر پھونچی تاکہ وقت پر ڈرائنگ روم میں پھونچ جائے۔ ناشتا میز پر لگ چکا تھا۔ مس جیکسن سویرے سویرے پاؤڈر لگائے کمر پیٹی سے کسے ڈبل روٹی کے پتلے پتلے توس کاٹ رہی تھیں۔ لیزا کے باپ نے اس کو سحر خیزی پر بہت شاباشی دی ''صحت کے لئے صبح سویرے اٹھہ کر سیر کرنے سے بڑھکر کوئی مفید چیز نہیں۔'' پھر انہوں نے انگریزی رسالوں سے اس کے ثبوت میں ایسی مثالیں سنائیں کہ جتنے لوگ سو سے زیادہ عمر کے ہوتے تھے وہ سب وودکا سے پرہیز کرتے تھے اور گرمی ہو یا جاڑا صبح سویرے اٹھتے تھے۔ لیزا نے ان سب باتوں پر ذرا دھیان نہ دیا۔ اس کے دماغ میں ابھی تک سویرے کی رومانی ملاقات کے واقعات گھوم رہے تھے۔ اکولینا اور نوجوان شکاری کی گفتگو کانوں میں گونج رہی تھی۔ مگر اب اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ بہتیرا وہ اپنے کو سمجھاتی کہ اس کے مذاق کا کوئی برا نتیجہ نہیں نکل سکتا، کہ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو شرافت سے گری ہوئی ہو مگر اس کا ضمیر اسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ سب سے زیادہ بےکلی اس بات کی تھی کہ وہ اتنی بڑی قسم کھا کر اگلے دن آنے کا وعدہ کر آئی تھی۔ وہ اپنی قسم توڑ دیتی مگر یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں الکسی اس کا انتظار کرکے سچ مچ لوھار کی لڑکی اکولینا کو ڈھونڈنے گاؤں میں نہ پھونچ جائے اور وھاں اگر اس نے اصلی بھدی موٹی چیچک رو اکولینا کو دیکھ لیا تو لیزا کی دھوکہ بازی کا حال اس پر کھل جائےگا۔ اس خیال سے وہ اتنی گھبرائی کہ اگلے دن پھر اکولینا بن کر جنگل کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ادھر الکسی پر ابھی تک اس تازہ ملاقات کا سرور چھایا ہوا تھا۔ دن بھر وہ اسی کے دھیان میں مست رہا اور رات کو خواب میں بھی وھی سانولی سلونی دل کش صورت نظر آتی رہی۔ اگلے دن صبح سویرے پوپھٹنے سے پہلے وہ کپڑے بدل کر تیار ہو گیا۔ بندوق بھرے

بغیر اس نے اپنے وفادار کتے سبوگار کو ساتھ لیا اور جائے ملاقات کی طرف تیزی سے روانہ ہوگیا۔ انتظار کا آدھا گھنٹہ کاٹنا پہاڑ ہو گیا۔ آخر جھاڑیوں میں سے نیلے صرافان کی جھلک دکھائی دی اور وہ اپنی پیاری اکولینا سے ملنے کو لپکا۔ الکسی کے پرجوش شکریہ کے جواب میں اکولینا مسکرائی۔ مگر الکسی نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور افسردگی کے آثار ہیں۔ وجہ پوچھی تو لیزا نے اقرار کیا کہ اس وقت اس کا یہاں آنا ٹھیک نہیں تھا۔ مگر وہ اپنی قسم پوری کرنے آئی۔ اور یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ آئندہ وہ اس سے ملنے نہ آ سکیگی۔ اس نے الکسی سے یہ بھی کہا کہ ایسی جان پہچان بڑھانے سے دونوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سب باتیں اس نے دیہاتی لہجے میں کہیں۔ مگر ایک سیدھی سادھی گاؤں کی لڑکی میں یہ احساسات اور جذبات بہت تعجب خیز تھے۔ الکسی بہت حیران ہوا اور اس نے اکولینا کو اس فیصلے سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس نے اسے اپنے ارادوں کی پاک بازی کا یقین دلایا کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرےگا جس پر اکولینا کو شکایت ہو۔ ہر معاملے میں اس کی خواهش پر سر جھکانے کو تیار رهیگا۔ صرف یہ کہ وہ اسے تنہائی میں ملنے کی مسرت سے محروم نہ کرے۔ ہر روز نہ سہی، ہر تیسرے دن یہ بھی نہیں تو هفته میں دو بار ھی سہی۔ اس کی گفتگو میں وفور جذبات کی وجہہ سے زور پیدا ہو گیا تھا اور اس وقت اسے یہی احساس تھا کہ وہ اکولینا سے سچی محبت کرتا ہے۔ لیزا چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رهی۔ ”اچھا مجھ سے وعدہ کرو،، بات ختم ہونے پر اس نے کہا ”کہ تم کبھی گاؤں میں جاکر میری جستجو نہ کروگے، نہ میرے بارے میں پوچھ گچھ کروگے۔ اور وعدہ کرو کہ سوائے ان موقعوں کے جب میں خود تم سے آکر ملوں مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کروگے۔،، الکسی صلیب کی قسم کھاکر وعدہ کرنے کو تیار تھا۔ مگر لیزا نے مسکراکر روک دیا۔ ”بس بس مجھے تمہاری

قسموں کی ضرورت نہیں۔ تمہاری زبان کا اعتبار ہے۔''
اس کے بعد دونوں دیر تک جنگل میں ٹہلتے رہے اور خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ آخرکار لیزا نے کہا ''اچھا اب میرے گھر جانے کا وقت ہو گیا۔'' وہ جدا ہو گئے۔ الکسی جب اکیلا رہ گیا تو وہ یہ سوچ کر حیران تھا کہ دو ھی ملاقاتوں میں اس دیہاتی حسینہ نے اس پر کیا جادو کر دیا۔ اکولینا سے اس کے تعلقات میں دلکش انوکھاپن تھا اور حالانکہ اس عجیب و غریب دیہاتی لڑکی کی شرطیں بہت سخت تھیں پھر بھی انہیں توڑنے کا خیال تک اس کے ذھن میں نہ آیا۔ اصل بات یہ تھی کہ بھیانک انگوٹھی، پراسرار خط اور فریب خوردہ انداز کے باوجود الکسی ایک سادہ دل جذباتی نوجوان تھا اور اس کا معصوم دل سیدھی سادھی خوشیوں میں مگن ہو جاتا تھا۔

اگر مجھے صرف اپنی دلچسپی منظور ہوتی تو یہاں نوجوان جوڑے کی محبت بھری پوشیدہ ملاقاتوں، ان کی روز افزوں پسندیدگی، ان کی رازداریوں، ان کے مشاغل اور ان کی گفتگو کا بہ تفصیل تذکرہ کرتا۔ مگر جانتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو اس میں لطف نہیں آئیگا۔ ایسی تفصیلات کچھ بے مزہ اور بےرنگ سی لگتی ھیں، اس لئے میں ان کا ذکر چھوڑکر بس اتنا کہونگا کہ دو مہینے کے اندر اندر الکسی کو لیزا سے بےپناہ عشق ہو گیا اور لیزا اگرچہ منہ سے نہ کہتی تھی مگر اس کے دل پر بھی محبت رفتہ رفتہ اثر کر رھی تھی۔ دونوں حال میں مست تھے اور مستقبل کے متعلق سوچتے ھی نہ تھے۔

بہت دفعہ ان کے دل میں مستقل اور پائیدار رشتہ قائم کرنے کا خیال گزرا۔ مگر دونوں اس کا ذکر ایک دوسرے سے کرتے ہوئے جھجھکتے تھے۔ اس کی وجہ سمجھنی کچھ مشکل نہیں۔ الکسی کو اکولینا سے سچا عشق تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے اور غریب دیہاتی لڑکی کے درمیان ناقابل عبور صحرا حائل تھے۔ اور لیزا جانتی تھی کہ اس کے اور الکسی کے باپ میں جو اختلاف چلا آتا تھا اس کے ختم ہونے کی کوئی امید نہیں۔ دوسری

طرف اس کا نسوانی پندار اس مبہم رومانی امید سے خوش ہوتا تھا کہ شاید ایک دن توگی‌لوو جاگیر کے وارث کو پری‌لوچنو لوہار کی لڑکی کے سامنے جھکنا پڑے۔ اور پھر ایک دن واقعات نے ایسا پلٹا کھایا جس سے ان دونوں کی حیثیت ایک دوسرے کی نظر میں بدل جانے کا امکان تھا۔

خزاں کی ایک خنک اور خوشگوار صبح کو (ہماری روسی خزاں میں ایسی صبحوں کی کمی نہیں) ایوان پتروویچ بیرستوف سواری کے لئے گھر سے نکلے۔ چلتے ہوئے احتیاطاً پانچ چھ شکاری کتے، اپنے سائیس اور کسانوں کے کچھ لڑکے جن کے پاس نقارے تھے ساتھ لے لئے۔ عین اسی وقت اچھا موسم دیکھکر گریگوری ایوانووچ موروسکی نے بھی گھوڑی کسنے کا حکم دیا اور اپنی انگریزی طرز کی جاگیر کا دورہ کرنے چل دئے۔ جب وہ جنگل کے نزدیک پہونچے تو انھوں نے اپنے پڑوسی کو نہایت طمطراق کے ساتھ گھوڑے پر سوار دیکھا۔ وہ اس وقت لومڑی کے کھال کی صدری پہنے ایک خرگوش کی تاک میں تھے جسے کسان لڑکے شور مچا مچاکر جھاڑیوں میں سے کھدیڑ رہے تھے۔ اگر گریگوری ایوانووچ کو اس مڈبھیڑ کا پہلے سے خطرہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیتے۔ مگر بیرستوف سے ان کا آمنا سامنا اسقدر اچانک ہوا جب وہ ایک دوسرے سے صرف ایک گولی فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ یورپ کے شہری اخلاقی اصولوں کے ماتحت موروسکی اپنے حریف کی طرف بڑھا اور اخلاق کے ساتھ اس سے علیک سلیک کی۔ اس کا جواب بیرستوف نے اتنی گرم جوشی سے دیا جیسے کوئی رسی میں بندھا ہوا بھالو اپنے آقا کی زبردستی سے امرا کو سلام کرے۔ عین اسی وقت خرگوش جنگل میں سے چھلانگ لگاکر برقی سرعت کے ساتھ کھیتوں کی طرف ہو لیا۔ بیرستوف اور اس کے سائیس نے پوری طاقت سے شور مچانا شروع کیا، کتوں کو چھوڑ دیا اور خود خرگوش کے تعاقب میں گھوڑے ڈال دئے۔ موروسکی کی

گھوڑی جو کبھی شکار کے لئے استعمال نہ ہوئی تھی اس شوروغل پر بدکنے لگی۔ موروسکی نے جو اپنے کو بڑا شہسوار سمجھتا تھا لگام میں ڈھیل دیدی اور خوش تھا کہ اسے اس ناخوشگوار مڈبھیڑ سے جلدی نجات مل گئی۔ مگر اس کی گھوڑی ایک کھائی کے کنارے پہونچ کر جو اسے پہلے نظر نہیں آئی تھی، الف ہو گئی۔ موروسکی گھوڑی کی پشت سے یخ بستہ زمین پر بری طرح گرا۔ اور اپنی دم کٹی گھوڑی کو بے نقط سنانے لگا جو اپنے سوار کو گراتے ہی ٹھہر گئی تھی۔ ایوان پترووچ گھوڑا دوڑا کر وہاں پہونچا اور گریگوری ایوانووچ سے خیریت پوچھنے لگا۔ اتنے میں اس کا سائیس مجرم گھوڑی کو لگام پکڑے وہاں لے آیا۔ اس نے موروسکی کو سہارا دیکر گھوڑے پر سوار کیا۔ بیرستوف نے اسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی اور موروسکی نے مجبوراً قبول کر لی۔ اور یوں بیرستوف فتحیاب اپنے گھر لوٹا کیوں کہ ایک خرگوش اور زخمی دشمن جو تقریباً جنگی قیدی کی طرح تھا اس کے ساتھ تھا۔

گھر پہنچ کر دونوں پڑوسیوں میں دوستانہ بات چیت ہونے لگی۔ موروسکی نے ناشتہ وہیں کیا اور بیرستوف سے اس کی گاڑی مانگی کیونکہ اس واقعہ کے بعد اس کے اعصاب اس قابل نہ تھے کہ اسی گھوڑی پر واپس اپنے ہاں جا سکے۔ بیرستوف اسے چھوڑنے دروازے تک آیا۔ جاتے جاتے موروسکی نے بیرستوف سے وعدہ لے لیا کہ وہ اگلے دن الکسی ایوانووچ کے ہمراہ اس کے ہاں ایک دوست کی طرح کھانا کھانے ضرور آئیگا اور یوں یہ پرانی دشمنی ایک دم کٹی گھوڑی کی بزدلی کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

لیزا دوڑتی ہوئی گریگوری ایوانووچ کو لینے آئی۔ ”کیا ہوا پاپا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ لنگڑا کیوں رہے ہیں؟ آپ کی گھوڑی کہاں ہے؟ اور یہ گاڑی کس کی ہے؟“ ”مائی ڈیر تم ہرگز بوجھ نہیں سکتیں کہ یہ کس کی گاڑی ہے“ گریگوری ایوانووچ کو انگریزی طرز خطاب بہت پسند تھا۔ انہوں نے پورا قصہ بہت تفصیل

سے لیزا کو سنایا۔ لیزا کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ابھی وہ اس حیرت‌ناک خبر سے سنبھلی نہ تھی کہ گریگوری ایوانووچ نے بتایا کہ بیرستوف اور اس کا بیٹا اگلے دن ان کے ہاں کھانے پر مدعو ھیں۔ ''ھیں؟ کیا سچ مچ؟'' لیزا کا رنگ اڑ گیا۔ ''بیرستوف باپ اور بیٹا دونوں کل ھمارے ھاں کھانے پر آئینگے؟ پاپا آپ چاھے جو کہیں میں ھرگز ان لوگوں کے سامنے نہ آؤنگی۔'' ''کیا پاگل ھوئی ھو؟ ایسی شرمیلی کب سے ھو گئیں؟ یا ناول کی ھیروئینوں کی طرح خاندانی دشمنی تم میں سرائت کر گئی ھے؟ مجھے اس قسم کی لغویات بالکل پسند نہیں۔'' ''نہیں پاپا، ھرگز نہیں، چاھے ادھر کی دنیا ادھر ھو جائے میں بیرستوف کے سامنے ھرگز نہ آؤنگی۔'' گریگوری ایوانووچ اچھی طرح جانتے تھے کہ لیزا کی مخالفت کرنا بیکار ھے۔ اسلئے وہ سر ھلاتے ھوئے یہ بحث چھوڑ کر اس دن کی یادگار سیر کے بعد آرام کرنے چلے گئے۔

لیزاویتا گریگوریونا اپنے کمرے میں گئی اور ناستیا کو بلایا۔ دونوں نے اگلے دن آنےوالے مہمانوں کے سلسلے میں ایک لمبی کانفرنس کی۔ مسئلہ یہ تھا کہ الکسی جب یہ دیکھیگا کہ نوجوان خاتون اور اسکی اکولینا ایک ھی ھیں تو وہ اپنے دل میں لیزا کے اخلاق و عادات، اس کی عفت مآبی اور اس کے اصولوں کے متعلق کیا سوچیگا۔ ساتھ ھی لیزا کا دل یہ بھی چاھتا تھا کہ اس اچانک ملاقات سے الکسی پر جو تاثرات ھوں وہ معلوم کر سکے۔ آخر اس کو ایک ترکیب سوجھی جو اس نے فوراً ناستیا کو بتا دی۔ دونوں بہت خوش تھیں اور چاھے کچھ ھو اپنی تجویز پر عمل در آمد کرنے کی ٹھان لی۔

اگلے دن گریگوری ایوانووچ نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ کیا وہ بیرستوف کے سامنے نہ آنے کے ارادہ پر قائم ھے۔ ''پاپا! اگر آپ کی خواھش ھے تو میں ان سے ملنے کو تیار ھوں۔ مگر ایک شرط پر اور وہ یہ کہ چاھے میں جس بھیس میں ان لوگوں کے سامنے آؤں اور چاھے جو کچھ کروں آپ مجھے ڈانٹیں گے نہیں۔ اور نہ ان لوگوں

کے سامنے ناراضگی یا حیرت کا اظہار کرینگے۔،، ''پھر کچھ شرارت سوجھی ہے،، گریگوری ایوانووچ نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اچھی بات ہے میں راضی ہوں جیسی تمہاری مرضی میری آہوچشم پگلی بیٹی۔،، یہ کہتے ہوئے اس نے لیزا کی پیشانی چومی اور وہ تیاریاں کرنے بھاگ گئی۔

ٹھیک دو بجے ایک گھریلو قسم کی گاڑی جس میں چھ گھوڑے جتے ہوئے تھے موروسکی کے دروازے میں داخل ہوئی اور سبز لان کے دائرے سے گزر کر برساتی میں رک گئی۔ موروسکی کے دو باوردی چوبداروں نے بیرستوف کو اعزاز کے ساتھ اتارا۔ بیٹا پیچھے پیچھے گھوڑے پر سوار تھا۔ دونوں باپ بیٹے کھانے کے کمرے میں پہونچے جہاں کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ موروسکی اپنے سہمانوں کے ساتھ بہت تواضع اور اخلاق کے ساتھ پیش آیا۔ بجری بچھے ہوئے صاف ستھرے راستوں پر سے گزر کر وہ ان کو اپنا باغ اور چڑیاخانہ دکھانے لے گیا جنہیں دیکھکر بیرستوف دل ہی دل میں ناخوش ہو رہا تھا کہ نہ جانے کتنی محنت اور وقت اس قسم کے فضول شوق میں ضائع ہوا ہوگا مگر اخلاقاً منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس کا بیٹا نہ تو اپنے کفایت شعار باپ کی طرح ناخوش تھا اور نہ اپنے انگریز پرست میزبان کی طرح ان چیزوں کا پرجوش مداح۔ وہ اس وقت نہایت اشتیاق سے میزبان کی بیٹی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا جس کے متعلق اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اور گو وہ اپنا دل اکولینا کو دے چکا تھا پھر بھی ایک نوجوان حسین لڑکی کا خیال اس کے تخیل میں ہیجان پیدا کر رہا تھا۔

تینوں کے تینوں واپس آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ دونوں بوڑھے پرانے وقتوں کو یاد کرنے لگے۔ اور اپنی اپنی فوجی زندگی کے قصے سنانے لگے۔ الکسی سوچ رہا تھا کہ لیزا کے سامنے وہ کیا انداز اختیار کرے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ تغافل آمیز بے اعتنائی کا رویہ سب سے مناسب رہیگا۔ دروازہ کھلا، اس نے نہایت توہین آمیز

بے نیازی کے ساتھ منہ موڑ کر اس طرح دیکھا کہ شوخ سے شوخ سنگدل حسینہ کا دل بھی ایک بار دھڑکنے لگتا۔ مگر بدقسمتی سے یہ لیزا نہیں مس جیکسن تھی جو پیٹی سے کمر کسے پاؤڈر لگائے نگاھیں جھکائے کمرے میں داخل ھوئیں اور مہمانوں کے سامنے ناز و انداز سے سلام کرکے بیٹھ گئیں۔ بیچارے الکسی کی معرکہ خیز تیاری اکارت گئی۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے نہ پایا تھا کہ دروازہ پھر کھلا، اور لیزا کمرے میں داخل ھوئی۔ سب کھڑے ھو گئے، باپ مہمانوں کا تعارف کرانا چاھتا تھا کہ ایکدم چپ ھوکر ھونٹ کاٹنے لگا۔ لیزا، اس کی سلونی بیٹی لیزا کانوں تک پاؤڈر سے سفید ھو رھی تھی گویا مس جیکسن کا مقابلہ کرنے آئی ھو۔ لوئی چہار دھم کی طرح مصنوعی بالوں کی گھونگھر یالی لٹیں جو اس کے اصلی بالوں سے بہت ھلکے رنگ کی تھی شانوں پر لہرا رھی تھیں۔ چوڑی چوڑی خبطیوں جیسی آستینیں جیسے مادام پامپودور کے سائے کی ھوں۔ کمر لیس سے اسقدر کس کر باندھی تھی کہ جسم کی وضع انگریزی حرف ''ایکس،، جیسی ھو گئی تھی۔ ماں کے وہ ھیرے جواھرات جو رھن ھونے سے بچ رھے تھے انگلیوں، گلے اور کانوں میں چمک رھے تھے۔ الکسی اس بھڑکیلی مضحکہ خیز لڑکی میں اپنے اکولینا کو نہ پہچان سکا۔ باپ نے اور پھر اس کی دیکھا دیکھی بیٹے نے مجبوراً لیزا کے ھاتھ کو ھونٹوں سے چھوا تو الکسی نے لیزا کی نازک انگلیوں میں کچھ ارتعاش سا محسوس کیا۔ اور عین اسی وقت ایک چھوٹے سے حسین پاؤں کی جھلک دیکھی جو شاید انتہائی دلکش جوتیوں کی نمائش کرنے کے لئے سامنے نظر آ رھے تھے۔ پاؤں دیکھکر الکسی کے ذوق حسن کو کچھ تسکین ملی، اور اس نے لیزا کے لباس کی بدمذاقی کو کسی حد تک بخش دیا۔ رھی پاؤڈر سرخی تو وہ اس معاملے میں اتنا ناتجربہ کار اور معصوم تھا کہ شروع میں تو اس نے دیکھا ھی نہیں اور بعد میں بھی اسے یہ شبہ نہیں گزرا کہ لیزا اتنا پاؤڈر تھوپے ھوئے ھے۔

گریگوری ایوانووچ اپنا وعدہ نبھانے کے لئے خاموش رہے۔ انہوں نے اپنے چہرے سے حیرت کا اظہار نہ ہونے دیا۔ مگر ان کو اپنی بیٹی کی شرارت پر اتنی ہنسی آ رہی تھی کہ سنجیدہ چہرہ بنائے رکھنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ دوسری طرف محتاط انگریز عورت دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ فوراً سمجھ گئی تھی کہ پاؤڈر سرخی اسی کی ڈریسنگ ٹیبل سے اڑائی گئی ہے۔ پاؤڈر لگے ہوئے چہرے کی مصنوعی سفیدی کے نیچے اس کا رنگ غصے سے عنابی ہو گیا۔ اس نے نوجوان ملزمہ کی طرف غصے بھری نگاہ سے دیکھا۔ لیزا نے ظاہر کیا گویا وہ ان کا مطلب سمجھی ہی نہیں۔ جانتی تھی کہ بعد میں تو جواب دہی کرنی ہی ہوگی۔

سب لوگ میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ الکسی سوچ میں ڈوبے ہوئے بے خیال نوجوان کا پارٹ کھیلتا رہا۔ لیزا بناوٹ سے مسکراتی رہی، وہ دانت بھینچ کر گنگناتی ہوئی آواز میں صرف فرنچ میں بات کر رہی تھی۔ اس کا باپ باربار اس کی طرف دیکھتا تھا۔ اگرچہ یہ بھید اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر وہ اپنی بیٹی کی شرارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ انگریز عورت غصے کے مارے گونگی ہو گئی تھی۔ صرف ایوان پتروویچ ان سب معاملات سے بے خبر بڑے مزے میں تھے، انہوں نے تقریباً دو آدمیوں کے برابر کھانا کھایا۔ دل بھرکر شراب پی اور خود اپنے مذاقوں پر ہنستے رہے۔

آخر میز پر سے اٹھنے کا وقت ہو گیا۔ مہمان رخصت ہوئے، پہلے تو گریگوری ایوانووچ دل بھرکر ہنستے رہے، پھر لیزا سے پوچھا ''آخر تم نے ان لوگوں کو کیوں بیوقوف بنایا؟ اور ایک بات اور یہ ہے کہ پاؤڈر تمہارے بہت اچھا لگتا ہے، میں عورتوں کے بناؤ سنگھار کے معاملے میں کچھ نہیں جانتا، پھر بھی میں اگر تمہاری جگہہ ہوتا توآج ہی سے پاؤڈر کا استعمال شروع کر دیتا۔ زیادہ نہیں بس تھوڑا تھوڑا۔،، لیزا اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ مارے خوشی کے باپ کے گلے سے لپٹ

گئی اور وعدہ کیا کہ ان کی پاؤڈر والی صلاح پر غور کریگی۔ پھر وہ ناراض مس جیکسن سے معذرت کرنے گئی۔ انہوں نے مارے غصے کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔ باہر ہی سے لیزا نے کہا کہ اجنبی لوگوں کے سامنے اپنا سانولا رنگ دکھاتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔ مگر ان سے پاؤڈر مانگنے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی، اسی لئے اسے یقین ہے کہ عزیز مس جیکسن اس کی اس گستاخی کو ضرور معاف کر دینگی وغیرہ وغیرہ۔ جب مس جیکسن کو یقین ہو گیا کہ لیزا کا ارادہ ان کا مذاق اڑانے کا نہیں تھا تو کچھ ٹھنڈی پڑیں، لیزا کو پیار کیا اور اپنی خوشنودی کے ثبوت میں انگریزی کریم کی ایک شیشی اسے دی جسے لیزا نے پرخلوص شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگلے دن لیزا کس قدر بےچینی کے ساتھ الکسی سے ملاقات کرنے پہونچی ہوگی۔ ''کل آپ سرکار کے گھر گئے تھے؟'' لیزا نے الکسی سے ملتے ہی پوچھا۔ ''آپ کو کیسی لگیں ہماری بٹیا سرکار؟'' الکسی نے جواب دیا ''میں نے تو اچھی طرح دیکھا نہیں۔'' ''چہ! چہ!'' لیزا نے افسوس ظاہر کرتے ہو کہا۔ ''کیوں؟'' الکسی نے پوچھا۔ ''اس لئے کہ میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کیا وہ ٹھیک ہے؟'' ''لوگ کیا کہتے ہیں؟'' ''لوگ کہتے ہیں... کہ... کہ... میری صورت ان سے ملتی ہے!'' ''بالکل بکواس کہاں تم اور کہاں وہ! وہ تو بہت عجیب صورت کی ہے۔'' ''توبہ، توبہ، آپ بھی کیا بات کرتے ہیں، وہ تو اتنی گوری، آتنی خوب صورت، اتنی فیشن ایبل ہیں۔ بھلا میرا اور ان کا کیا مقابلہ۔'' الکسی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ دنیا بھر کی گوری چٹی لڑکیوں سے کہیں زیادہ گوری تھی۔ اسے اور بھی یقین دلانے کو اس نے اس کی آقازادی کا ایسا مضحکہ خیز نقشہ کھینچا کہ لیزا ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ''پھر بھی''

اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''ممکن ہے کہ بٹیا سرکار ایسی ہی ہنسی کے قابل ہوں جیسا آپ کہتے ہیں۔ مگر میں تو بالکل جاہل گنوار ہوں ان کے مقابلے میں، نہ پڑھی نہ لکھی۔،، الکسی نے کہا ''اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا تمہیں یہی فکر ہے؟ اگر تم چاہو تو میں تمہیں ابھی پڑھانا شروع کر دوں۔،، ''سچ مچ،، لیزا نے بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کوشش تو کر دیکھوں۔،، ''ہاں ضرور! لاؤ ابھی شروع کر دیں۔،، دونوں بیٹھ گئے۔ الکسی نے جیب سے پنسل اور نوٹ بک نکالی اور اکولینا کو حرف تہجی بتائے جو اس نے بہت ہی تھوڑی دیر میں پہچان لئے۔ الکسی اس تیزی پر حیران رہ گیا۔ اگلے دن اس نے لکھنا سیکھنے کی خواہش ظاہر کی، شروع شروع میں تو وہ اناڑیوں کی طرح پنسل پکڑتی رھی۔ مگر کچھ دیر بعد خاصے اچھے حروف بنانے لگی۔ ''حدہے،، الکسی نے کہا۔ ''کہتے ہیں کہ لنکاسٹر سسٹم کے ذریعہ بہت جلدی لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ مگر تم تو اس سے بھی زیادہ تیزی سے سیکھ رہی ہو۔،، تیسرے روز اکولینا اس قابل ہو گئی کہ اس نے ھجے کر کے اتنا پڑھ لیا ''نتالیا، بیار کی بیٹی،،، بیچ بیچ میں وہ ایسی رائے زنی بھی کرتی جاتی تھی جس پر الکسی کو انتہائی تعجب تھا۔ پھر اسنے ایک پورے صفحے پر اسی ناول میں سے محاورے نقل کر ڈالے۔

یوں ہی ایک ھفتہ اور گزر گیا، اب دونوں میں باقاعدہ خط وکتابت ہونے لگی۔ ان کا پوسٹ آفس ایک قدیم بلوط کے درخت کی کھوکھ تھی۔ ناستیا پوشیدہ طور پر ڈاکیہ کی خدمات انجام دے رھی تھی۔ الکسی بڑے بڑے حرفوں میں لکھے ہوئے خط بلوط کی کھوکھ میں آکر ڈال جاتا، اور وہاں اس کو معمولی نیلے کاغذ پر اپنی محبوبہ کے ہاتھ کا ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا ہوا خط ملتا۔ مگر اکولینا کا انداز تحریر دن بدن بہتر ہوتا گیا اور لگتا تھا کہ اس کا ذہن بھی بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

اسی دوران میں ایوان پترووچ بیرستوف اور گریگوری ایوانووچ موروسسکی میں جو نئے تعلقات قائم ہوئے تھے دن بدن زیادہ استوار ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ موروسسکی اکثر سوچتا کہ ایوان پترووچ کے بعد اس کی ساری جائیداد الکسی ایوانووچ کو ملے گی اور ایک دن وہ اس علاقہ کا سب سے بڑا جاگیردار ہوگا۔ کیوں نہ وہ اس سے اپنی لیزا کی شادی کر دے۔ دوسری طرف بوڑھے بیرستوف نے اپنے دل میں سوچا کہ مان لیا اس کا پڑوسی کچھ خبطی سا ہے (مثلاً اس کو ہر انگریزی چیز کا جنون ہے)۔ لیکن اس میں بعض خوبیاں بھی ہیں۔ مثلاً غیرمعمولی اپچ، پھر یہ کہ وہ کاؤنٹ پرونسکی کا قریبی عزیز تھا، جو ایک ممتاز اور بارسوخ آدمی تھا۔ اور کاؤنٹ کی وجہ سے الکسی کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اور موروسسکی (بیرستوف نے سوچا) میرے لڑکے سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے میں فائدہ سمجھیگا۔ کچھ عرصہ تکه دونوں بوڑھے الگ الگ یہی ایک بات سوچتے رہے، لیکن آخر ایکدن دونوں نے اپنے دل کی بات ایک دوسرے کو بتا دی، دونوں گلے ملے اور وعدے وعید ہو گئے کہ اس معاملے پر پوری طرح غور کرینگے۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر اس مہم کو شروع کیا۔ موروسسکی ذرا فکرمند تھا کیونکہ اس کی بیٹسی اور الکسی اس دن کی یادگار کی دعوت کے بعد ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف کچھه راغب نہیں۔ کیونکه اس دن کے بعد الکسی پھر کبھی پری‌لوچنو نہ آیا، اور جب کبھی ایوان پترووچ ان کے ہاں آتے تو لیزا فوراً اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ مگر گریگوری ایوانووچ نے سوچا کہ اگر الکسی روزانہ یہاں آئے تو بیٹسی کو یقیناً اس سے عشق ہو جائیگا۔ کیونکه یہ قدرتی بات ہے بس وقت چاہئے۔

ایوان پترووچ کو اپنی تجویز کی کامیابی کا زیادہ یقین تھا، چنانچہ انہوں نے اسی دن اپنے بیٹے کو مطالعے کے کمرے میں بلایا، پائپ سلگا کر تھوڑے سے وقفے

کے بعد کہا ''کیوں الکسی! کیا بات ہے پچھلے دنوں سے تم نے فوج میں جانے کا ذکر چھوڑ دیا، کیا اب تمہیں فوجی وردی پہننے کی بالکل آرزو نہیں رہی؟''

''جناب'' الکسی نے بڑے ادب سے جواب دیا ''کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ میرا فوج میں جانا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دوں۔'' ''یہ تو بہت سعادتمندی کی بات ہے'' ایوان پتروچ نے کہا۔ ''آج مجھے یقین ہو گیا کہ تم نہایت فرمانبردار بیٹے ہو اور مجھے اس خیال سے بڑی مسرت ہوئی۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں سرکاری ملازمت میں بھیجنے پر اصرار کروں... اسلئے فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ تم شادی کر لو۔''

''آپ کس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں جناب؟'' الکسی نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔

''لیزاویتا گریگوریونا موروموسکایا سے'' ایوان پترووچ نے جواب دیا۔ ''وہ اچھا انتخاب ہے نا؟''

''مگر ابا جان میرا تو فی الحال شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''تمہیں خیال نہیں ہے اسی لئے تو مجھے خیال کرنا پڑا۔''

''مگر جناب مجھے تو لیزا موروموسکایا بالکل پسند ہی نہیں ہے۔''

''اس وقت پسند نہیں ہے تو شادی کے بعد پسند آ جائے گی، سب عادت کی بات ہے۔''

''مجھ سے شادی کرکے وہ خوش نہیں رہ سکتی۔''

''خیر اس کی خوشی کی پروانہ کرو... مگر اس کا مطلب؟ کیا تمہیں اپنے باپ کی مرضی کا اتنا ہی پاس ہے؟ شرم کرو۔''

''آپ چاہے جو کہیں میں شادی کرنا نہیں چاہتا، اور کسی صورت میں اس پر راضی نہیں ہو سکتا۔''

''تمہیں راضی ہونا پڑیگا۔ ورنہ یاد رکھو تم میری بددعاؤں سے پنپ نہ سکوگے، اور قسم ہے پروردگار کی

کہ میں ساری جائیداد بیچ کھوچ کر سب روپیہ اڑا دونگا، اور تمہارے لئے ایک کوپک بھی نہ چھوڑونگا۔ میں تمہیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ جاؤ! اور تین دنوں تک میری نظروں سے دور رہو۔،،

الکسی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے باپ کے دل میں کوئی بات بیٹھ جائے تو اسکو بقول تاراس سکوتی‌نن کیل سے ٹھوک کر بھی باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ مگر الکسی بھی اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ وہ بھی اپنی بات سے ہٹنےوالا نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہاں جاکر والدین کی سخت گیری، لیزاویتا گریگوریونا کی شخصیت اور باپ کی اس دھمکی پر کہ وہ اسے قلاش فقیر بنا دیگا غور کرنے لگا۔ آخر میں اس کے خیالات اکولینا پر مرکوز ہو گئے۔ اور پہلی دفعہ اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس سے انتہائی عشق کرتا تھا۔ ایک غریب دیہاتی لڑکی سے شادی کرکے اپنی محنت مزدوری کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کا خیال اسے نہایت رومانی معلوم ہوا، جتنا زیادہ وہ اس منصوبے پر غور کرتا اتنا ہی اسے یہ خیال صحیح معلوم ہوتا۔ کچھ دن سے جنگل میں ہونےوالی ملاقاتیں بارشوں کی وجہ سے رکی ہوئی تھیں۔ اس نے اکولینا کے نام ایک خط لکھا، جس میں بہت صاف صاف مگر انتہائی پریشانی کے لہجے میں ان واقعات کی اطلاع تھی۔ آخر میں اس نے اکولینا سے شادی کی درخواست کی تھی۔ وہ اس خط کو کھوکھلے بلوط کے درخت میں ڈال آیا اور مطمئن ہوکر سو گیا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے مورومسکی کے ہاں گیا تاکہ ان سے صاف صاف بات کر سکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مورومسکی کی فطری فیاضی کو متاثر کرکے انہیں اپنا طرفدار بنا لیگا۔ ”کیا گریگوری ایوانووچ گھر پر ہیں؟،، اس نے پری‌لوچنو میں کوٹھی کی برساتی کے سامنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے پوچھا۔ ”جی نہیں حضور،، نوکر نے جواب دیا۔ ”گریگوری ایوانووچ صبح سویرے ہی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔،، ”یہ تو بڑی

بری بات ہوئی،، اس نے سوچا۔ ''اچھا کیا لیزاویتا گریگوریونا گھر پر ہیں؟،، ''جی ہاں۔،، الکسی گھوڑے پر سے کودا اور اس کی لگام نوکر کو پکڑا کر بغیر اطلاع بھجوائے اندر چلا گیا۔

''سب فیصلہ ابھی ہو جائیگا،، اس نے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ ''میں خود ان صاحبہ ھی سے بات چیت کر لونگا۔،، وہ کمرے میں داخل ہوا اور کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ کیونکہ لیزا... نہیں، اکولینا... اس کی پیاری زیتونی رنگ‌والی اکولینا نیلے صرافان کی جگہ سفید لباس میں کھڑکی کے پاس بیٹھی اس کا خط پڑھ رہی تھی۔ اور اتنی محو تھی کہ اس نے الکسی کے آنے کی چاپ تک نہیں سنی۔ الکسی کے منہ سے خوشی کے مارے چیخ نکل گئی۔ لیزا نے چونک کر سر اٹھایا اور چیخ مار کر بھاگنا چاہتی تھی کہ الکسی نے زبردستی روک لیا۔ ''اکولینا! اکولینا۔،، لیزا اپنے کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور فرنچ میں کہے جا رہی تھی۔ ''کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں جناب! میں تو میں ہوں...،، ''اکولینا! اکولینا میری جان،، وہ برابر کہے جا رہا تھا۔ اور اس کے ھاتھوں کو بیساختہ چوم رہا تھا۔ مس جیکسن جو یہ سین دیکھ رہی تھیں، بدحواس تھیں کہ کیا کریں کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور گریگوری ایوانووچ داخل ہوئے۔

''اوھو!،، انہوں نے خوش ہوکر کہا ''اچھا تو معاملہ آپ لوگوں نے اپنے ھاتھ میں لے لیا۔،،

ناظرین اب مجھے کہانی کا انجام بیان کرنے کے فضول کام سے معاف فرمائیں۔

۱۸۳۰ء

(ایوان بیلکن کی کہانیوں کا خاتمہ)

حکم کی بیگم

''حکم کی بیگم کا مطلب ہے
من کا کھوٹ۔''
فال کی نئی کتاب

— ۱ —

سردی کے دنوں میں وہ لوگ اکٹھے ہوئے
اور شام سے تا صبح لگاتے رہے بازی
ڈوبے کبھی، ابھرے کبھی، جیتے کبھی ہارے
جو لوگ اکٹھے ہوئے
سردی کے دنوں میں
ہر بار وہاں چاک سے لکھی گئیں رقمیں
ہر بار وہاں تاش پڑے سارے کے سارے
یہ کام تھا ان کا
جو لوگ اکٹھے ہوئے
سردی کے دنوں میں

تاش چل رہا تھا۔ سوار گارد نروسوف کے مکان میں بازی جمی ہوئی تھی۔ سردیوں کی لمبی رات ایسے گزر گئی کہ اس کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی۔ صبح کے پانچ بجے یہ لوگ رات کا کھانا کھانے بیٹھے۔ جو لوگ جیتے تھے انھوں نے خوب مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ باقی

لوگ اپنی خالی پلیٹوں کے سامنے منہ لٹکائے سوچ میں بیٹھے رہے۔ مگر جب میز پر شمپین لگائی گئی تو باتیں چھڑ گئیں اور باتوں میں جان پڑ گئی سب اس میں حصہ لینے لگے۔

میزبان نے سورین سے پوچھا ''کہو تمہارا کیا رہا؟''

''حسب معمول ہار گیا میں۔ اب ماننا ہی پڑیگا کہ اپنی قسمت چکر میں ہے۔ میں معمولی بازی لگاتا ہوں۔ جوش میں نہیں آتا۔ بہت سنبھال سنبھال کے چال چلتا ہوں۔ پھر بھی ہار کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔''

''تم میں کبھی لہر نہیں آتی، کبھی خواہش نہیں ہوتی کہ لاؤ بڑھ کے بازی لگائیں؟.. بھئی تمہاری ثابت‌قدمی پر حیرت ہوتی ہے مجھے۔''

''مگر یہ ہرمان بھی خوب ہے'' مہمانوں میں سے ایک شخص نے انجنیر رجمنٹ کے ایک نوجوان افسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بھلے آدمی نے ساری عمر کبھی تاش ہاتھ تک میں نہیں لیا۔ بازی ڈبل نہیں کی۔ اور صبح پانچ بجے تک ہمارے پاس بیٹھا صرف کھیل دیکھتا رہا!''

''کھیل میں میرا جی لگتا ہے'' ہرمان بولا ''لیکن بات یہ ہے کہ میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ ضروری کو فالتو کی امید میں قربان کر دوں۔''

''ہرمان جرمن ہے۔ چنانچہ بہت چوکنا رہتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے اور کیا!'' تومسکی نے جملہ کسا۔ ''اگر کوئی میری سمجھ سے باہر ہے تو وہ ہے میری دادی، نواب زادی آننا فیدوتوونا۔''

''کیا کہا؟ کیا بات ہوئی؟'' مہمانوں نے زور سے کہا۔

''میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا ہے کہ بھلا، یہ کیا قصہ ہے، میری دادی ہرگز جوا نہیں کھیلتیں۔'' تومسکی بولا۔

''تو بھلا، اس میں تعجب کی کیا بات ہوئی کہ ایک اسی برس کی بوڑھی خاتون جوا نہیں کھیلتی ہیں؟'' نروموف نے کہا۔

"تو اچھا، کیا آپ کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟"

"نہیں — سچ، کچھ بھی معلوم نہیں!"

"اچھا تو سنئے:

"پہلے تو آپ یہ جان لیجئے کہ میری دادی اماں اب سے ساٹھ برس پہلے پیرس تشریف لے گئی تھیں۔ وہاں ان کے حسن کی دھوم مچ گئی۔ لوگ ان کے پیچھے سائے کی طرح پھرتے تھے کہ ایک نظر la Vènus moscovite * کو دیکھ لیں۔ رشیلئو ان کے حسن کا دیوانہ ہو گیا اور دادی اماں قسم کھا کے کہتی ہیں کہ انہوں نے اس کے ساتھ اتنی بےمروتی اور رکھائی برتی کہ وہ خود کشی کرتے کرتے رہا۔

"اس زمانے میں بیگمات کا دستور تھا کہ وہ "فارو" کھیلا کرتی تھیں۔ ایک دن جب محل میں تاش کی بازی ہو رہی تھی دادی اماں هارتی چلی گئیں اور ڈیوک آف ارلیان کی بڑی رقم ان پر چڑھ گئی۔ وہ ادائگی کا وعدہ کرکے گھر واپس آئیں۔ چہرے سے سرمے کے مصنوعی تل چھڑانا شروع کئے اور ٹرا گھیردار اسکرٹ اتارتے ہوئے انہوں نے دادا ابا کو اپنے بازی هارنے کا قصہ سنایا اور حکم جاری کیا کہ یہ رقم ادا کر دی جائے۔

"مرحوم دادا ابا، جہاں تک مجھے یاد ہے، دادی اماں کے سامنے ایک قسم کے خواجہ‌سرا لگتے تھے۔ وہ اپنی بیگم سے ایسا ڈرتے تھے جیسے کوئی شعلے سے ڈرتا ہے، لیکن جیسے هی هار کی زبردست رقم ان کے کان میں پڑی وہ غصے میں آپے سے باهر ہو گئے۔ انہوں نے فرد حساب اٹھائی اور دادی اماں کو دکھایا کہ دیکھئے پچھلے چھہ مہینے میں هم لوگ ۵ لاکھ کی رقم خرچ کر چکے هیں۔ اور یہاں پیرس میں کوئی ماسکووالے یا سراتوف والے گاؤں گراؤں نہیں رکھے ہوئے هیں کہ ادائگی ہو جائے گی۔ اور رقم ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

---

* ماسکو کی زهره۔

دادی اماں بگڑ گئیں، انہوں نے دادا ابا کے گال پر ایک ہلکاسا طمانچہ رسید کیا اور خواب گاہ میں اکیلی سو گئیں۔ ناراضگی دکھانے کے لئے دادا ابا کو اپنی خواب گاہ میں بھی نہیں گھسنے دیا۔

''دوسرے دن انہوں نے یہ سوچ کر شوہر کو بلوایا کہ گھریلو سزا کا ان پر اثر ہوا ہوگا۔ لیکن دیکھا کہ دادا ابا کی ہٹ اب بھی اسی طرح قائم ہے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے شوہر سے بحثا بحثی اور صفائی اور وضاحت کی۔ دادی اماں نے انہیں بڑی غیرت دلائی کہ دیکھئے، قرضے قرضے میں بھی فرق ہوتا ہے اور آپ کو سوچنا چاہئے کہ ایک راجکمار، ایک ڈیوک اور معمولی سے گاڑی بنانے والے میں کیا فرق ہے۔ مگر کہاں! سب بیکار، دادا ابا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کی ایک نہیں، ویسی ہی قائم رہی۔ اب دادی اماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے!

''ان کی جان پہچان کے لوگوں میں ایک نہایت زبردست شخص تھے۔ آپ لوگوں نے امیر کبیر سن ژرمین کا نام تو سنا ہوگا، جن کے بارے میں بہت سی عجیب عجیب حیرت انگیز باتیں مشہور ہیں۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اپنے ''ابدی یہودی،، * ہونے کا دعوا کیا تھا۔ ''اکسیر حیات،، دریافت کرنے اور ''سنگ فلاسفہ،، وغیرہ ایجاد کرنے کی روایت ان کے بارے میں زبان زد ہے۔ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ وہ ایک نیم حکیم ہیں۔ اور کازانووا نے اپنی یاد داشت میں یہ بھی لکھا ہے کہ سن ژرمین اصل میں جاسوس تھا۔ غرض کہ ان تمام اسرار و رموز کے باوجود اسکی ہستی اپنی وضع قطع اور طور طریق سے بڑی پرکشش تھی اور وہ عام طور سے لوگوں کے

---

* یہاں پوشکن نے ''ابدی یہودی،، لکھا ہے جس کے متعلق روایت ہے کہ یسوع مسیح کی توہین کرنے کی پاداش میں اسے ہمیشہ ہمیشہ زمین کے چکر کاٹتے رہنا پڑے گا۔ (مترجم)

ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ میری دادی اماں تو آج کے دن تک سن ژرمین سے بےپناہ محبت و عقیدت رکھتی ہیں۔ اور انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے اگر کوئی سن ژرمین کا نام بےعزتی سے لے۔ دادی اماں کو پتہ تھا کہ سن ژرمین کے پاس بڑی رقم پڑی ہوئی ہے اور وہ اسے جیسے چاہے خرچ کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس شخص کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے ایک پرزہ لکھا اور درخواست کی کہ وہ فوراً ان سے مل جائے۔

''وہ خرانٹ شعبدہباز فوراً دادی اماں کے بلاوے پر آیا اور دیکھا کہ وہ نہایت غمگین ہیں۔ دادی اماں نے اس کے سامنے اپنے شوہر کی بے دردی کی ایک نہایت بھیانک کلوٹی تصویر پیش کی اور کہا کہ اب میری لاج صرف آپ ہی کی دوستی اور مروت کے ہاتھ ہے۔

''سن ژرمین نے ذرا غور کیا اور بولا 'دیکھئے، جہاں تک رقم کا سوال ہے، یہ رقم تو میں آپ کو دے سکتا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ آپ کو اس وقت تک کل نہیں پڑے گی جب تک کہ آپ میری رقم مجھے واپس نہ کردیں گی۔ اور میں آپ کو نئی فکروں میں مبتلا کرنا چاہتا نہیں۔ اس لئے سوچتا ہوں کہ ایک اور بیچ کی سبیل بھی ہے۔ آپ کی رقم کھیل میں ادا ہو جائے گی۔،

'' 'مگر نواب صاحب!، دادی اماں نے کہا 'دیکھئے نا، میں آپ سے کہہ چکی کہ ہمارے پاس اس وقت روپیہ نہیں ہے۔، مگر سن ژرمین فوراً بولا 'آپ کو روپے کی ضرورت بھی کیا ہے! اتنی اجازت دیجئے کہ میں اپنی بات پوری کر لوں۔، یہ کہہ کر نواب نے دادی اماں کے سامنے ایک ایسے راز کا انکشاف کیا جس کے لئے ہم میں سے ہر شخص بہت کچھ دینے کے لئے تیار ہو جاتا...،،

اب تو نوجوان جواریوں کی توجہ دو گنی ہو گئی۔ تومسکی نے پائپ سلگا لیا اور کش کھینچ کر قصہ آگے بڑھایا:

"اسی شام کو میری دادی اماں وارسیلز میں au jeu de la Reine * پہنچیں - ڈیوک آف ارلیان نے پتے بانٹے - دادی اماں نے پہلے تو معذرت کی کہ وہ قرض کی رقم ساتھ نہیں لا سکیں - اور اس معذرت کے ساتھ انہوں نے کوئی چھوٹا سا من گھڑت قصہ سنا دیا - اور اس کے بعد ڈیوک کے مقابلے پر کھیلنا شروع کر دیا - انہوں نے تین پتے اٹھا لئے - اور یکے بعد دیگرے چل دئے - تینوں پتوں سے وہ جیتتی چلی گئیں - اور اس طرح سے انہوں نے قرض کی ساری رقم تین پتوں کی جیت میں پوری کر دی -"

"اتفاق کی بات!" مہمانوں میں سے کسی نے کہا -

"اجی قصہ ہے" هرمان نے کہا -

"یہ بھی هو سکتا ہے کہ پتوں پر نشان لگا هو" تیسرے نے شبہ ظاهر کیا -

"یہ بات نہیں ہے" تومسکی نے زور دے کر کہا -

"تو پھر کیسے؟" نروموف بولا "تمہاری ایک دادی اماں موجود هیں جنہیں یکے بعد دیگرے تین جیتنے والے پتوں کی ترکیب معلوم ہے اور تم اب تک ان کے جادو کی پڑیا نہیں معلوم کر سکے!"

"جی هاں - لعنت هو اس پر!" تومسکی بولا "دادی اماں کے چار بیٹے تھے - ان میں ایک میرے باپ تھے - چاروں کے چاروں بڑے زور کے جواری نکلے - لیکن اس پر بھی دادی اماں نے وہ راز ان میں سے کسی کو نہیں بتایا - حالانکہ اگر وہ بتا دیتیں تو وارے نیارے هو جاتے - اور چلو، مجھ کو بتا دیں تو کیا برا ہے - لیکن ہے یہ واقعہ، مجھ سے خود میرے چچا نواب ایوان ایلیچ نے بیان کیا قسم کھا کر - اور سنئے، مرحوم چپلیتسکی تھے نا، وہ جو محتاج هوکے مرے - انہوں نے لاکھوں کی رقم جوے میں اڑا دی - ایک بار کا ذکر ہے کہ وہ نوجوانی کے زمانے میں جوے میں تین لاکھ کے اردب

---

* ملکہ کے یہاں تاش کھیلنے -

میں آ گئے — مجھے یاد پڑتا ہے کہ زورچ سے ہارے تھے۔ ان کے ہوش اڑ گئے۔ دادی اماں کو، جو ہمیشہ سے نوجوانوں کی بدعنوانیوں کے معاملے میں بہت سخت رہی ہیں، کسی نہ کسی طرح چپلیتسکی کی حالت پر رحم گیا۔ انہوں نے اسے تین پتے دئیے جو اوپر تلے اسے کھیلنے تھے۔ لیکن بتانے کے ساتھ ہی یہ وعدہ لے لیا کہ قسم کھاؤ، کبھی آئندہ جوا نہ کھیلوگے۔ چپلیتسکی اپنے فتح مند حریف کے ہاں پہنچا۔ اور پھر جوے میں لگ گیا۔ پہلی ہی بازی چپلیتسکی نے پچاس ہزار کی بدی اور جیت لی۔ پھر پچاس کو پلٹ دیا، اور تیسرے ہاتھ میں لاکھ کو پلٹ دیا۔ چنانچہ آخری ہاتھ پر اس نے جیت میں سے قرض کی رقم بھی ادا کر دی اور اس کے علاوہ خاصی رقم اس کے پاس بچ رہی...

''بس، بہت ہوا۔ اب سونے کا وقت ہو گیا۔ پونے چھہ ہو چکے ہیں۔''

واقعی نور کا تڑکا ہونے لگا تھا۔ نوجوانوں نے اپنے اپنے جام کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلا اور سونے چل دئیے۔

— ۲ —

— ایسا نظر آتا ہے کہ آپ یقینی
طور پر خواصوں کو گھور رہے ہیں۔
— لیکن خاتون کیا کیا جائے؟
وہ ہیں بھی تو بہت تر و تازہ۔
سوسائٹی کی گفتگو

بوڑھی نواب زادی اپنے ڈریسنگ روم میں آئینے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ ان کے آس پاس تین کنیزیں منڈلا رہی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں گلابی پوڈر کا ڈبہ تھا۔ دوسری بالوں میں لگانے کے پنوں کی صندوقچی سنبھالے ہوئے تھی۔ تیسری ایک اونچی دیوار کی ٹوپی لئے کھڑی تھی جس میں آتشیں رنگ کے فیتے لگے ہوئے تھے۔ نواب زادی کو اب ذرا بھی اپنے حسن کا زعم نہ رہا تھا کیونکہ حسن

کبھی کا کافور ہو چکا تھا، لیکن انہوں نے نوجوانی کے دنوں کی عادتیں برقرار رکھی تھیں - ۱۷۷۰ء کے زمانے میں جو فیشن رائج تھے اب تک وہ انہی سے وضعداری برت رہی تھیں اور اپنے بناؤ سنگار پر ساٹھ سال پہلے کی طرح اب بھی اتنا ہی وقت اور اسی قدر محنت صرف کرتی تھیں - سامنے کھڑکی سے لگی ہوئی زردوزی کے فریم پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی جو نواب زادی کی خواص تھی -

''آداب عرض ہے * Grand'maman!'' ایک نوجوان افسرنے، جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا، نواب زادی سے کہا - ** ''Bonjour, mademoiselle Lise. میں Grand'maman کی خدمت میں ایک خاص غرض سے حاضر ہوا تھا -''

''کیا بات ہے *** Paul ؟''

''آپ اجازت عطا فرمائیے کہ اپنے ایک دوست کو آپ سے شرف نیاز حاصل کرا سکوں - اور جمعہ کے دن جو آپ کی ڈانس پارٹی ہے وہاں اس کو مدعو کر سکوں -''

''ہاں - تم اسے سیدھے ڈانس پارٹی میں ہی لے آنا - اور وہیں پر مجھ سے ملا دینا - کل شام تم وہاں ان کے ہاں گئے تھے کیا؟''

''اور کیا! بڑے مزے رہے - صبح پانچ بجے تک ناچ ہوتا رہا - افوہ، ایلیتسکایا نے کیا کمال کیا تھا!''

''ارے، میرے پیارے، اس لڑکی میں کیا رکھا ہے - تم اس کی دادی کو دیکھتے، شہزادی داریا پیتروونا کو - اب تو وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہوں گی میرے خیال میں، شہزادی داریا پیتروونا -''

''کیا فرمایا - بوڑھی ہو گئی ہوں گی؟''

توسکی نے بے خیالی میں کہا ''وہ تو کوئی سات برس ہوئے دنیا سے سدھار گئیں -''

نوجوان خواص نے جلدی سے سر اٹھایا اور نوجوان کو اشارہ کیا - اشارہ پاکر اسے دھیان آیا کہ ہاں،

---

* دادی اماں -

** ماداموزیل لیزا کی خدمت میں آداب بجا لاتا ہوں -

*** پال (پاویل) -

بوڑھی نواب‌زادی سے ان کے ہم عمروں اور ہم چشموں کا مرنا راز میں رکھا جاتا ہے۔ اس نے ہونٹ چبایا۔ لیکن نواب زادی نے یہ اطلاع جو ان کے لئے اچانک تھی، ایسے سنی جیسے کوئی خاص بات نہیں۔

''مر گئیں وہ؟'' انہوں نے کہا ''مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا! ہم دونوں ایک ساتھ ایک ہی وقت میں شاہی خواص کے درجے پر ''سرفراز'' ہوئے تھے۔ اور جب ہمیں ملکہ معظمہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو...''

نواب‌زادی نے وہی کہانی اپنے پوتے سے بیان کر دی جو وہ اس سے پہلے سو بار بیان کر چکی تھیں۔

''اچھا Paul، ذرا اٹھنے میں سہارا تو دو مجھے۔'' پھر انہوں نے کہا ''اور دیکھو لیزا بیٹی، وہ میری نسوار کی ڈبیا کہاں ہے؟''

اس کے بعد نواب‌زادی اپنی نوجوان کنیزوں کے ساتھ پردے کے پیچھے چلی گئیں تاکہ سنگار پورا کر سکیں۔ تومسکی اسی نوجوان لڑکی کے ساتھ رہ گیا۔

''آپ بڑی سرکار سے کس کو ملانا چاہتے ہیں؟'' آہستہ سے لیزاویتا ایوانوونا نے اس سے پوچھا۔

''نروموف کو۔ کیا آپ اسے جانتی ہیں؟''

''نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ وہ فوجی ہے یا غیرفوجی؟''

''فوجی ہے۔''

''انجنیر ہے کیا؟''

''نہیں۔ وہ سوار فوج میں ہے۔ مگر ہاں، آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ وہ انجنیر ہوگا؟''

لڑکی اس بات پر زور سے ہنس پڑی اور اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

''Paul!'' نواب زادی پردے کے پیچھے سے پکاریں ''مجھے کوئی نیا ناول بھیج دینا۔ لیکن دیکھنا، نئے لکھنے والوں میں سے کسی کا نہ ہو مہربانی کرکے۔''

''کیوں بھلا، Grand'maman؟''

''مطلب یہ ہے بیٹے کہ ایسا ناول نہ ہو جس میں ہیرو ماں کو مار ڈالتا ہے یا باپ کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

اور جس میں ڈوبے ہوئے انسانی جسم دکھائے جاتے ہیں۔ میں ڈوبی ہوئی لاش سے بہت ڈرتی ہوں۔ ‘‘

’’ آج کل تو اس طرح کے ناول نہیں آ رہے ہیں۔ آپ کوئی روسی ناول کیوں نہ پڑھ ڈالیں؟ ‘‘

’’ تو کیا روسی ناول بھی ہوتے ہیں؟ .. اچھا تو، بابا آپ مجھے وہی بھیج دیجئے، روسی ناول! ‘‘

’’ معاف کیجئے دادی اماں، اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ جلدی ہے مجھے... لیزاویتا ایوانوونا سے اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ نروموف کوئی انجنیر ہوگا ؟ ‘‘

اور یہ کہہ کر توسکی ڈریسنگ روم سے نکل گیا۔

لیزاویتا ایوانوونا اکیلی رہ گئی۔ اپنی کشیدہ کاری سے سر اٹھا کر وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ ذرا ہی دیر میں ایک نوجوان افسر سڑک کی دوسری طرف والی نکڑ پر نمودار ہوا۔ لیزا کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پھر کشیدہ کاری اٹھا لی۔ اور اپنا سر فریم پر اور جھکا لیا۔ عین اسی وقت بڑی سرکار بن ٹھن کر، تیار ہو کر باہر آ گئیں۔

’’ لیزنکا، گاڑی منگواؤ، ہم ٹہلنے جائیں گے۔ ‘‘

لیزا اپنے کشیدہ کاری کے فریم کو چھوڑ کر اٹھی اور چیزیں سنگوانے لگی۔

’’ کیا ہو گیا تمہیں، میری بچی، کیا بہری ہو گئی ہو تم؟ گاڑی ہمیں فوراً چاہئے ‘‘ انہوں نے چلا کر کہا۔

’’ بہت اچھا دادی اماں ‘‘ لڑکی نے نرم آواز میں جواب دیا اور وہ ڈیوڑھی کی طرف دوڑ گئی۔

ایک ملازم داخل ہوا۔ اور شہزادہ پاویل الیکساندرووچ کی بھیجی ہوئی کتابیں نواب زادی کو دیں۔

’’ بہت خوب۔ شکریہ ادا کر دینا۔ ‘‘ نواب زادی نے کہا۔ ’’ لیزا، لیزا، تم کہاں بھاگی جاتی ہو؟ ‘‘

’’ کپڑے بدلنے۔ ‘‘

”ابھی وقت ہے، میری بچی، یہاں بیٹھ جاؤ - پہلی جلد کھولو اور ذرا پڑھ کے سناؤ تو...“

لڑکی نے کتاب اٹھائی اور اس میں سے چند سطریں پڑھیں -

”ذرا اونچی آواز سے!“ نواب‌زادی نے کہا -

”تمہیں ہو کیا گیا ہے میری بیٹی! آواز بیٹھ گئی ہے کیا؟... ذرا دم لو - اسٹول میری طرف بڑھا دو - اور نزدیک آ جاؤ... ہاں تو!“

لیزاویتا ایوانوونا نے دو صفحے اور پڑھے - بڑی سرکار کو جماھیاں آنے لگیں -

”کتاب رکھ دو“ وہ بولی ”کیا مہمل بھرا ہوا ہے- شہزادہ پاویل کو میرے شکریے کے ساتھ واپس بھجوا دینا - اچھا، گاڑی کا کیا ہوا؟“

”گاڑی تیار ہے“ لیزاویتا ایوانوونا نے کھڑکی سے باھر جھانک کر کہا -

”اور تم نے ابھی تک کپڑے کیوں نہیں بدلے؟“ نواب‌زادی نے پوچھا ”ہمیشہ تم مجھے اٹکاتی ہو! یہ بات تمہاری سخت ناگوار گزرتی ہے -“

لیزا لپکی ہوئی اپنے کمرے کی طرف ابھی دو منٹ پورے نہ ہوئے تھے کہ نواب‌زادی نے اپنی پوری قوت سے بلانے کی گھنٹی کھینچی- تین چھوکریاں گھنٹی کی آواز پر دوڑتی ہوئی ایک دروازے پر پہنچیں اور دوسرے دروازے پر پیش خدمت -

”کیا ہوا ہے تم لوگوں کو - بلانے پر فوراً کیوں نہیں آتے ہو؟“ بڑی سرکار نے کہا - ”لیزاویتا ایوانوونا سے کہو کہ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں -“

لیزاویتا ایوانوونا اتنے میں داخل ہوئی، لمبا سایہ اور ٹوپی پہنے تھی -

”آخر میری بیٹی! یہ سب تم نے کیا پہن لیا ہے؟“ بڑی سرکار نے کہا - ”یہ سب سنگار کس لئے؟ تم کسے مٹھی میں لینا چاھتی ہو؟ موسم بھی کیسا ہے؟ لگتا ہے کہ ہوا چلتی رہے گی -“

''نہیں سرکار! ایسا تو نہیں ہوگا۔ موسم آج بہت پرسکون ہے،، پیش خدمت نے جواب دیا۔

''تم ہمیشہ بےسوچے سمجھے بول پڑتے ہو، جی! چھوٹی کھڑکی کھول دو،، نواب‌زادی نے حکم دیا ''جو کہا ہے وہی ہے۔ ہوا تیز ہے۔ ہوا میں ٹھنڈک بھی ہے۔ گاڑی واپس کرا دو۔ لیزنکا اب ہم نہیں جائیں گے۔ تم نے فضول کپڑے بدلے۔،،

''بس یہ ہے میری زندگی!،، لیزاویتا ایونوونا نے جی میں سوچا۔

حقیقت یہ ہے کہ لیزاویتا ایوانوونا بہت دکھی تھی۔ دانتے نے کہا ہے ''غیر کی روئی کڑوی ہوتی ہے اور غیر کی دھلیز پر قدم رکھنا بھاری پڑتا ہے۔،، کون ہے جو اس کڑواہٹ کو اس غریب لڑکی سے زیادہ جانتا ہوگا جس کا ''نفس غیر پر منحصر،، ہو۔ ایک بوڑھی بیگم کی مرضی پر۔ بڑی سرکار اپنی طبیعت سے ایسی بری نہ تھیں لیکن تنگ مزاج تھیں۔ ویسی ہی جیسی کہ عام طور سے وہ تمام بیگمات ہوتی ہیں جو کسی زمانے میں سوسائٹی سے نازبرداری کرا چکی ہوں۔ بڑی سرکار سنکی ہو گئی تھیں۔ ان میں ہوس بھر گئی تھی۔ صرف اپنی ذات سے غرض تھی اور دوسروں کی طرف سے روکھاپن برتتی تھیں، ان تمام عمر رسیدہ لوگوں کی طرح جو اپنے زمانے سے محبت کرتے ہیں اور زمانۂ حال سے بےنیاز ہوتے ہیں۔ وہ اب بھی اونچی سوسائٹی کی چھل پہل میں خوب حصہ لیتی تھیں۔ خود کو ہر رقص پارٹی میں پہنچاتی تھیں جہاں پرانے فیشن کی پاؤڈر سرخی اور لباس میں ایک کونے میں بیٹھ جاتی تھیں جیسے وہ ناچ گھر کی بھونڈی لیکن ضروری زینت ہوں۔ جو مہمان ناچ گھر میں آتے وہ بڑی سرکار کے نزدیک پہنچ کر ادب سے اس طرح سر جھکاتے جیسے کوئی مستند رسم ادا کر رہے ہوں۔ بس، اس کے بعد ان کا کوئی نوٹس نہ لیتا تھا۔ خود اپنے یہاں وہ سارے شہر کو شرف ملاقات بخشتی تھیں، جہاں سختی سے ادب آداب برتے جاتے تھے اگرچہ وہ کسی کو صورت سے پہچانتی نہیں تھیں۔

بےشمار خانہ زاد ان کی ڈیوڑھی اور غلام گردش میں پڑے پڑے موٹے ہو رہے تھے اور ان کے بال پکتے جا رہے تھے، جو ان کے جی میں آتا تھا وہ کرتے تھے اور بڑی سرکار کو آخری وقت نچوڑ لینے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے تھے۔ بس، ایک لیزاویتا ایونوونا تھی جو اس حویلی میں شہید ناز بنی ہوئی تھی۔ وہ پیالی میں چائے انڈیلتی تو اس بات پر ڈانٹ پڑتی کہ شکر کیوں زیادہ ہو گئی۔ وہ اونچی آواز میں ناول پڑھ کے سناتی تو مصنف کی ساری خرابیوں کی بلا اس کے سر آتی۔ بڑی بی کے ساتھ وہی ہوا خوری کے لئے جاتے وقت سواری میں بیٹھتی اور اگر موسم خراب ہوا یا سڑک کی حالت ابتر ہوئی تو وہی جواب‌دہ ٹھیرائی جاتی۔ اس کی تنخواہ بھی برائے نام مقرر تھی مگر وہ کبھی پوری وصول نہ ہوئی۔ اس پر یہ بھی تھا کہ اس کا لباس ایسا ہونا چاہئے جیسا دوسرے سبھوں کا ہوتا ہے، یعنی ایسا، جیسا گنے چنے لوگوں کا ہوتا ہے۔ سوسائٹی میں اس لڑکی کی حیثیت بڑی قابل رحم تھی۔ سب اسے جانتے تھے اور کوئی بھی اسے خیال میں نہیں لاتا تھا۔ ناچ کے موقعوں پر وہ صرف اس وقت ناچنے کھڑی ہوتی جب کسی کو ناچ کے لئے جوڑے کی کمی پڑ جاتی۔ اور بیگمات تبھی اس کا بازو تھامتی تھیں جب انہیں اپنے سنگار میں کہیں نوک پلک درست کرنے کے لئے جانے کی ضرورت پیش آ جاتی اور کوئی ہاتھ بٹانے والا درکار ہوتا۔ لیزا کو اب اپنی فکر تھی اور اس حالت کا شدید احساس تھا، اس لئے وہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتی تھی اور سخت بےچین تھی کہ کہیں سے کوئی ایسا مل جائے جو اس پھٹکار سے نجات دلا سکے۔ لیکن نوجوانوں کے دماغ میں ہوا بھری تھی اور وہ ناپ‌تول کے ایسے عادی تھے کہ اس بےچاری کو توجہ کا شرف بھی نہیں بخشتے تھے حالانکہ لیزاویتا ایوانوونا ان نک‌چڑھی اور ٹھنڈی دل‌رباؤں سے سو گنا دل‌کش ہوگی جن کے وہ چکر کاٹا کرتے تھے۔ کتنی ہی بار یہ ہو چکا تھا کہ وہ حد سے زیادہ سجے سجائے لیکن زندگی سے عاری ڈرائنگ روم سے بہت آہستہ دبے پاؤں اٹھ گئی

کہ اپنے غریب اجڑے کمرے میں آنسو بہا لے جہاں دیواری کاغذوں کے پردے لگے تھے، خانے بنے ہوئے تھے، چھوٹاسا آئینہ ٹنگا تھا، رنگا ہوا پلنگ پڑا تھا اور جہاں موم‌بتی پیتل کے شمع دان میں بجھی بجھی جلا کرتی تھی۔

ایک بار کا ذکر ہے — یہ اس شام کے دو دن بعد کا واقعہ ہے جسے ہم کہانی کے شروع میں دکھا چکے ہیں اور اس کے ایک ہفتے پہلے کی بات ہے جہاں ہم‌نے اپنی کہانی روکی تھی — ہاں تو ایک بار لیزاویتا ایوانوونا کھڑکی کے سامنے بیٹھی اپنی کشیدہ‌کاری کی ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی کہ اتفاق سے اس کی نظر سڑک کی طرف اٹھ گئی۔ دیکھا تو ایک نوجوان وہاں بےحس و حرکت کھڑا تھا اور وردی سے انجنیر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ لیزا نے سر جھکا لیا اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ پانچ منٹ بعد پھر اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہ نوجوان افسر پھر وہیں کھڑا تھا۔ اسے چلتے پھرتے افسروں سے آنکھیں لڑانے کی کوئی لت تو تھی نہیں، وہ اپنے کام میں لگ گئی۔ پھر سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا تک نہیں اور دو گھنٹے تک کشیدہ‌کاری میں ہی جٹی رہی۔ میز پر دو پہر کا کھانا لگایا جا چکا تھا۔ وہ اٹھی اور کشیدہ‌کاری کا تام‌جھام سنگوانے لگی۔ کھڑکی سے باہر جو نظر گئی تو دیکھا کہ وہ نوجوان افسر ابھی تک وہیں ڈٹا ہوا ہے۔ یہ بات اسے بہت ہی عجیب لگی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ایک بےچینی کے احساس کے ساتھ پھر کھڑکی کے پاس آئی لیکن اب وہاں افسر کا پتہ نہیں تھا — اور وہ بھی پھر اس کے بارے میں بھول گئی...

دو ایک دن بعد جب وہ بڑی سرکار کے ساتھ گاڑی میں سوار ہونے نکلی تو پھر اسے وہ افسر نظر پڑا۔ وہ بالکل ہی ڈیوڑھی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ روئیں دار اٹھے ہوئے چوڑے کالر میں چھپ گیا تھا۔ اور ٹوپی کے سایے تلے دو سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لیزاویتا ایوانوونا سہم گئی، وہ خود نہیں جانتی تھی کہ کس چیز

سے سہمی ہے۔ اس نے خود کو گاڑی میں ڈال تو دیا لیکن بدن میں عجب قسم کی سنسنی دوڑی ہوئی تھی۔

جب وہ گھر لوٹی تو سیدھی کھڑکی کے پاس دوڑی ہوئی گئی۔ افسر وہیں پہلے کی جگہ کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں لیزا پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گئی کیوں کہ حیرانی اور اندرونی اضطراب کی آگ میں جل رہی تھی — یہ ایک ایسی آگ تھی جو اب تک اس کے لئے بالکل ان جانی تھی۔

اس کے بعد سے یہ ہونے لگا کہ ایک دن بھی ایسا نہ گزرا جب وہ نوجوان ایک خاص وقت پر ان کی حویلی کے پاس کھڑکی کے سامنے کھڑا نظر نہ آیا ہو۔ ان دونوں کے درمیان عجب قسم کا ایک رشتہ قائم ہو گیا۔ اپنی جگہ پر بیٹھی کام میں لگی ہوئی ہے کہ اتنے میں محسوس ہوتا کہ وہ نزدیک آرہا ہے، سر اٹھاتی اور اسے دیکھتی۔ دیکھنے کا وقفہ روز بہ روز بڑھتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نوجوان اس بات کےلئے لیزا کا احسان مند ہے۔ نوجوانی کی تیز نظروں سے وہ دیکھتی کہ جب ان دونوں کی آنکھیں چار ہوتیں تو ایک‌دم کیسے اس کے پیلے گالوں پر سرخی دوڑ جاتی۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب جو وہ نظر آتا تو لیزا مسکراہٹ سے اس کا سواگت کرتی...

جب تومسکی نے بڑی سرکار سے اپنے دوست کا تعارف کرانے کی اجازت چاہی تو بے‌چاری لڑکی کا دل دھڑکنے لگا۔ جب اسے معلوم ہو گیا کہ نروموف کوئی انجنیر نہیں ہے بلکہ گارد کا سوار ہے تو دل میں بہت پچھتائی کہ خواہ‌مخواہ سوال کرکے میں نے اپنا راز اس شریر تومسکی پر کھول دیا۔

ہرمان ایک جرمن نژاد روسی کا بیٹا تھا جس نے اپنے بعد تھوڑی سی پونجی چھوڑی تھی۔ دل میں یہ ٹھان کر کہ اپنی خودمختاری کی بنیاد آئندہ کے لئے مضبوط کر لینی چاہئے، ہرمان نے وراثت کی رقم سے جو سود بنتا تھا اسے بھی ہاتھ نہیں لگایا بلکہ صرف اپنی تنخواہ پر ہی بسر کرنی شروع کر دی۔ اس نے کبھی خرچ کو اپنی آمدنی سے باہر نہ جانے دیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی بتا دیا جائے کہ

وہ بہت سنبھلی ہوئی، چاروں کھونٹ سے چوکس زندگی کا آدمی تھا، اس کے دوست احباب کو شاید ہی کبھی موقع ملا ہو کہ وہ اس کی حد سے بڑھی کفایت شعاری کا مذاق اڑا سکے ہوں۔ وہ دھن کا پکا تھا اور اس کے خیال کی اڑان بہت بلند تھی۔ لیکن طبیعت میں ایسا کٹرپن تھا کہ نوجوانی کی عام غلط‌کاریوں میں کبھی مبتلا نہ ہوا۔ اب یہی لے لیجئے کہ وہ من میں بڑا پکا جواری تھا لیکن کبھی خود ہاتھ میں تاش نہیں لیا۔ ہمیشہ یہ اندازہ کرلیتا تھا کہ مجھے جو دولت ورثے میں ملی ہے وہ اتنی نہیں ہے کہ اس سے (بقول خود) ضروری کو فالتو کی امید میں قربان کر دوں۔ مگر اس کے باوجود وہ ساری ساری رات تاش کی میزوں کے پاس ڈٹا رہتا اور کھیل کی اونچ نیچ کو، داؤ پیچ کو بڑے جوش و خروش سے دیکھا کرتا۔

تین پتوں کا یہ لطیفہ جو اس نے سنا وہ اس کے دماغ میں مضبوطی سے جم گیا اور تمام رات یہی ادھیڑبن لگی رہی۔ ''کیا ہو اگر''، اس نے دوسرے روز رات کو پیٹرسبرگ کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے سوچا ''کیا ہوا گر وہ بوڑھی نواب زادی مجھ پر اپنا راز کھول دے! یا یوں ہو کہ وہ اپنے تین پکے پتوں کی بات مجھے بتا دے؟ اپنی قسمت کیوں نہ آزما لی جائے! ان کی خدمت میں حاضر ہوا جائے، عنایت کی نظر حاصل کی جائے، اور یہ بھی سہی کہ ان سے محبت جتائی جائے... مگر اس تمام قصے میں وقت بہت لگے گا۔ اور بڑی بی کی عمر ستاسی سال کی ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج کل میں ہی دنیا سے چلتی بنیں۔ ہفتہ بھر میں سدھار جائیں!.. مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ صرف لطیفہ ہی لطیفہ ہو۔ حقیقت کچھ بھی نہ ہو، کیا اس کی بات کا یقین کیا جا سکتا ہے؟.. نہیں جی، ناپ تول، احتیاط سے قدم اٹھانا، اور جی لگا کے محنت کرنا، بس یہی میرے تین پکے پتے ہیں۔ انہی کی بدولت میں تین گنا بنا لوں‌گا اور اپنی پونجی کو سات گنا کر لوں‌گا اور انہی سے مجھے چین ملے‌گا اور دوسروں کے آسرے سے نجات میسر ہوگی۔''

اسی طرح اپنے خیالوں میں غرق وہ چلتا رہا، دیکھا تو پیٹرسبرگ کی ایک شاہراہ پر چل رہا تھا اور اس وقت ایک پرانے طرز کی حویلی کے سامنے تھا۔ سڑک پر اس وقت گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اور ایک کے پیچھے ایک گاڑیوں کی لین ڈوری ایک نہایت جگمگاتے ہوئے مکان کی ڈیوڑھی پر لگی ہوئی تھی۔ گاڑیوں کے پٹ کھلتے جاتے تھے اور ان میں سے کسی نوجوان حسینہ کی سڈول پنڈلیاں نکلتی تھیں، کسی کے کھن کھن بجتی ایڑیوں والے اونچے بوٹ چمکتے تھے، اور کسی غیرملکی سیاسی عہدے دار کے دھاری دار اوپر تک چڑھے ہوئے موزے اور کسے ہوئے جوتے۔ شاندار اردلی کے برابر سے پوستینوں کے لبادے اور عمدہ پوشاکوں کے دامن لہراتے ہوئے گزر ہے تھے۔ ہرمان وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

سرے پر جو پہرےدار کھڑا تھا اس سے ہرمان نے بوچھا ”کس کا مکان ہے یہ؟“

”نواب زادی... کا۔“ پہرےدار نے جواب دیا۔

ہرمان کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہی تعجب خیز لطیفہ اس کے تصور میں آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ مکان کے نزدیک ہی وہ ٹہلنے لگا۔ اور سوچنے لگا کہ اس کی مالکن کیا ہوگی؟ اس میں بھی کیسا گن پایا جاتا ہے! آخر وہ دیر سے اپنے گوشہ عافیت میں واپس آیا۔ دیر تک اس کی آنکھ نہیں لگی۔ اور جب نیند آ گئی تو خواب میں تاش پھیلے پڑے تھے۔ دیکھا کہ ہرے رنگ کی میز ہے۔ اس پر نوٹوں اور اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ اس نے ایک کے بعد ایک پتہ پھینکا، ڈٹ کر بازی لگائی اور ہر بار جیتی سنہرے سکوں کا ڈھیر اپنی طرف سمیٹ لیا۔ اور نوٹوں کو جیب میں بھر لیا۔ یوں ہی وہ خواب دیکھتا رہا۔ دیر سے آنکھ کھلی۔ منہ سے آہ نکل گئی کہ افسوس، ایسی بےپناہ دولت ہاتھ سے جاتی رہی۔ اور پھر ایک بار شہر میں بےمقصد گھومنے پھرنے نکلا۔ پھر اس نے خود کو وہیں پایا، اس نواب زادی کی حویلی کے سامنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غیب سے کوئی ہاتھ اسے کھینچ کر وہاں

لے آیا ہے۔ وہ خاموش کھڑا کھڑکیوں کی طرف تکنے لگا۔ ان میں سے ایک کھڑکی کے پیچھے اسے سیاہ بالوں والا سر نظر پڑا جو کتاب یا کسی اور کام پر جھکا ہوا تھا۔ سر اونچا ہوا تو ہرمان کو ایک نوجوان چہرہ نظر آیا اور ساتھ ہی دو سیاہ آنکھیں۔ اسی لمحے نے اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

— ۳ —

میرے پیارے! آپ مجھے چار صفحے
کا خط لکھتے ہیں اور ابھی میں ایک
پڑھنے نہیں پاتی کہ دوسرا موجود۔

خط و کتابت

ابھی لیزاویتا ایوانوونا نے ٹوپی اور کپڑے اتارے ہی ہوں گے کہ اتنے میں بڑی سرکار نے اسے پھر بلا بھیجا اور حکم دیا کہ گاڑی لائی جائے۔ چنانچہ اب وہ سوار ہونے کے لئے حویلی سے برآمد ہوئیں۔ ٹھیک اس لمحے جب دو اردلی ان بڑی بی کو اور اٹھانے گاڑی کے اندر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، لیزاویتا ایوانوونا نے بالکل پہیوں کے پاس اپنے انجنیر کو کھڑا پایا۔ اس نے بڑھ کر لیزا کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ خوف کے مارے سکتے میں رہ گئی۔ ہل بھی نہ سکی۔ نوجوان اس کے ہاتھ میں خط تھما کر وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس نے خط کو اپنے دستانے میں چھپائے رکھا اور راستے بھر نہ تو کچھ سنا اور نہ دیکھا۔ نواب زادی کی یہ عادت تھی کہ جب وہ سواری پر نکلتیں تو ایک کے بعد ایک سوال کی بوچھار کرتی جاتیں: یہ کون تھا بھلا جو ابھی ہمارے پاس سے گزرا ہے؟ اس پل کو کیا کہتے ہیں؟ وہ اس جگہ جو اشتہار نظر آ رہا ہے، کیا لکھا ہے وہاں؟ لیزاویتا ایوانوونا نے اس بار

بےخیالی سے الٹا سیدھا جواب دے دیا، اور اس پر بڑی سرکار کو غصہ آگیا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے میری بیٹی؟ اچانک کہیں کوئی آسیب تو نہیں ہو گیا تم پر؟ یا تم میری بات سن نہیں رہی ہو۔ یا سمجھ میں تمہاری نہیں آتی۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی منہ سے لفظ ٹھیک نکلتے ہیں اور میری مت نہیں ماری گئی!“

لیزاویتا ایوانوونا نے ان کی بات سنی انسنی کردی گھر واپس پہنچتے ہی وہ جھٹ اپنے کمرے کو بھاگی اور دستانے میں سے خط نکالا۔ خط سربمہر نہیں تھا۔ لیزاویتا ایوانوونا نے اس پر اس سرے سے اس سرے تک نظر دوڑائی۔ خط میں اقرار محبت تھا۔ خط کا لہجہ نرم ونازک تھا، وزنی اور دل کو لگنے والا تھا، اور کسی جرمن ناول سے لفظ بہ‌لفظ نقل کیا ہوا تھا۔ لیکن لیزاویتا ایوانوونا، جسے جرمن زبان کی خبر نہیں تھی، خط پڑھ کے بہت دل شاد ہوئی۔

بہرحال خط نے اس کے اندر ہلچل مچا دی۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اسے رازداری کی ہوا لگی۔ اور ایک نوجوان سے تعلقات پیدا کرنے کا احساس ہوا۔ انجنیر کی بےباکی نے اسے تھرا دیا تھا۔ لیزا نے خود کو ملامت کی کہ میں غلط راستے پر لگی جا رہی ہوں۔ وہ طے نہ کر سکی کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ کیا کھڑکی کے سامنے بیٹھنا چھوڑدے۔ اور روکھے‌پن کا برتاؤ کرکے اس کے آئندہ آگے بڑھنے کے ارادوں پر اوس ڈال دے؟ یا اس کا خط واپس کر دے یا بےمہری سے دوٹوک جواب دے کر خاموش کر دے؟ کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ مشورہ کر سکتی۔ نہ اس کی سہیلیاں تھیں اور نہ کوئی رازدار تھا۔ آخر لیزاویتا ایوانوونا نے طے کیا کہ جواب لکھنا چاہئے۔

وہ لکھنے پڑھنے کی میز پر بیٹھ گئی، قلم اور کاغذ نکالا اور سوچنے لگی کہ کیا لکھا جائے۔ کئی بار اس نے خط شروع کیا اور ہر بار اسے چاک کر ڈالا۔ کبھی معلوم ہوتا تھا کہ جو الفاظ وہ لکھ رہی ہے وہ حد سے آگے

بڑھے جا رہے ہیں اور کبھی یہ لگتا تھا کہ لب و لہجے میں درشتی ہے۔ آخر وہ ایسی چند سطریں لکھنے میں کامیاب ہو گئی جن سے دل کو اطمینان ہوا کہ ٹھیک ہیں۔ سطریں یہ تھیں ”مجھے یقین ہے کہ آپ کی نیت صاف ہے اور آپ بےخیالی یا بےپروائی سے کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں گے جو میری توہین کا سبب ہو۔ لیکن ہماری ملاقات اس طرح سے شروع نہ ہونی چاہئے۔ میں آپ کا خط واپس کر رہی ہوں اور یقین کرتی ہوں کہ آئندہ آپ کی طرف سے نامناسب برتاؤ کی شکایت کا موقع نہ دیا جائے گا۔“

دوسرے دن جیسے ہی اس نے ہرمان کو نزدیک آتے دیکھا وہ فوراً کشیدہ‌کاری کے فریم اٹھ کھڑی ہوئی اور برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کھڑکی کے اندر کا ایک پٹ کھولا اور خط اس کے اندر سے ہاتھ بڑھا کر باہر پھینک دیا۔ اسے بھروسہ تھا کہ نوجوان انجنیر ہوشیاری سے کام لےگا۔ ہرمان لپک کر اس جگہ پہنچا جہاں خط گرا تھا، اس نے لفافہ اٹھا لیا اور ایک پیسٹری کی دوکان میں گھس گیا۔ مہر توڑی تو لفافے میں سے خود اس کا لکھا ہوا خط نکلا اور لیزاویتا ایوانوونا کا جواب۔ اسے خود بھی یہی توقع تھی کہ ایسا ہوگا۔ وہ اپنے مکان پر اسی ادھیڑبن میں واپس ہوا کہ کیا چال چلنی چاہئے۔

اس واقعے کے تین دن بعد ایک بےقرار آنکھوں والی لڑکی زنانہ فیشنوں کی دوکان سے لیزاویتا ایوانوونا کے پاس ایک پرزہ لے کر آئی۔

لیزاویتا ایوانوونا نے بےچینی سے خط کھولا، اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کے اندر روپے کا تقاضا ہوگا لیکن اچانک دیکھا کہ ہرمان کی تحریر تھی۔

”دیکھو، بچی، تم سے غلطی ہوئی ہے“، لیزا نے اس بچی سے کہا ”یہ پرزہ مجھے نہیں بھیجا گیا ہے۔“

”جی یہ خط آپ ہی کے نام ہے؟“، اس بےباک لڑکی نے اپنی شوخ مسکراہٹ چھپائے بغیر جواب دیا۔ ”مہربانی کرکے آپ اس کو پڑھ لیجئے۔“

لیزاویتا ایوانوونا نے خط پر ایک سرسری نظر دوڑائی ۔ خط میں ہرمان نے اس سے ملاقات کی تمنا کی تھی ۔

'' میری بچی، تم بھٹک گئی ہو،، لیزا نے کہا ۔ وہ اس جلدبازی والے تقاضے سے اور اس معاملے میں جو ترکیبیں ہرمان نے چلی تھیں ان سے چونک گئی تھی ۔ '' یہ خط شاید مجھے نہیں بھیجا گیا ہے !،، یہ کہا اور خط لے کر اس کے پرزے پرزے کر دئیے ۔

'' اچھا، اگر یہ خط آپ کے نام نہیں تھا تو آپ نے اسے چاک کیوں کیا؟،، وہ دوکان والی لڑکی بولی ۔ '' جنہوں نے مجھے دیا تھا انہی کو واپس کر دیتی میں !،،

'' میں تجھ سے اتنا کہے دیتی ہوں کہ آئندہ کسی کا خط میرے نام لے کر نہ آنا ادھر !،، لیزاویتا ایوانوونا نے بچی کے جملے پر چمک کر کہا '' اور جس نے تجھے یہ خط دیا تھا اس سے کہہ دینا کہ تمہیں اپنی حرکت پر شرم آنی چاہئے...،،

یہ سب ہوا مگر ہرمان اپنی کوششوں سے باز نہ آیا ۔ لیزاویتا ایوانوونا کو روزانہ اس کی طرف سے خط آتے رہے اور مختلف راہوں سے آتے رہے ۔ اب یہ خط جرمن ادب سے ترجمہ کئے ہوئے نہیں ہوتے تھے ۔ ہرمان خود ہی اپنے جوش جذبات میں یہ خط لکھا کرتا تھا اور جو زبان وہ قدرتی طور پر لکھ سکتا تھا وہی استعمال کرتا تھا ۔ اس کے خطوں سے ایک تو اس کی اٹل تمنا ظاہر ہوتی تھی اور دوسرے بےلگام تصور کی جولانیاں ۔ اب لیزاویتا ایوانوونا کو ہرمان کے خط واپس کرنے کا خیال تک بھی نہیں آتا تھا ۔ اسے ان خطوں میں لطف آنے لگا تھا ۔ وہ ان کا جواب لکھنے لگی تھی اور روز بہ روز اس کے جوابوں میں نرمی اور گھلاوٹ بڑھتی چلی گئی ۔ آخر ایک دن یہ بھی ہوا کہ لیزاویتا ایوانوونا نے اپنی کھڑکی کے پٹ سے اس نوجوان کی طرف یہ خط پھینکا :

'' آج فلاں سفارت‌خانے میں ناچ کی محفل ہوگی ۔ بڑی سرکار وہاں تشریف لے جائیں گی ۔ ہم لوگ دو بجے رات تک وہاں رہیں گے ۔ آپ کو موقع ہے کہ اکیلے

میں مجھ سے مل لیجئے۔ جیسے ھی بڑی سرکار محل سے باھر جائیں گی ان کے نوکر ظاھر ھے کہ اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں گے۔ برساتی میں صرف ایک چوکیدار رہ جاتا ھے۔ وہ بھی اپنی کوٹھری کو رخصت ھو جائے گا — آپ ساڑھے گیارہ بجے آئیے۔ سیدھے اوپر زینے پر چڑھئے، اور اگر کوئی وھاں کمرے میں ملے تو آپ پوچھ لیجئے، بڑی سرکار کہاں ھیں؟ وہ آپ کو بتائے گا کہ وہ حویلی سے باھر تشریف لے گئی ھیں۔ اگر ایسی صورت ھوئی تو آپ کے لئے اس کے سوا چارہ نہ ھوگا کہ واپس جائیں۔ مگر غالب گمان یہی ھے کہ کوئی نہیں ملے گا۔ مامائیں سب کی سب اپنے کمرے میں ھوں گی۔ بڑے ھال سے آپ بائیں ھاتھ مڑ جائیں۔ اور سیدھے چلتے چلتے آپ بڑی سرکار کی خواب گاہ تک پہنچ جائیں گے۔ وھاں دو چھوٹے چھوٹے دروازوں کے آگے ایک اوٹ کھڑی نظر آئے گی۔ داھنے ھاتھ والا دروازہ ان کے مطالعہ کے کمرے تک پہنچاتا ھے جہاں بڑی سرکار کبھی نہیں جاتی ھیں۔ اور بائیں ھاتھ کا دروازہ آپ کو ایک گزرگاہ میں پہنچائے گا جس میں سے ایک چکردار تنگ سیڑھی میرے کمرے تک آتی ھے۔"

ھرمان نے مقررہ وقت تک ایسے انتظار کیا جیسے کوئی شیر قلانچ بھرنے کے لئے تاک لگاتا ھے۔ ابھی دس ھی بجے تھے کہ وہ نواب‌زادی کی حویلی کے سامنے آ کر ڈٹ گیا۔ موسم بہت بگڑا ھوا تھا۔ ھوا کی سائیں سائیں ھورھی تھی اور برف نم خوردہ گالوں میں گر رھا تھا۔ بتیاں ھلکی ھلکی ٹمٹما رھی تھیں۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے اکادکا بھٹکتی ھوئی گھوڑا گاڑی نظر آ جاتی تھی کہ شاید کوئی رھی سہی سواری کہیں مل جائے۔ ھرمان نے اپنے فراک کوٹ کے اوپر کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا لیکن اس کے باوجود نہ تو اس پر سنسناتی ھواؤں کا اثر تھا اور نہ برف کا۔ آخر اس نے دیکھا کہ نواب‌زادی کی گاڑی ڈیوڑھی پر لگادی گئی۔ ھرمان کو اردلی باھر آتے دکھائی دئے۔ وہ دونوں پہلوؤں پر خمیدہ بڑی بی کو سنبھالے ھوئے

تھے جو شاندار اور لمبی پیچھے لٹکتی ہوئی پوشاک میں بڑھ رہی تھیں۔ اس کے پیچھے ہلکے لباس میں بڑی سرکار کی نوجوان خواص برآمد ہوئی۔ اس کے جوڑے میں پھول لگے تھے۔ گاڑی کے پٹ زور سے بند ہوئے۔ اور پہیے پولے برف پر زور سے چرچرائے۔ پہرے دار نے دروازہ بھیڑ دیا۔ اور کھڑکیوں پر اندھیرا چھا گیا۔ ہرمان اس خالی محل کے دروازے کے سامنے ٹہلتا رہا۔ جب وہ سڑک کی لالٹین کے پاس پہنچا تو اس نے گھڑی کو غور سے دیکھا۔ گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ لیمپ کی روشنی میں کھڑا رہا۔ نظریں گھڑی کی سوئیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے بےقراری تھی کہ یہ باقی منٹ بھی کسی طرح گزر چکیں۔ بالاخر جب ساڑھے گیارہ ہو گئے تو وہ حویلی کی برساتی کی طرف بڑھا اور خوب روشن ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ پہرے دار وہاں موجود نہ تھا۔ ہرمان سیڑھی پر اوپر چڑھتا چلا گیا۔ ہال میں کھلنے والا دروازہ اس نے کھولا اور دیکھا کہ کوئی ملازم دیواری لیمپ کے نیچے ایک پرانی بوسیدہ اور میلی کچیلی آرام کرسی پر دراز سو رہا ہے۔ ہرمان اس کے پاس سے ہلکے اور آہستہ سے قدم اٹھاتا گزر گیا۔ ناچ کا کمرہ اور دیوان‌خانہ تاریک پڑے تھے۔ بس، لیمپ کی ہلکی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ ہرمان خواب‌گاہ میں داخل ہوا۔ ایک سنہرا لیمپ محراب عبادت کے آگے جھول رہا تھا جس میں پرانی مقدس شبیہیں لگی ہوئی تھیں۔ اڑے ہوئے رنگوں کی مشجر کی آرام کرسیاں تھیں اور پروں سے بھرے تکیوں کے صوفے جن کی زرکاری جگہ جگہ سے مٹ چکی تھی، دیواروں سے ایک اداسی بھری یکسانیت کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور دیواروں پر چینی کاغذ منڈھا ہوا تھا۔ دو تصویری چہرے دیواروں پر لٹک رہے تھے جن کو پیرس میں مادام لبرون نے بنایا تھا ایک تو ایسا لگتا تھا کہ چالیس برس کے کسی مرد کی تصویر ہے، جس کے رخسار گلاب جیسے ہیں اور بھرے بدن کا آدمی ہے وہ ہلکے سبز رنگ کی وردی پہنے تھا جس کے سینے پر ستارہ ٹنکا ہوا تھا۔ دوسری تصویر

کسی نوجوان حسینہ کی تھی جس کی ناک ستواں اور نوکیلی تھی اور پہلوؤں سے الٹی ہوئی غازہ‌دار زلفوں میں ایک طرف گلاب لگا ہوا تھا۔ ہر ایک کونے میں گلہ‌بان لڑکیوں کے چینی کے مجسمے لگے تھے، لیروآ کے ہنرمند ہاتھوں کی تیار کی ہوئی میز کی گھڑیاں اور آرائشی صندوقچیاں تھیں۔ گدے، پنکھے، اور بہت سا ایسا تفریحی سامان بھی تھا جسکو پچھلی صدی کے آخر میں بیگمات کا دل بہلانے کے لئے منٹکولفائیے کے غبارہ اور مسمریزم کے سامان کے ساتھ ایجاد کیا گیا تھا۔ ہرمان پردے کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں پر لوہے کا چھوٹا سا ایک پلنگ پڑا تھا۔ داھنے ہاتھ پر مطالعہ کے کمرے کا دروازہ تھا۔ اور بائیں ہاتھ پر گزرگاہ میں جانے کا دروازہ کھلتا تھا۔ ہرمان نے اسے کھولا تو وہ تنگ چکردار سیڑھی نظر آئی جو اس بےچاری لڑکی کے کمرے کو جاتی تھی... لیکن وہ آگے نہ گیا۔ مڑکر مطالعہ کے اندھیرے کمرے میں گھس گیا۔

وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔ بیٹھک کے کمرے میں گھنٹے نے بارہ بجائے۔ اسی کے ساتھ دوسرے تمام کمروں سے یکے بعد دیگرے گھڑیوں کے بجنے کی صدا سنائی دی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ ہرمان وھیں اندر ٹھنڈے آتشدان سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ وہ بالکل پرسکون تھا۔ دل کے دھڑکنے کی رفتار حسب معمول تھی اس شخص کے دل کی طرح جس نے ٹھان رکھی ہو کہ جو مجھے کرنا ھے وہ ھے تو خطرناک مگر کرنا ھی ھے۔ گھنٹوں نے ایک بجایا اور پھر دو بجادئے — ہرمان کو دور سے گھوڑا گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاھٹ سنائی دی۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گاڑی نزدیک آتے آتے تھم گئی۔ اب اسے صاف سنائی دیا کہ اترنے کے لئے پائدان کھٹ سے گرایا گیا۔ سارے مکان میں گونج ہوئی۔ لوگ دھپ دھپ کرتے دوڑے۔ آوازیں بلند ہوئیں۔ اور گھر میں روشنیاں کر دی گئیں۔ تین ادھیڑ عمر کی خاص ماماًئیں خواب گاہ میں لپکتی جھپکتی پہنچیں اور بڑی سرکار نے بالکل ادھہ موئی حالت میں اس

کمرے کے اندر قدم رکھا اور خوب اونچی پشت والی آرام کرسی میں دھنس کر بیٹھ گئیں۔ ہرمان نے دروازے کے شگاف سے جھانکا۔ لیزاویتا ایوانوونا اس کے بالکل نزدیک سے گزر گئی۔ اپنے زینے پر چڑھتے ہوئے لیزا کے قدموں کی آہٹ ہرمان کو صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کے دل میں گھونسا سا لگا لیکن یہ پشیمانی کا احساس فوراً ہی دب کر رہ گیا۔ اب وہ یہاں اندھیرے کمرے میں ایسے کھڑا تھا جیسے آدمی نہیں، پتھر ہو۔

بڑی سرکار آئینے کے سامنے کپڑے اتارنے لگیں۔ ماماؤں نے ان کی گلاب لگی ٹوپی کے کانٹے کھولے اور سفید چونڈے پر سے، جس کے بال باریک ترشے ہوئے تھے، پوڈر لگی ہوئی بالوں کی پوشش الگ کی۔ ان پر سے پنیں ایسے بکھر گئیں جیسے بوچھار ہوئی ہو۔ اور پیلا لباس جس پر چاندی کا کام تھا، سوجے ہوئے پیروں پر پھسل گیا۔ ہرمان نے ان کے سنگار کے وحشت‌ناک رازوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ آخر میں بڑی سرکار سے ماماؤں نے ساری آرائشیں الگ کر لیں اور ان کے برہنہ جسم پر صرف شب خوابی کا گون اور ٹوپی لپیٹ دی۔ اس لباس میں، جو ان کی عمر کے لئے زیب دیتا تھا، اب وہ کم بد ہیئت اور بھدی نظر آتی تھیں۔

عام طور پر سارے عمررسیدہ لوگوں کی طرح بڑی بی کو بھی بےخوابی کا مرض تھا۔ جب ان کی مامائیں سارے لباس جدا کر چکیں تو وہ خود کھڑکی کے پاس اونچی پشت‌والی آرام کرسی پر دراز ہو گئیں اور ماماؤں کو رخصت کر دیا۔ شمعیں وہاں سے اٹھا لی گئیں۔ اور اب پھر وہی منظر تھا کہ روشنی صرف سنہرے لیمپ سے چھن چھن کے آرہی تھی۔ بڑی بی کے چہرے پر صفراوی زردی چھائی ہوئی تھی، مرجھائے ہوئے ہونٹ لٹکے ہوئے تھے۔ اور اس حالت میں وہ آرام کرسی میں پڑی ہوئی داھنے بائیں جھکولے کھا رہی تھیں۔ ان کی دھندلی آنکھوں میں بالکل بےخیالی جھلک رہی تھی۔ ان پر ایک نظر ڈال کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ بےپناہ بڑھیا داھنے بائیں جو جھکولے

کھا رہی ہے وہ خود سے نہیں بلکہ کسی غیبی مقناطیسی قوت سے ہل رہی ہے۔

اتنے میں اچانک ان کے مردنی چھائے چہرے پر ایسی تبدیلی نمودار ہوئی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہونٹوں کا لٹکنا، جھولنا بند ہو گیا اور آنکھوں میں چمک آگئی—بڑی بی کے سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔

"آپ ڈرئیے نہیں، خدا کے واسطے، آپ بالکل خوف نہ کیجئے!"، وہ دبی ہوئی آواز مگر صاف لہجے میں مخاطب ہوا۔ "آپ کو تکلیف پہنچانے کی نیت نہیں ہے میری — میں تو صرف اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی نظر عنایت چاہتا ہوں، صرف ایک عنایت کی نظر۔"

بڑی بی نے بہت غور سے اسے دیکھا، اور زبان سے کچھ نہ کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس کی التجا سنی ہی نہیں، ہرمان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ بڑھیا بہری تو نہیں ہے۔ وہ بالکل ان کے کان کے پاس منہ لے گیا اور پھر اس نے وہی لفظ دھرائے۔ بڑی بی اب بھی پہلے کی طرح خاموش تھیں۔

"آپ چاہیں تو مجھے ساری زندگی کے لئے نہال کر سکتی ہیں"، ہرمان نے التجا جاری رکھی "اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ تاش کے ایسے تین پتے جانتی ہیں جو ایک کے بعد ایک بازی مار سکتے ہیں..."

ہرمان نے بات یہیں توڑ دی۔ ظاہر تھا کہ نواب زادی سمجھ گئی ہیں کہ ان سے کس بات کی التجا کی جا رہی ہے۔ اور اب لفظ تلاش کر رہی ہیں کہ کیا جواب دیا جائے۔

"وہ تو محض ایک مذاق تھا"، آخر انہوں نے کہا "میں تم سے قسم کھا کے کہتی ہوں کہ وہ صرف ایک ڈھکوسلا تھا۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں ہو سکتی"، ہرمان نے سخت لہجے میں کہا "چپلیتسکی آپ کو یاد ہوگا جسے اس کی ہاری رقم جیت لینے میں آپ نے مدد دی تھی۔"

بڑی بی اس پر کچھ پریشان نظر آئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی زبردست جذباتی کیفیت ان کے چہرے پر جھلکی۔ لیکن ذرا دیر بعد وہ پھر اپنی اسی حالت میں ڈھلک گئیں۔

"کیا مجھے آپ ان تین پکے پتوں کے نام بتائیں گی؟" ہرمان نے سوال جاری رکھا۔

بڑی بی بالکل خاموش رہیں۔ ہرمان آگے بڑھا:

"بھلا آپ کس کے لئے یہ خزانہ دبائے بیٹھی ہیں۔ اپنے پوتوں پوتیوں کے لئے؟ آپ جانتی ہیں کہ وہ خود دولت‌مند ہیں۔ ان کے نزدیک روپے کی کیا قیمت۔ آپ کے بتائے ہوئے تین پتے کسی فضول خرچ کے کام نہیں آ سکتے۔ جو آدمی باپ کی دولت کو شاہ خرچیوں میں اڑا دے، وہ چاہے کتنی ہی شیطانی چالیں چلے لیکن غریبی میں مرے‌گا۔ میں فضول خرچ نہیں ہوں۔ روپے کی قدر کر سکتا ہوں۔ آپ مجھے بتا دیں‌گی تو آپ کا راز رائگاں نہ جائے‌گا۔ تو بتائیے!..."

اس نے بولنا بند کر دیا۔ مگر بے‌قراری اس بات کی تھی کہ کچھ تو جواب ملے۔ بڑی سرکار بالکل خاموش رہیں۔ ہرمان ان کے پیروں پر گر پڑا۔

"اگر آپ کے دل میں محبت کا ذرا سا بھی جذبہ کبھی رہا ہے، اگر آپ میں محبت کی ترنگوں کی ذرا بھی یاد باقی ہے، اگر آپ نوزائیدہ بیٹے کا رونا سن کر ایک بار بھی مسکرائی ہیں، اگر آپ کے سینے میں کچھ بھی انسانیت کی دھڑکن ہوئی ہے کبھی، تو میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بیوی کی حیثیت سے، محبوبہ کی حیثیت سے، ماں کی حیثیت سے، غرض زندگی میں جو کچھ مقدس اور عزیز ہے، اس سب کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ میری التجا مت ٹھکرائیے! اپنا راز مجھ پر کھول دیجئے! اگر خدا نخواستہ ایسا ہے کہ اس راز کے ساتھ کوئی خوف‌ناک گناہ وابستہ ہو، جس سے پروردگار کی برکتوں کا نزول بند ہونے کا اور شیطان سے وابستگی کا اندیشہ ہو، تو آپ اس کی پروا مت کیجئے۔ خود پر نظر کیجئے، آپ اپنی عمر

کو پہنچ چکی ہیں، بہت دن اب نہیں جیئیں گی۔ اور میں اس کے لئے آمادہ ہوں کہ آپ کا گناہ اپنے سر لے لوں — صرف آپ اپنا راز مجھ پر آشکار کر دیجئے۔ آپ اس پر نظر کیجئے کہ ایک انسانی وجود کی مسرت آپ کی مٹھی میں ہے۔ صرف میں ھی نہیں، میرے بچے، میرے پوتے پوتیاں اور ان کی بھی اولاد در اولاد ھمیشہ آپ کے لئے دعائے خیر کریں گے اور آپ کی یاد کو سینوں سے لگاتے رھیں گے...،،

بڑی بی نے ایک لفظ بھی منہ سے نہ کہا۔

ھرمان ان کے قدموں سے اٹھ کھڑا ھوا۔ ”چڑیل کہیں کی!،، اس نے دانت بھینچ لئے۔

”تو میں تجھ سے جواب لے کے رھوں گا!،،

ان لفظوں کے ساتھ اس نے جیب سے پستول نکال لیا۔

پستول پر نظر کرتے ھی بڑی بی نے دوبارہ سخت تشنج کی کیفیت کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنا سر پیچھے ڈھلکایا اور ھاتھ اوپر کر دیا گویا گولی سے آڑلے رھی ھوں... اور جھٹکے سے کرسی کی پشت پر لگ کر گر گئیں۔ اور بےحس وحرکت ھو گئیں۔

”دیکھئے — آپ کوئی چھٹولنی بچی نہیں ھیں!،، ھرمان نے بڑی سرکار کا ھاتھ تھام کر کہا۔

”اب میں آپ سے آخری بار پوچھتا ھوں: بولئے، آپ مجھے تاش کے ان تین پتوں کا نام بتا رھی ھیں یا نہیں؟ ھاں یا نہیں؟،،

بڑی سرکار کے لبوں سے کوئی جواب نہ ملا۔ ھرمان نے دیکھا کہ وہ ٹھنڈی ھو چکی تھیں۔

— ۴ —

بے اخلاق اور بےدین آدمی۔
خط و کتابت

لیزاویتا ایوانوونا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی، اور ابھی تک ناچ کی پوشاک میں ملبوس، گہری سوچ میں غرق تھی۔ جیسے ھی وہ حویلی واپس آئی اس نے فوراً اپنی اونگھتی

ہوئی خادمہ کو چھٹی دے دی، جو بے دلی سے خدمت انجام دینے کو تیار تھی، لیزاویتا ایوانوونا نے اس سے کہہ دیا کہ نہیں، میں خود کپڑے بدل لوں گی۔ پھر وہ دھڑکتے ہوئے دل سے سیدھی اپنے کمرے پہنچی۔ اسے توقع تھی کہ وہاں ہرمان بیٹھا ہوگا۔ مگر دل چاہتا تھا کہ وہ نہ ہو تو اچھا ہے۔ پہلی ہی نظر میں اس نے دیکھ لیا کہ وہ وہاں پر نہیں ہے۔ شکر ادا کیا کہ قسمت کے ستارے اچھے تھے جنہوں نے اس ملاقات میں رخنہ ڈال دیا۔ وہ لباس تبدیل کئے بغیر یوں ہی بیٹھ گئی اور اپنے ذہن میں جائزہ لینے لگی کہ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اسے اتنے تھوڑے سے عرصے میں اتنی دور تک پہنچا دیا تھا۔ ابھی اس دن کو پورے تین ہفتے بھی تو نہیں گزرے جب اس نے پہلی بار نوجوان انجنیر کو اپنی کھڑکی کے نیچے دیکھا تھا۔ اور اتنی جلدی وہ اس سے خط و کتابت پر اتر آئی۔ بلکہ رات کی ملاقات کا وعدہ بھی دے چکی۔ اگر اسے نوجوان کا نام معلوم تھا تو صرف اس لئے کہ بعض خطوں پر اس نے دستخط کر دئے تھے۔ ورنہ آج کی رات تک کبھی اس سے بات چیت کا بھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ آواز تک نہ سنی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اور یہ کیسی عجیب بات ہوئی کہ آج کے ناچ میں جب تومسکی اپنی نوجوان محبوبہ شہزادی پولینا کی اس بات پر چڑ گیا کہ وہ منہ کا مزا بدلنے کو کسی دوسرے سے چونچلے کرنے لگی تو وہ بھی انتقام لینے پر اتر آیا اور اس نے بے رخی دکھانی چاہی تو لیزاویتا ایوانوونا کو اپنے ساتھ ناچ کی دعوت دے دی۔ اور ”مازورکا“ کے لمبے تھکا ڈالنے والے رقص میں وہ اس کا ہاتھ پکڑے ناچتا رہا۔ ناچ کے وقت برابر لیزا کو چھیڑتا رہا کہ تم تو انجنیروں کی طرف جھکی ہوئی ہو۔ اور یہ بھی جتاتا رہا کہ اسے اتنا کچھ معلوم ہے جو وہ کبھی شاید گمان بھی نہیں کر سکتی۔ اس کے بعض اشارے کنائے ایسے چبھتے ہوئے تھے کہ لیزاویتا ایوانوونا باربار یہ قیاس کئے بغیر نہ رہ سکی کہ اس شخص کو میرے دل کا راز معلوم ہے۔

''تمھیں یہ سب کس نے بتایا؟'' اس نے ہنستے ہوئے تومسکی سے پوچھ ہی لیا۔

''کسی ایسے شخص کے دوست نے بتایا ہے جسے تم جانتی ہو'' تومسکی نے جواب دیا ''وہ بڑا بےپناہ آدمی ہے۔''

''بےپناہ آدمی کون ہوا بھلا؟''

''اس کا نام ہے ہرمان۔''

لیزاویتا ایوانوونا نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے ہاتھ پاؤں بالکل برف ہو گئے۔

''یہ جو شخص ہے ہرمان'' تومسکی بولتا رہا ''بڑا من چلا آدمی ہے۔ نپولین کا ناک نقشہ پایا ہے اس نے اور میفستوفلس کی روح۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم وہ تین جرموں کا بوجھ اپنے ضمیر پر لئے پھرتا ہے۔ کیوں تم پیلی کیوں پڑ گئیں؟..''

''میرے سر میں درد ہو رہا ہے... اس نے کیا کہا تھا آپ سے — کیا نام تھا اس کا — ہرمان؟ یہی بتایا؟''

''ہرمان اپنے دوست سے بےحد ناراض ہے: وہ کہتا ہے کہ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو بالکل مختلف قدم اٹھاتا... ویسے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہرمان کی نظر ہے آپ پر۔ کم از کم وہ اپنے دوست کے ان اشاروں کو، جن میں التفات پایا جاتا ہے، بڑی دل چسپی سے سنتا ہے۔''

''لیکن اس نے مجھے کہاں دیکھا ہوگا؟''

''گرجا گھر میں، شاید، یا ممکن ہے باہر سواری میں دیکھا ہو... خدا جانے، آپ کو کمرے میں ہی دیکھ لیا ہو جب آپ سو رہی ہوں۔ اس شخص سے سب کچھ ممکن ہے۔''

تین معزز خواتین ان کے پاس پہنچیں اور فرانسیسی میں پوچھا — ''کہئے، کیا لیتے ہیں آپ اوبلی یا ریگرے''*

---

* ''کادریل'' ناچ کے موقعے پر اپنی ساتھی کا انتخاب کرنے کے لئے ایک طرح اشارے کے ناموں میں قرعہ ڈال لیا جاتا ہے۔ ''اوبلی'' اور ''ریگرے'' اسی طرح کے اشارتی نام ہیں۔ (ایڈیٹر)

اور لیزاویتا ایوانوونا کی اس چبھتی ہوئی دلچسپ گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

تومسکی کے قزعے میں جس خاتون کا نام نکلا وہ خود شہزادی... تھیں۔ ناچ گھر کا پورا ایک چکر اور شہزادی کی کرسی کے سامنے ایک گردش، اتنے وقت میں دونوں کے درمیان صلح صفائی ہو گئی۔ اور جب تومسکی اپنی جگہ واپس پہنچا تو اسے نہ ہرمان سے دلچسپی رہ گئی تھی اور نہ لیزاویتا ایوانوونا سے۔ لیزاویتا ایوانوونا برابر اس فکر میں تھی کہ کسی طرح وہی گفتگو پھر چھڑے جو بیچ سے ٹوٹ گئی تھی، لیکن مازورکا ناچ ہی ختم ہو گیا۔ اور اس کے فوراً بعد بڑی سرکار وہاں سے رخصت ہونے کے لئے اٹھیں۔

تومسکی کی باتوں میں ناچ گھر کی چلتی ہوئی گفتگو کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن وہ اس جذباتی لڑکی کے دل میں گہری اتر گئیں۔ تومسکی نے جو خد وخال بیان کئے تھے وہ اس تصویر سے بالکل مل گئے جو خود لیزا نے اپنے ذہن میں بنائی تھی۔ اور اس ڈھچر کے آدمی نے، جسے آجکل کے ناولوں نے بہت عام کر رکھا ہے، لیزا کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی اور اس کے تصور پر طاری ہو گیا۔ وہ اپنے برہنہ بازو باندھے بیٹھی تھی، بالوں میں ابھی تک پھول ٹنکے ہوئے تھے۔ اور سر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ نیم برہنہ سینے پر جھول رہا تھا... اتنے میں دروازہ کھلا اور ہرمان داخل ہوا۔ وہ ایک دم لرز کر رہ گئی...

”آپ اب تک کہاں تھے؟“ اس نے خوف‌زدہ دبی آواز میں پوچھا۔

”میں بڑی سرکار کی خواب‌گاہ میں تھا“ ہرمان نے فوراً جواب دیا ”وہیں سے آ رہا ہوں۔ بڑی سرکار دنیا سے سدھار چکی ہیں۔“

”اف خدایا، آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟..“

”ہاں، اور ایسا لگتا ہے کہ میں ہی ان کی موت کا سبب ہوں۔“

لیزاویتا ایوانوونا نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ اور تومسکی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج گئے: ''وہ ایسا شخص ہے کہ کم سے کم تین جرائم کا بوجھ اپنے ضمیر پر لئے پھرتا ہے۔،، ہرمان اس کے برابر کھڑکی کی سل پر بیٹھ گیا اور وہاں بیٹھے بیٹھے سارا ماجرا سنا دیا۔

لیزاویتا ایوانوونا سہمی ہوئی اس کا بیان سنتی رہی۔ چنانچہ اب پتہ چلا کہ وہ محبت نہیں تھی جس نے ایسے جذباتی خط اس سے لکھوائے۔ وہ پراصرار تقاضے کرائے۔ اور اس طرح کھلم کھلا، علانیہ اور پیہم پیچھا کرایا۔ وہ تھا روپیہ، جس کے لئے اس کی روح تڑپ رہی تھی۔ وہ لیزا کی ذات نہ تھی جو اس کی بےصبری کو تسکیں دے سکتی اور اسے خوشی بخش سکتی۔ وہ دکھیا خواص بس اس کی رہ گئی تھی کہ ایک مجرم کا ہاتھ بٹائے اور اپنی محسن کے قاتل کی مدد کرے — وہ تڑپ کے رو پڑی کہ اس کے سینے میں پشیمانی کا درد مچلنے لگا۔ ہرمان خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ چوٹ اس کے دل پر بھی لگی مگر وہ اس غریب دکھیا لڑکی کے آنسوؤں کی چوٹ نہ تھی اور نہ اس کے حسن سوگوار کی ضرب تھی جس نے ہرمان کے پتھر دل پر اثر کیا۔ اسے بڑی بی کی موت پر بھی کوئی افسوس نہ تھا۔ بس ایک وجہ تھی جو اسے غم‌زدہ بنا رہی تھی کہ وہ راز جو اس کی امید کے مطابق اسے مالا مال کر دینے کو کافی تھا، اب ایسا گم ہوا ہے کہ پھر کبھی نہ مل سکے گا۔

''آپ شیطان ہیں!،، لیزاویتا ایوانوونا نے آخر اسے پھٹکارا۔

''نہیں — میری نیت بالکل نہ تھی کہ انہیں جان سے مار دوں،، ہرمان نے جواب دیا ''میرا پستول خالی تھا۔،،

اس پر دونوں خاموش ہو گئے۔

صبح ہونے لگی تھی، لیزاویتا ایوانوونا نے ٹمٹماتی ہوئی شمع بالکل بجھا دی۔ کمرے میں تڑکے کا ہلکا ہلکا پیلا اجالا آ رہا تھا۔ لیزا نے آنکھیں پونچھ ڈالیں جو روتے روتے سرخ ہو گئی تھیں اور ہرمان کے چہرے پر

نظر کی۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑکی کی سل پر ہاتھ باندھے اور غصے کے زہر میں بھرا بیٹھا تھا۔ اس انداز میں وہ قطعی نپولین کی تصویر سے مشابہ نظر آتا تھا۔ خود لیزاویتا ایوانوونا بھی اس مشابہت سے بڑی متاثر ہوئی۔

"اب آپ گھر سے باہر کیسے جائیں گے؟" آخر اس نے پوچھا۔ "میں نے سوچا تھا کہ آپ کو ایک پوشیدہ زینے سے باہر نکال لے جاؤں لیکن اس کے لئے بڑی سرکار کی خواب گاہ سے گزرنا پڑے گا اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں ڈرتی ہوں۔"

"آپ مجھے وہ پوشیدہ زینہ بتا دیجئے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔"

لیزاویتا ایوانوونا اٹھی، درازوں کے خانے کے پاس گئی، وہاں سے ایک کنجی نکالی اور ہرمان کے حوالے کر دی۔ اور پوری طرح سمجھا دیا کہ کیسے جانا ہے۔ ہرمان نے اس کا سرد اور بےحس و حرکت ہاتھ دبایا، اس کے جھکے ہوئے سر کے اوپر بوسہ دیا اور وہاں سے نکل گیا۔

وہ چکردار سیڑھی سے اترا اور پھر ایک بار بڑی سرکار کی خواب‌گاہ میں داخل ہوا۔ مردہ بڑھیا ابھی تک کرسی پر ایسے بیٹھی تھی جیسے پتھر کی ہو گئی ہو۔ اس کے چہرے پر گہرا سکون برس رہا تھا — ہرمان بڑی بی کے مردے کے سامنے ٹھیرا، نظر بھر کے انہیں دیکھا گویا دردناک حقیقت کی تصدیق کر لینا چاہتا ہو۔ آخر میں وہ مطالعہ کے کمرے میں گیا، دیوار میں کاغذ کے پیچھے دروازے کو ٹٹولا اور اندھی سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ اس کے تن بدن میں عجب طرح کی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جی میں سوچا، یہی اندھی سیڑھی ہوگی جس سے ہوکر ساٹھ سال پہلے کوئی آیا ہوگا اور اس خواب‌گاہ میں پہنچا ہوگا، عین اسی وقت۔ اور اس کے جسم پر لمبا زرکاری کا کوٹ ہوگا، اس کے بالوں میں لچھے پڑے ہوئے ہوں گے، اس کا تکونا ٹوپ سینے سے لگا ہوگا اور اس نے نوجوان دولت‌مند نواب‌زادی کا دل چرایا ہوگا۔ اور اب اسے قبر میں کیڑے کھا رہے ہیں اور اس کی

بوڑھی محبوبہ کا دل آج اپنی دھڑکن بند کر چکا ہے۔
سیڑھی کے نیچے ہرمان کو ایک دروازہ ملا جسے اس نے لیزا کی دی ہوئی چابی سے کھول لیا اور ایسی گزرگاہ میں نکل آیا جو گھر سے سیدھی سڑک پر نکلتی تھی۔

—ہ—

اسی رات مرحومہ نواب زادی
فان و... کفن پہنے خواب میں آئیں اور
بولیں ''آداب عرض ہے جناب والا!''
شویدن برگ

اس جان لیوا رات کے تین دن بعد صبح کو نو بجے ہرمان فلاں خانقاہ میں گیا جہاں مرحومہ نواب‌زادی کی میت کی آخری رسمیں ادا ہونی تھیں۔ یہ سہی کہ اسے کوئی ندامت یا پچھتاوا محسوس نہیں ہوا تاہم ضمیر کی آواز کو گھونٹ دینا بھی اس کے بس سے باہر تھا۔ ضمیر اس سے کہتا تھا: تم ہی تو ہو جس نے بڑھیا کو جان سے مار دیا۔ اس میں خلوص قلب سے دین ایمان کم ہی تھا لیکن توہمات تو بہت تھے۔ اسے یقین تھا کہ مرحومہ نواب‌زادی اس کی زندگی پر کوئی مضر اثر ضرور ڈالیں گی اور اسی لئے ہرمان نے طے کیا کہ ان کے جنازے میں شرکت کرے تاکہ اپنے گناہ کی معافی مانگ سکے۔
گرجا گھر بھرا ہوا تھا لوگوں سے۔ سوگواروں کے مجمع میں اسے مشکل سے آگے بڑھنے کا راستہ ملا۔ تابوت ایک قیمتی چبوترے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے اوپر مخمل کی چادر پڑی تھی۔ مرحومہ کی میت اس میں رکھی تھی اور ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔ وہ سفید ساٹن کے کفن اور لیس کی ٹوپی میں ملبوس تھیں۔ گھروالے انہیں گھیرے ہوئے تھے: ملازموں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اور ماتمی فیتے ان کے کاندھوں پر پڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں شمعیں اٹھا رکھی تھیں۔ مرحومہ کے رشتہ‌دار، ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد، سب کے سب نہایت سوگوار

تھے ۔ کسی کی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکتا تھا ۔ کیونکہ کوئی روتا تو اس کے آنسو * une affectation سمجھے جاتے ۔ بڑی سرکار اتنی بوڑھی ہو چکی تھیں کہ ان کی موت سے کسی کو تعجب نہ ہوا اور خود ان کے رشتہ‌دار ایک زمانے سے یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ اپنی عمر پوری کر چکی ہیں ۔ ایک نوعمر پادری نے ان کی آخری رسم ادا کی ۔ اس نے سادہ اور اثر انگیز جملوں میں پاک پاکیزہ مرنے والی کی پرسکون موت کا حال بیان کیا کہ انہوں نے اتنی عمر پائی کہ ایک عیسائی جیسی موت کے لئے پرسکون اور مؤثر تیاری کر سکیں ۔ پادری نے کہا ''موت کے فرشتے نے انہیں بیدار پایا، وہ تہجد کی حالت میں تھیں ۔ اور آدھی رات کے دولہا کا انتظار کر رہی تھیں ۔،، نماز جنازہ سوگ کی کیفیت میں ختم ہو گئی تو سوگواروں کو مرحومہ کا منہ دکھانے کی آخری رسم بھی ادا ہوئی ۔ جو ان کے رشتہ‌دار تھے وہ پہلے منہ دیکھنے کو بلائے گئے ۔ ان کے بعد بےشمار مہمانوں کی باری آئی جو ایک ایک کرکے تابوت کی طرف بڑھے، یہ لوگ وہ تھے جو اس ہستی کو آخری خراج عقیدت پیش کرنے آئے تھے، جو ایک زمانے سے ان کی فضول کی تفریحات میں شریک ہوا کرتی تھی ۔ ان کے بعد مرحومہ کے ملازموں کا نمبر آیا ۔ آخر میں تابوت کے پاس مرحومہ کی عمر کی بوڑھی ماما آئی ۔ دو نوجوان خادمائیں اس بوڑھی ماما کو بازوؤں سے تھامے ہوئے تھیں ۔ اس میں اتنا بھی دم نہ رہا تھا کہ زمین تک جھک سکتی اور سب میں وہی ایک اکیلی تھی جس نے اپنی مرحومہ مالکن کے ٹھنڈے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے آنسو کی چند بوندیں ٹپکائیں ۔ اس بڑھیا کے بعد ہرمان نے جرأت کرکے تابوت کے پاس قدم بڑھایا ۔ وہ زمین پر جھکا ۔ اور کئی لمحہ تک صنوبر کے کانٹوں بھرے ٹھنڈے فرش پر سر بسجود رہا ۔ اس کے بعد جب وہ اٹھا، تو خود مرحومہ کی طرح پیلا ہو رہا تھا،

---

* دکھاوے کے ۔

تابوت کے چبوترے کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ اور جھک گیا... اسے ایسا لگتا تھا جیسے مرحومہ نے عجب معنیٰ‌خیز نظروں سے اسے دیکھا اور آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا تو سیڑھی پر ٹھیک سے قدم نہیں پڑا اور وہ زمین پر چاروں شانے چت گرا۔ خیر، لوگوں نے اسے اٹھایا۔ عین اسی لمحے لیزاویتا ایوانوونا کو گرجا گھر کی برساتی میں اٹھا کر لایا گیا، اس پر غشی کی حالت طاری ہو گئی تھی۔ اس حادثے نے چند لمحوں کے لئے ماتمی رسم کی آن بان میں خلل ڈال دیا۔ مجمع میں بہت سی آوازیں گونجنے لگیں، کھسر پھسر ہوئی اور ایک دبلے پتلے درباری بزرگ نے جو مرحومہ کے رشتہ‌داروں میں سے تھے، اپنے برابر کھڑے ہوئے کسی انگریز کے کان میں کہا کہ یہ نوجوان انجنیر اصل میں مرحومہ کا درپردہ فرزند ہوگا۔ جواب میں انگریز نے بے‌تعلقی کا ''ہوں،، کر دیا۔

سارے دن ہرمان پر حد سے گزری ہوئی طوفانی کیفیت طاری رہی۔ اس نے ایک سنسان سے شراب‌خانے میں کھانا کھایا۔ اور اپنے دستور کے خلاف بہت زیادہ پی گیا کہ شاید اسی کے گھونٹوں میں اس کی فکرمندی ڈوب جائے۔ لیکن شراب نے اس کے تخیلات کے لئے اور مہمیز کا کام کیا۔ جیسے ہی ہرمان اپنے گھر لوٹا اس نے یوں ہی کپڑے پہنے پہنے خود کو بستر پر ڈال دیا اور گہری نیند سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو ابھی رات تھی۔ کمرے میں چاندنی چھن رہی تھی۔ اس نے اپنی گھڑی کو دیکھا، ابھی پونے تین بجے تھے۔ اب اسے نیند نہیں آ رہی تھی، وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور مرحومہ بڑی سرکار کی تجہیز و تکفین کے وقت کا خیال کرتا رہا۔

سڑک پر ٹھیک اسی وقت کسی نے کھڑکی سے جھانکا اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ ہرمان نے اس بات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ منٹ بھر بعد اسے ڈیوڑھی کا دروازہ کھلتا سنائی دیا۔ اس نے سوچا، میرا اردلی ہوگا، حسب

معمول نشے میں دھت آیا ہوگا رات کی عیاشیوں سے فارغ ہوکر، لیکن کچھ اجنبی سی چاپ سنائی دی۔ کوئی بہت ہلکے ڈھیلے ڈھالے سلیپر پہنے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور سفید لباس میں ایک خاتون داخل ہوئی۔ ہرمان کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو، یہ میری پرانی نرس ہے اور اسے تعجب ہوا کہ بھلا ایسے نا وقت اس کا یہاں آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ لیکن سفید لباس کی عورت اور دو قدم آگے بڑھی اور اچانک بالکل ہی اس کے نزدیک آ گئی۔ ہرمان نے پہچان لیا — یہ وہی مرحومہ تھیں!

''میں اپنی مرضی کے خلاف تمہارے پاس آئی ہوں،، انہوں نے دبنگ آواز میں کہا ''مجھے حکم ملا ہے کہ تمہاری التجا پوری کر دوں۔ سنو تمہارے وہ جیتنے والے پتے یہ ہیں: تگی، ستا، اور اکا، یکے بعد دیگرے — لیکن صرف ایک شرط ہے کہ ایک دن میں ایک سے زیادہ پتے پر بازی مت لگانا اور جب تینوں پتے کھیل چکو تو پھر ساری عمر تاش کو چھونا نہیں ہرگز۔ میں تمہیں اپنا خون بھی معاف کرتی ہوں مگر اس شرط پر کہ تم میری ہمدم خواص لیزاویتا ایوانوونا سے شادی کر لینا...،،

ان لفظوں کے ادا کرتے ہی وہ آہستہ سے دروازے کی طرف مڑی اور باہر نکل گئی۔ ہرمان نے باہر کے بڑے دروازے کا بھڑنا سنا اور دیکھا کہ کوئی تھا جو اسی کھڑکی سے دوبارہ کمرے میں جھانکا۔

بہت دیر تک ہرمان کے ہوش و حواس بجا نہیں ہوئے۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ اردلی فرش پر پڑا خراٹے لے رہا ہے، اسے بہت مشکل سے اس نے جھنجھوڑ کر جگایا۔ حسب معمول وہ نشے میں چور تھا۔ اس سے کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔ برساتی میں کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ ہرمان اپنے کمرے میں واپس گیا، شمع روشن کی اور خواب کا یہ ماجرا پوری طرح قلم بند کر لیا۔

— صبر کرو!
— کیا؟ آپ کی یہ ہمت کہ مجھ سے کہیں صبر کرو!
— جی نہیں حضور والا، میں نے عرض کیا، ذرا صبر فرمائیے!

ہم لوگوں کی جو اخلاقی فطرت ہے اس میں دو اٹل تصورات ایک ساتھ برقرار نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح جیسے کہ ہماری جسمانی فطرت میں دو جسم بہ یک وقت ایک ہی جگہ پر نہیں ہو سکتے۔ تگی، ستے، اور اکے نے ہرمان کے تصورات میں پھر اسی بوڑھی مرحومہ کو طاری کر دیا۔ تگی، ستا اور اکا برابر اس کی دماغ پر حاوی تھے اور ہونٹوں پر یہی لفظ رواں ہو گئے تھے۔ ایک لڑکی اسے نظر آئی وہ بولا ''واہ کیا سلیقے کی لڑکی ہے — بالکل پان کی تگی!،، کسی نے پوچھا ''کیا وقت ہوگا اب؟،، ہرمان نے جواب دیا ''ستے میں پانچ منٹ ہیں۔،، ہر بڑی توندوالے شخص کو دیکھ کر فوراً اس کا خیال اکے کی طرف جاتا۔ تگی، ستے اور اکے نے اس کے خواب و خیال کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا کہ طرح طرح کی شکلوں میں وہی ابھرتے تھے۔ تگی اس کی آنکھوں کے سامنے ایسے کھلتی جیسے کوئی بہت بڑا پھول ہو۔ ستا پرانے جرمن (گوتھک) طرز تعمیر کی کمانی کی طرح ابھرتا۔ اور اکا بہت بڑی سی مکڑی نظر آتا۔ سارے کے سارے خیالات صرف ایک ہی خیال میں بس گئے تھے کہ کسی طرح اس راز سے فائدہ اٹھا لیا جائے جو اتنا مہنگا پڑا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ کام چھوڑ چھاڑ کر سفر کرے۔ اس کی تمنا تھی کہ پیرس کے پبلک جوے خانوں میں جو دنیا بھر کی لوٹی ہوئی دولت اکٹھی ہے وہاں ہاتھ مارے اور خزانے کا خزانہ صاف کر دے۔ وہ سوچتا رہا، اتفاق ایسا ہوا جس نے اس کو اپنی ادھیڑبن سے نجات دلا دی۔

اس زمانے میں ماسکو میں دولت مند جواریوں کی ایک سوسائٹی تھی جس کا صدر مشہور جواری چکالینسکی تھا۔ یہ وہی شخصیت تھی جس نے اپنی ساری عمر تاش کے پتوں میں گزار دی تھی۔ اور لاکھوں کروڑوں کی رقم سمیٹ لی تھی۔ یعنی خود اپنے ہاتھ سے نقد ہار کر اس نے قرض ناموں میں لکھی ہوئی رقمیں جیتی تھیں۔ اس کے تجربے اور ہوشیاری کی بدولت ساری ہم پیشہ برادری میں چکالینسکی کی ساکھ تھی اور مہمان نوازی، مشہور باورچی، خوش اخلاقی اور زندہ دلی ایسی صفات تھیں جن سے لوگوں میں بھی اس کی بنی ہوئی تھی۔ وہ خود پیٹرسبرگ آیا، نوجوانوں کا جھمگٹ لگ گیا۔ بہتوں نے ناچ گھر کے پروگرام اس کے ہاں تاش کے کھیل پر قربان کر دئے۔ جوے کی ترغیب نے لڑکیوں کی میٹھی میٹھی باتوں کو شکست دے دی۔ نروموف ہرمان کو بھی چکالینسکی کے ہاں لےکر پہنچا۔

وہ دونوں ان شاندار کمروں کی قطار سے ہوتے ہوئے گزرے جن پر شائستہ ملازمین کا پہرہ تھا۔ کچھ جنرل اور پریوی کونسل کے ممبر وہسٹ کھیل رہے تھے۔ نوجوان تماشائی مشجر چڑھے صوفوں پر دراز تھے پائپ کے دھویں اڑا رہے تھے اور آئس کریم چل رہی تھی۔ میزبان، ڈرائنگ روم میں ایک لمبی چوڑی میز پر تاش کے پتے بانٹ رہا تھا جس کے گرد کوئی بیس جواریوں کی ٹکڑی پھیلی تھی۔ خود میزبان نہایت سلیقے کی شکل صورت کا ساٹھ سالہ آدمی تھا۔ بالوں پر سفیدی پھر گئی تھی لیکن بھرے بھرے چہرے، اور ناک نقشے کی تازگی سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہنس مکھ اور خوش مزاج آدمی ہے۔ آنکھیں روشن تھیں اور ان میں ہمیشہ مسکراہٹ کی آب و تاب رہتی تھی۔ نروموف نے ہرمان کو اس سے ملایا۔ چکالینسکی نے گرمجوشی سے ہرمان کا ہاتھ دبایا اور کہا کہ آپ صرف تماشائی نہ بنئے اور خود کھیل میں لگا رہا۔

بازی لمبی تھی۔ میز پر کوئی تیس سے زیادہ پتے پڑے تھے۔ چکالینسکی ہر ایک چال پر ذرا تھم کے سوچتا

تھا تاکہ کھیلنے والوں کو اپنے ہاتھ کے پتے دیکھ لینے کی مہلت مل جائے۔ ہار جیت کاغذ پر لکھ لیتا تھا۔ جو شخص بھی کچھ کہنا چاہتا اس کی طرف توجہ سے کان بڑھا دیتا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی پتوں پر جو کسی کے ہاتھ میں دبنے سے شکن پڑ جاتی یا کونا مڑ جاتا، اسے بھی خوش اسلوبی سے درست کرتا جاتا۔ آخر بازی ختم ہوئی۔ چکالینسکی نے پتے پھینٹے تاکہ اگلی بازی کی تیاری ہو جائے۔

"میں بھی ایک پتہ کھیلنا چاہوں گا، اگر آپ اجازت دیں" ہرمان نے تاش کی میز پر ایک موٹے سے بزرگوار کے پیچھے سے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ چکالینسکی مسکرایا اور اس نے سر جھکایا جس کا مطلب تھا کہ — بہت خوب! نروموف نے مسکرا کر ہرمان کو مبارکباد دی کہ چلو آخر آج تمھاری توبہ ٹوٹی۔ خدا کرے جیت میں رہو۔

"میں تیار ہوں!" ہرمان نے کہا اور پتہ بڑھا کر میز پر چاک سے بازی کی رقم لکھ دی۔

"یہ کیا؟" چکالینسکی کی تجوری سنبھالنے والے نے اپنی آنکھیں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "یقین نہیں آتا کہ میں نے آپ کی لکھی ہوئی رقم صحیح پڑھ لی ہے۔"

"۴۷ ہزار روبل" ہرمان نے جواب دیا۔

ان لفظوں کا سننا تھا کہ سب کی گردنیں فوراً مڑیں اور سب کی آنکھیں ہرمان پر گڑ گئیں۔

"دماغ چل گیا اس کا" نروموف نے جی میں سوچا۔

"آپ مجھے یہ عرض کرنے دیجئے کہ" چکالینسکی نے اپنی حسب معمول مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آپ کی بازی بہت اونچی ہے۔ آج تک کبھی کسی نے ہمارے یہاں دو سو پچھتر سے زیادہ کا سادہ ہاتھ نہیں کھیلا۔"

"تو کیا ہوا؟" ہرمان نے جواب دیا "تو آپ کھیلیں گے یا نہیں؟"

چکالینسکی نے اس طرح سر جھکایا جیسے انکساری سے کھیلنا قبول کر رہا ہو۔

''میں آپ سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ مجھے اپنے دوستوں کے اعتبار کی عزت حاصل ہے اس لئے میں صرف نقد ہی کھیلتا ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں بذات خود آپ کے الفاظ پر بھروسہ کر سکتا ہوں لیکن دستور ایسا بندھ گیا ہے اور اس لئے بھی کہ بعد میں غلطفہمی نہ ہو، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اپنی رقم میز پر رکھ دیجئے۔''

ہرمان نے اپنی جیب سے بینک نوٹ نکالا اور چکالینسکی کے حوالے کردیا۔ اور اس نے نوٹ پر سرسری سی نظر ڈالی اور اسے ہرمان کے کارڈ پر رکھ دیا۔

بازی جم گئی۔ داھنے ھاتھ پر نہلا پڑا تھا اور بائیں پر تگی۔

''مار دیا!'' ہرمان نے اپنے ھاتھ کا پتہ دکھاتے ہوئے کہا۔

کھلاڑیوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ چکالینسکی کو ناگواری ضرور ہوئی لیکن فوراً ہی مستقل مسکراہٹ اس کے چہرے پر واپس آ گئی۔

''کیا آپ کو یہ رقم ابھی دے دی جائے؟'' ہرمان سے اس نے سوال کیا۔

''جی ہاں، اگر زحمت نہ ہو تو۔''

چکالینسکی نے بینک نوٹوں کا ایک بنڈل اپنی جیب سے کھینچا اور ۴۷ ہزار اوپر تلے گن دئے۔ ہرمان نے اپنی جیت کی رقم سنبھالی اور وہاں سے اٹھ گیا۔ نروموف بالکل ہی حواس باختہ ہو گیا۔ ہرمان نے لیمن کے شربت کا ایک گلاس پیا اور گھر چل دیا۔

دوسرے دن شام کو وہ پھر چکالینسکی کے ہاں نمودار ہو گیا۔ خود میزبان ہی کھیل چلا رہا تھا۔ ہرمان سیدھا میز تک پہنچ گیا۔ دوسرے کھلاڑیوں نے اسے فوراً جگہ دے دی۔ چکالینسکی نے خوش اخلاقی کے ساتھ اسے جھک کر سلام کیا۔

ہرمان کو اب نئی بازی کا انتظار تھا۔ اس نے اپنا پتہ بڑھا دیا۔ اس پر ۴۷ ہزار روبل کی رقم تھی اور

اس کے علاوہ پچھلی شام کی جیتی ہوئی رقم بھی۔

چکالینسکی نے پتے پھیلائے۔ داھنے ھاتھ پر غلام تھا اور بائیں پر ستا۔

ہرمان نے ستا الٹ دیا۔

ہر شخص کے سینے میں سانس اٹک گیا۔ چکالینسکی اک ذرا بل کھا کر رہ گیا۔ اس نے چورانوے ہزار کے نوٹ گنے اور ہرمان کے حوالے کر دئے۔ ہرمان نے بڑے اطمینان اور سکون سے ان نوٹوں کے بنڈلوں کو اٹھایا اور فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔

تیسرے دن شام کو ہرمان پھر وہیں میز پر بیٹھا تھا۔ ہر ایک کو امید تھی کہ وہ آئے گا۔ جنرلوں اور پریوی کونسل کے ممبروں نے اسے دیکھتے ھی وھسٹ میں ربر کا کھیل چھوڑ دیا کہ اس عجیب و غریب بازی کا تماشا دیکھیں۔ نوجوان افسر اپنے اپنے صوفوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اٹھنے بیٹھنے کے کمرے میں سب کے سب شاگرد پیشہ اکٹھے ہو گئے۔ ہر شخص ہرمان پر جھکنے لگا۔ دوسرے کھلاڑیوں نے بازی بدنے سے ھاتھ روک لیا اور منتظر ہو گئے کہ دیکھیں یہ بازی کیسے چلتی ہے۔ ہرمان میز کے پاس کھڑا تھا اور تیار تھا کہ اکیلا چکالینسکی کے سامنے کھیل کا ھاتھ دکھائے۔ چکالینسکی کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا مگر وہ حسب معمول مسکرائے جا رہا تھا۔ دونوں نے تاشوں کی نئی گڈیاں کھولیں۔ چکالینسکی نے پتے پھینٹے۔ ہرمان نے پتے کھینچے اور اپنے پتہ ڈال دیا۔ اس پتے پر بینک نوٹوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے دو فریقوں کے درمیان جان کی بازی لگی ہوئی ہے۔ سارے کمرے میں سناٹا ہو گیا تھا۔

چکالینسکی نے کھیلنے کو ھاتھ بڑھایا تو ھاتھ کانپ رہا تھا۔ داھنے ھاتھ رانی نکلی اور بائیں ھاتھ اکا۔

”اکا مارتا ہے،، ہرمان نے جواب دیا اور اپنا کارڈ دکھایا۔

”جی نہیں، آپ کی بیگم مرتی ہے،، چکالینسکی نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا۔

هرمان ہکا بکا رہ گیا ۔ واقعی اکے کے بجائے وہاں حکم کی بیگم کا پتہ پڑا تھا ۔ اسے مشکل سے اپنی آنکھوں پر یقین آیا، اسے حیرت تھی کہ بھلا، ایسی فاش غلطی مجھ سے کیوں کر ہو گئی ۔

اور اچانک اسے ایسا محسوس ہوا کہ حکم کی بیگم آنکھیں بھینچ رہی ہے اور اس پر ہنس رہی ہے ۔ وہ اس غیر معمولی مشابہت سے چونک اٹھا ۔

''افوہ، بڑی بی!،، وہ دہشت کے مارے چیخا ۔

چکالینسکی نے اپنی جیت کی رقم اپنی طرف سرکا لی ۔ ہرمان ایسے کھڑا تھا جیسے سکتا ہو گیا ہو ۔ جب وہ میز پر سے اٹھ کر چلا تو ہر شخص زور زور سے بات کرنے لگا ۔ ''واہ، کیا کھیل ہوا ہے!،، کھلاڑیوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔ چکالینسکی نے پھر پتوں کو پھینٹا ۔ کھیل حسب معمول چلتا رہا ۔

خاتمہ

هرمان پاگل ہو چکا ہے ۔ وہ ابوخوف ہسپتال کے وارڈ نمبر ۱۷ میں پڑا ہے ۔ جب اس سے کوئی بات پوچھی جاتی ہے، جواب نہیں دیتا ۔ صرف بڑبڑاتا رہتا ہے اور تیزی سے باربار یہی لفظ چبائے جاتا ہے: ''تگی، ستا، اکا... تگی، ستا، بیگم!..،،

لیزاویتا ایوانوونا نے ایک تربیت یافتہ مہذب نوجوان سے شادی کر لی ہے ۔ اس کا شوہر سرکاری دفتر میں ملازم ہے اور باپ دادا کا ورثہ بھی اچھا خاصا پایا ہے ۔ مرحومہ نواب‌زادی کے ہاں جو بڑا خانساماں تھا، لیزا کا شوہر اس خانساماں کا بیٹا ہے ۔ لیزاویتا ایوانوونا ایک غریب رشتہ‌دار لڑکی کو بھی پال پوس رہی ہے ۔

تومسکی کو کپتان کے عہدے پر ترقی مل گئی ہے ۔ اور وہ شہزادی پولینا سے شادی کرنے والا ہے ۔

۱۸۳۴ء

دوبرووسکی

پہلی جلد

پہلا باب

چند برس پہلے کی بات ہے، کیریلا پترووچ ترویئے کوروف نامی ایک پرانی وضع کا روسی جاگیردار اپنی جاگیر میں رہتا تھا۔ اس کی دولت، سلسلہ نسب اور اثر و رسوخ نے اس کو اس صوبے کا ایک بھاری بھرکم آدمی بنا دیا تھا۔ اس کے پڑوسی اس کی ہر ہر خواہش پوری کرکے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بچھے جاتے تھے۔ اس کا نام ھی سن کر صوبے کے حکام کانپ اٹھتے تھے۔ اور کیریلا پترووچ اس پاس و ادب کو اپنا حق تصور کرتا تھا۔ اس کا گھر ہمیشہ مہمانوں سے بھرا رہتا جو اس کی رئیسانہ وقت گزاری میں ھاتھ بٹانے اور اس کی دلچسپیوں اور تفریح میں حصہ لینے کے لئے مستعد رہتے تھے۔ یہ رنگ رلیاں ہمیشہ ہلڑبازی اور شور و غل سے بھری ہوتیں اور اکثر تو ان میں وحشیانہ قسم کا طوفان بدتمیزی پیدا ہو جاتا۔

کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی دعوت سے انکار کر دے یا خاص خاص دن، اس کے گاؤں پوکرووسکوئے جا کر اس کو سلام بجا لانے میں چوک جائے۔ اپنی گھریلو زندگی میں وہ ایسی طبیعت کی تمام خامیوں کا اظہار کرتا جو تعلیم کی جلا سے محروم رہ گئی ہو۔ چونکہ سبھی اس کو ھاتھوں ھاتھ لیتے تھے اور وہ ناز و نعم میں

پروان چڑھا تھا اس لئے وہ اس کا عادی ہو گیا تھا کہ اپنی من موجی طبیعت کی ہر امنگ پوری کرے۔ وہ دماغ میں آئی ہوئی ہر اسکیم کو پورا کرکے ہی دم لیتا تھا حالانکہ اس کے دماغ میں کوئی خاص جولانی نہ تھی۔ ہٹا کٹا ہونے کے باوجود وہ متواتر خوب ٹھونس ٹھونس کر کھانے کی بدولت ہر تین چار دن پر بیمار پڑ جاتا اور روزانہ رات کو نشے میں مدھوش سا ہو جاتا۔ اس کے مکان کے ایک بازو میں سولہ کنیزیں رہتی تھیں۔ وہ اپنی صنف کے مطابق موزوں مشغلے میں محو رہتیں یعنی کڑھائی کا کام کرتی رہتیں۔ اس بازو کی کھڑکیوں کو لکڑی کی سلاخوں سے محفوظ کر دیا گیا تھا اور دروازوں پر تالے پڑے رہتے تھے۔ ان کی کنجیاں خود کیریلا پترووچ کے قبضے میں رہتی تھیں۔ خاص خاص وقتوں میں ان کو، دو بوڑھی عورتوں کی نگہبانی میں، باغ میں ٹہلنے کی اجازت تھی۔ تھوڑے تھوڑے عرصے پر کیریلا پترووچ ان کے لئے بر ڈھونڈ نکالتا تھا اور ان کی جگہ نئی لڑکیاں آ جاتی تھیں۔

وہ اپنے کسانوں اور نوکروں سے سختی سے پیش آتا اور من مانی کرتا۔ لیکن وہ سب اس کے وفادار تھے۔ ان کو اپنے مالک کی دولت اور نام و نمود پر بڑا ناز تھا اور اس کی پناہ کے بل پر وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بڑی دراز دستیاں کر بیٹھتے تھے۔

اپنی وسیع جاگیر میں شکار کھیلنا، لمبی لمبی ضیافتیں اور دعوتیں اڑانا اور روزانہ کسی نئے دوست کا مذاق اڑا کر اس کی درگت بنانا، تروئے کوروف کا خاص مشغلہ تھا۔ حتی کہ اس کے پرانے دوست بھی اس کی اس تفریح کی زد سے ہمیشہ محفوظ نہ رہتے تھے۔ ہاں اکیلا اندری گاوریلووچ دوبرووسکی اس سے مستثنی تھا۔ گارڈ دستے کا یہ سبکدوش افسر دوبرووسکی تروئے کوروف کا قریب ترین ہمسایہ اور ستر کمیروں کا مالک تھا۔ اعلی ترین عہدے داروں سے بھی تروئے کوروف بڑی شان و تمکنت سے پیش آتا تھا۔ لیکن دوبرووسکی سے اس کا برتاؤ اس کی معمولی حیثیت کے

باوجود عزت و احترام کا تھا۔ دونوں بہت پہلے اپنی فوجی زندگی میں ایک دوسرے کے گہرے یار تھے اور تروئےکوروف اپنے دوست کے غیر متحمل اور ضدی مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ حالات نے ایک زمانے تک ان کو جدا رکھا۔ دوبرووسکی بعض ایسے معاملات میں پھنس گیا تھا کہ اسے فوج سے سبکدوش ہونا پڑا اور اس نے اسی گاؤں میں جو اس کا کل اثاثہ تھا سکونت اختیار کر لی۔ جب کیریلا پترووچ کو یہ ماجرا معلوم ہوا تو اس نے فوراً اس کو اپنی پناہ میں لینے کی پیش‌کش کی لیکن دوبرووسکی نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے غریب اور آزاد رہنے کو ترجیح دی۔ چند برس بعد تروئےکوروف جنرل کی حیثیت سے سبکدوش ہو کر اپنی جاگیر پر واپس آیا اور دونوں دوست اپنے دو بارہ ملاپ پر بہت خوش ہوئے۔ ایک دن بھی ایسا نہ گذرتا کہ وہ ایک دوسرے سے نہ ملتے اور کیریلا پترووچ جو کسی کو بھی اپنی تشریف‌آوری سے اعزاز نہ بخشتا تھا، اکثر اس سے ملنے کے لئے اس کے معمولی قسم کے گھر میں آن دھمکتا۔ دونوں ایک ہی عمر کے تھے۔ دونوں ایک ہی سوسائٹی کے فرد تھے، اور ایک ہی طرح ان کی نشو و نما ہوئی تھی۔ ان کے مزاج و مذاق میں کچھ یکسانیت بھی تھی۔ بعض لحاظ سے تو ان کی زندگی بھی ایک ہی رنگ کی تھی: دونوں نے عشق کی بنا پر شادی کی تھی، دونوں شادی کے بعد جلد ہی اپنی اپنی بیوی کھو بیٹھے تھے، دونوں کے ایک ایک اولاد تھی۔ دوبرووسکی کا لڑکا پیٹرسبرگ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور کیریلا پترووچ کی لڑکی باپ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ کیریلا پترووچ دوبرووسکی سے یوں کہتا: ”دیکھو بھائی اندری گاوریلووچ! اگر تمہارا ولودیا اچھا لڑکا نکلا تو میں اپنی ماشا کا بیاہ اس سے کر دوں‌گا حالانکہ وہ نرا کنگال ہے۔“ اندری گاوریلووچ اپنا سر ہلاتا اور جواب دیتا: ”نہیں کیریلا پترووچ۔ میرا ولودیا ماریا کیریلوونا کے جوڑ کا نہیں۔ اس کے جیسے غریب شریف‌زادے کے لئے تو ایک غریب شریف زادی سے ہی شادی کرکے گھر کا سردار بننا اس

سے کہیں بہتر رہیگا کہ وہ لاڈ پیار میں بگڑی ہوئی
ایک اچھی سی خاتون کا خدمتگار بن جائے۔،،

مغرور تروئےکوروف اور غریب دوبرووسکی کے درمیان شیر و شکر جیسی ہم آہنگی کو ہر شخص رشک کی نظر سے دیکھتا اور جب کیریلا پترووچ کی میز پر اس کی پروا کئے بغیر کہ آیا اس کی بات میزبان کی رائے کے مطابق ہے یا نہیں، وہ بےدھڑک اپنی رائے کا اظہار کر دیتا تو لوگ دانتوں میں انگلی دبا کر دیکھتے رہ جاتے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے لیکن کیریلا پترووچ ایسی غضبناک نظروں سے انہیں دیکھتا کہ ان کی سٹی گم ہو جاتی اور آئندہ کبھی ایسا کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ دوبرووسکی واحد آدمی تھا جس پر اس مسلمہ قانون کا اطلاق نہ ہوتاتھا۔ لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ سب کچھ اتھل پتھل ہو کر رہ گیا۔

خزاں کا آغاز تھا کہ ایک دن کیریلا پترووچ نے شکار کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ایک دن پہلے ھی خدمتگاروں اور شکاریوں کو حکم مل گیا تھا کہ اگلی صبح پانچ بجے کوچ کے لئے تیار ہو جائیں۔ رھائشی خیمہ اور سفری باورچی خانے کا خیمہ پہلے ھی اس مقام پر روانہ کر دئے گئے تھے جہاں کیریلا پترووچ کا ارادہ کھانا کھانے کا تھا۔ میزبان اور مہمان کتاگھر دیکھنے گئے جہاں پانچ سو سے زیادہ شکاری کتے گرم اور آرامدہ جگہ میں زندگی بسر کرتے تھے اور بےزبانی کی زبان میں کیریلا پترووچ کی فیاضی کے گن گاتے تھے۔ وھاں بیمار کتوں کے لئے ایک شفا خانہ بھی تھا جس کی نگرانی جانوروں کے ڈاکٹر تیموشکا کے سپرد تھی۔ ایک خاص حصہ تھا جہاں اعلی نسل کی کتیاں بچے جنتی تھیں اور ان کو دودھ پلاتی تھیں۔ کیریلا پترووچ اپنے اس شاندار ادارے پر بڑا اتراتا تھا اور اس کے بارے میں اپنے مہمانوں کے سامنے ڈینگیں مارنے کا کوئی موقع ھاتھ سے نہ جانے دیتا

حالانکہ ان مہمانوں میں سے ہر ایک کم از کم بیس بار اس کی زیارت کر چکا تھا۔ اب وہ اپنے مہمانوں کے ہجوم میں گھرا کتا گھر کے چکر لگا رہا تھا۔ تیموشکا اور کتا گھر کے جمعدار اس قافلے میں شامل تھے۔ وہ بعض احاطوں کے سامنے رکتا اور بیمار کتوں کی مزاج پرسی کرتا اور ان کو سخت لیکن بجا تنبیہ بھی کرتا جاتا یا پھر بعض محبوب کتوں کو اپنے پاس بلاتا اور ان کو محبت سے چمکارتا۔ مہمان اسے اپنا فرض سمجھتے تھے کہ کیریلا پترووچ کے کتا گھر کی قصیدہ خوانی کرتے چلیں۔ اکیلا دوبرووسکی خاموش اور افسردہ تھا۔ وہ شکار کا بڑا شیدائی تھا لیکن اس کی مالی حالت ایسی تھی کہ اس کے پاس صرف چار شکاری کتے تھے اور وہ اس شاندار کتا گھر کو دیکھ کر حسد اور جلن کے جذبے کو نہ دبا سکا۔

''بھائی، آخر تمہارا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟'' کیریلا پترووچ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم میرے کتا گھر کو نہیں پسند کرتے؟''

''تمہارا کتا گھر تو اعلی درجے کا ہے'' دوبرووسکی نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ جتنی اچھی حالت اور ٹھاٹ باٹ سے تمہارے کتے رہتے ہیں تمہارے ملازم بھی اس طرح نہیں رہتے۔''

اس پر کتا گھر کا ایک جمعدار چٹخ گیا۔

''خدا اور ہمارے مالک کا شکر ہے کہ'' اس نے کہا ''ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے بھلے مانس اپنی جاگیریں ہمارے کتا گھر سے خوشی خوشی بدل لینگے۔ اس طرح ان کو بہتر کھانا ملیگا اور وہ گرو رہینگے۔''

کیریلا پترووچ نے اپنے کمیرے کے اس چٹخارےدار فقرے پر زوردار قہقہہ بلند کیا اور اس کے قہقہے کی صدائے باز گشت مہمانوں کے منہ سے سنائی دی حالانکہ ان میں بہتیروں نے محسوس کیا کہ کتا گھر کے جمعدار کی پھبتی خود ان پر لاگو ہو سکتی ہے۔ دوبرووسکی کا چہرہ زرد پڑ گیا لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولا۔

اسی لمحہ تازہ تازہ کتے کے پلے، ایک ٹوکری میں رکھ کر، کیریلا پترووچ کے سامنے لائے گئے۔ وہ ان میں مصروف ہو گیا۔ اس نے دو چن کر اٹھا لئے اور باقی کو پانی میں ڈبو دینے کا حکم دیا۔ اس اثنا میں اندری گاوریلووچ غائب ہو گیا اور کسی کو پتہ نہ چلا۔

کتا گھر سے واپس آکر، کیریلا پترووچ اپنے مہمانوں ساتھ کھانا کھانے بیٹھا اور اب جا کر اسے دوبرووسکی کی غیرموجودگی کا احساس ہوا۔ ملازموں نے جواب دیا کہ اندری گاوریلووچ اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ترونے کوروف نے حکم دیا کہ کوئی فوراً لپک کر اسے راستے میں جالے اور اسے ضرور واپس لے آئے۔ وہ زندگی میں کبھی بھی دوبرووسکی کے بغیر شکار پر نہیں گیا تھا جو کھوجی کتوں کا اشارہ سمجھنے میں بڑی نکتہ‌رس اور تجربہ‌کار نظر رکھتا تھا اور شکار کے سلسلے میں اس کے فیصلے اور داؤں میں کبھی کوئی بھول چوک نہ ہوتی تھی۔ جب وہ ملازم جو اس کے پیچھے بھاگا تھا لوٹا تو ابھی سب کھانے کی میز پر ہی تھے۔ اس نے اپنے مالک کو بتایا کہ اندری گاوریلووچ نے اس کی ایک نہ سنی اور وہ واپس آنا نہیں چاہتے۔ کیریلا پترووچ شراب کے نشے میں تو تھا ہی، فوراً بھڑک اٹھا اور ملازم کو دوبارہ اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ اندری گاوریلووچ سے کہو کہ اگر فوراً نہ لوٹا اور رات پوکرووسکوئے میں نہ گزاری تو میں اس کو کبھی معاف نہیں کروں‌گا۔ ملازم گھوڑے پر بگ‌ٹٹ بھاگا۔ کیریلا پترووچ میز سے اٹھا اور مہمانوں کو برخاست کرتے ہوئے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلی صبح اس نے جو بات سب سے پہلے پوچھی یہ تھی: کیا اندری گاوریلووچ یہاں ہے؟ اس سوال کے جواب میں اس کو ایک پرچہ تھما دیا گیا جو ایک مڑی تڑی ٹوپی کی طرح تہہ کیا گیا تھا۔ کیریلا پترووچ نے اپنے منشی سے کہا کہ زور سے پڑھ کر سنائے اور جو کچھ منشی نے سنایا یہ تھا:

''مکرمی،

میں اس وقت تک پوکرووسکوئے آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا جب تک آپ اپنے کتا گھر کے جمعدار پاراموشکا کو معافی مانگنے کے لئے میرے پاس نہ بھیجیں۔ اور اس کا دار و مدار مجھ پر ہوگا کہ جیسا میں مناسب سمجھوں، اسے سزا دوں یا معاف کر دوں۔ میں اس کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں کہ آپ کے کمیرے مجھ پر ہنسیں، کمیرے تو کمیرے آپ بھی ایسا کریں تو میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں کوئی مسخرا نہیں ہوں۔ میں ایک قدیم معزز نام کا امین ہوں۔ میں ہوں آپ کا ناچیز خادم،

اندری دوبرووسکی۔''

تہذیب و اخلاق کے موجودہ تصورات کے مطابق یہ خط انتہائی ناشائستہ سمجھا جائیگا۔ لیکن کیریلا پترووچ کو خط کے غیرمعمولی الفاظ اور طرز تحریر سے اتنی جھنجلاہٹ نہیں ہوئی جتنی کہ اس کے مافیہ سے۔

''کیا؟'' وہ بستر سے فرش پر کودتے ہوئے زور سے گرجا۔ ''میں اپنے آدمی کو معافی مانگنے بھیجوں اور وہ جیسا مناسب سمجھے اسے سزا دے یا معاف کرے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ اس کا سابقہ کس سے ہے؟ میں مزا چکھاؤنگا اسے... میں اسے بتاؤنگا۔ اس کو معلوم ہو جائیگا کہ تروئے کوروف سے لوہا لینے کا مطلب کیا ہوتا ہے!''

کیریلا پترووچ نے لباس تبدیل کیا اور حسب معمول بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شکار کے لئے روانہ ہوا لیکن شکار ناکام رہا۔ سارے دن مارے مارے پھرنے پر ایک خرگوش نظر آیا۔ اور وہ بھی زد میں نہ آیا۔ میدان میں لگے ہوئے خیمے میں کھانے کا پروگرام بھی ناکام رہا۔ بہر حال کیریلا پترووچ کو ذرا لطف نہ آیا اور اس نے باورچی کو تھپڑ جڑ دیا اور اپنے مہمانوں کو گالی گلوج سے نوازا اور لوٹا تو جان بوجھ کر دوبرووسکی کے کھیتوں میں سے ہو کر گزرا۔

چند دن بیت گئے اور دونوں پڑوسیوں کا جھگڑا ختم نہ ہوا۔ اندری گاوریلووچ پوکرووسکوئے نہیں آیا۔ کیریلا پتروونچ کو اس کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی اور وہ اپنے دلی پیچ و تاب کا اظہار زورشور سے بہت اہانت‌آمیز انداز میں کرتا اور مقامی حضرات کے جوش و خروش کا بھلا ہو کہ دوبرووسکی کے کانوں تک یہ باتیں بہت ہی بدلی ہوئی شکل میں، نمک مرچ لگا کر پہنچائی جاتیں۔ اور پھر ایک نیا واقعہ رونما ہوا جس نے ان کے میل ملاپ کی رہی سہی امید پر بھی پانی پھیر دیا۔

دوبرووسکی بگھی میں بیٹھا، اپنی چھوٹی سی جاگیر کا چکر لگا رہا تھا۔ جب برچ کے درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچا تو اس کے کانوں میں کلہاڑی چلنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحہ ایک درخت کے گرنے کا شور سنائی دیا۔ اس نے اپنے کوچ بان سے تیزی سے اس جھنڈ کی طرف چلنے کے لئے کہا اور جب وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ پوکرووسکوئے کے کچھ کسان چپکے چپکے لکڑی پار کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی وہ تتربتر ہوکر بھاگے۔ دوبرووسکی اور اس کے کوچبان نے ان میں سے دو کو جا لیا اور انہیں کس کر گھر کے سامنے صحن میں باندھ لائے۔ دشمن کے تین گھوڑے بھی فاتح کے قبضے میں آئے۔ دوبرووسکی مارے غصے کے آپے میں نہ تھا۔ تروئے کوروف کے آدمی نمبر ایک بدمعاش تھے لیکن ان کو کبھی بھی اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کی جاگیر کی حدود میں کسی قسم کی شرارت کریں کیونکہ ان کو اپنے مالک کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات کا علم تھا۔ دوبرووسکی سمجھ گیا کہ وہ اب موجودہ بگاڑ کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور لڑائی کے سارے قانون کے خلاف اس نے سوچا کہ قیدیوں کو ذرا ان قمچیوں کا مزا چکھانا چاہئے جو انہوں نے اس کے جنگل سے چرانے کی کوشش کی تھی اور ان کے گھوڑوں سے کام لیا جائے، جیسے وہ اس کے اپنے ہوں۔

اس واقعہ کی خبر اسی دن کیریلا پترووچ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ غصے میں آپے سے باہر ہوکر، پہلے تو بپھرا اور سوچا کہ کستےنیوکا پر (پڑوسی کی جاگیر کا یہی نام تھا) اپنے تمام کمیروں کو لےکر هله بول دے، اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور اس کے مالک کو خود اپنے گھر میں اسیر کر دے — اگر وہ یہ راستہ اختیار کرتا تو یہ کوئی نرالی بات نہ ہوتی — لیکن جلد ہی اس کے خیالات نے دوسرا رخ اختیار کر لیا۔

جب وہ سوچ میں ڈوبا اپنے محل کے ہال میں ٹہل رہا تھا تو اتفاقاً کھڑکی سے باہر نظر پڑی۔ تروئکا (تین گھوڑوں والی گاڑی) اس کے پھاٹک کے سامنے آکر رکی اور ایک چھوٹے قد کا آدمی چمڑے کی چھجے دار ٹوپی سر پر جمائے اور اونی اوورکوٹ پہنے گاڑی سے نکلا اور مکان کے اس بازو کی طرف چلا جہاں پٹواری رہتا تھا۔ تروئےکوروف نے مجسٹریٹ شاباشکین کو پہچان لیا اور اس کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا۔ ایک منٹ بعد شاباشکین، کیریلا پترووچ کے سامنے کھڑا تھا اور بار بار جھک کر سلام بجا لا رہا تھا اور سراپا عجزوانکسار بن کر اس کی خواہش سننے کے لئے بیقرار تھا۔

''آداب عرض۔ ہاں کیا نام ہے تمہارا؟'' تروئےکوروف نے پوچھا۔ ''تم کس کام سے یہاں آئے ہو؟''

''حضور، میں شہر جا رہا تھا'' شاباشکین نے جواب دیا۔ ''میں نے سوچا ایوان دیمیانوف سے ملتا چلوں اور دیکھوں شاید میرے لئے حضور کا کوئی حکم ہو۔''

''تم بڑے وقت سے آئے ہو، تمہارا نام کیا ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ووڈکا پیو اور میری سنو۔''

اتنی خوش اخلاقی سے بھری ہوئی آؤبھگت پر مجسٹریٹ کو ایک خوشگوار اچنبھا ہوا اور وہ ووڈکا سے انکار کرتے ہوئے کیریلا پترووچ کی بات سننے کے لئے ہمہ‌تن گوش ہوکر بیٹھ گیا۔

''میرا ایک پڑوسی ہے'' تروئےکوروف نے شروع کیا۔ ''ایک اجڈ آدمی جس کی ایک چھوٹی سی جاگیر ہے۔

میں یہ جاگیر اس سے چھین لینا چاہتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟،،

''کیا حضور کے پاس کوئی دستاویز وغیرہ ہے یا...،،

''نہیں بھئی، کسی قسم کا کاغذ واغذ نہیں۔ لیکن پھر احکام کس مرض کی دوا ہیں؟ اصلی نکتہ تو یہی ہے کہ بغیر کسی قانونی دعوے کے جاگیر کو قبضے میں کر لیا جائے۔ لیکن ایک منٹ ٹھیرو۔ بہت پہلے یہ جاگیر ہماری تھی۔ یہ جاگیر اسپتسین نامی ایک آدمی سے خریدی گئی تھی اور اس کے بعد دوبرووسکی کے باپ کے ہاتھ بیچ دی گئی تھی۔ کیا اس سے کام نہیں چلیگا؟،،

''مشکل ہے حضور۔ غالباً اس کی خرید و فروخت کا مرحلہ بالکل قانونی طور پر طے ہوا ہوگا۔،،

''بھئی سوچو اس مسئلے پر، سوچو اور کوئی راستہ ڈھونڈو۔،،

''اگر حضور والا اپنے پڑوسی سے بیع نامہ کسی صورت سے حاصل کر لیں تو بے شک...،،

''میں سمجھتا ہوں۔ لیکن سب سے بری بات تو یہی ہے کہ اس کے تمام کاغذات ایک بار آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔،،

''کیا کہا حضور نے؟ اس کے کاغذات جل گئے؟ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے! اس صورت میں تو ہم قانون کے پابند رہینگے اور آپ کی پوری تسلی ہو جائیگی۔،،

''کیا تم واقعی ایسا سوچتے ہو؟ یاد رکھو، تمہارے جتن اور لگن پر میں پورا اعتبار کرتا ہوں، اور تم یقین رکھو کہ میں تمہارا شکر گزار ہونگا۔،،

شاباشکین اتنا جھکا کہ قریب قریب زمین بوس ہو گیا۔ اور وہاں سے رخصت ہوا۔ اسی دن سے اس نے ایسی لگن اور دھن کے ساتھ منصوبے تیار کرنا شروع کئے کہ ٹھیک دو ہفتے بعد، دوبرووسکی کو قریب کے شہر سے یہ درخواست موصول ہوئی کہ وہ وقت ضائع کئے بنا گاؤں

کسترےنیوکا پر اپنی ملکیت کے حق کا تسلی بخش ثبوت پیش کرے۔

اندری گاوریلووچ اس غیرمتوقع تفتیش پر کچھ ایسا ہوا کہ اسی دن اس کے جواب میں قدرے کھرا سا خط لکھ بھیجا اور اس میں یہ دعوی کیا کہ کسترےنیوکا گاؤں کا حق ملکیت اس کے باپ کی موت کے بعد اس کو ملا تھا، اس پر اس کا حق موروثی ہے، تروئےکوروف کو اس سے کوئی سروکار نہیں اور باہر سے اس کی جائداد پر کوئی دعوے محض جھوٹ اور جعل‌سازی ہے۔

اس خط نے شاباشکین کے دماغ پر بہت ہی خوشگوار اثر ڈالا۔ اس سے اسے معلوم ہو گیا کہ (۱) دوبرووسکی معاملات کے بارے میں بہت کم واقفیت رکھتا ہے اور (۲) یہ کہ اس قسم کے بگڑے دل اور بےسوچے سمجھے کام کرنےوالے آدمی کو بےموقع مصیبت میں پھنسانا کوئی ایسا مشکل نہ ہوگا۔

لیکن اندری گاوریلووچ نے مجسٹریٹ کے سوالوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد اس کی ضرورت محسوس کی کہ ان سوالوں کا مفصل جواب دیا جائے۔ اس نے کم‌وبیش ایک کاروباری قسم کا جواب لکھا جو بہرحال ناکافی ثابت ہوا۔

معاملہ طول کھینچتا رہا۔ اس پر یقین رکھتے ہوئے کہ وہ حق پر ہے اندری گاوریلووچ اس معاملے میں زیادہ پریشان نہ ہوا۔ نہ تو اس کا ایسا ارادہ ہی تھا اور نہ یہ اس کے بس میں تھا کہ روپیہ پانی کی طرح بہائے۔ اگرچہ ہمیشہ سب سے پہلے وہ کلرکوں کے فرقے کے گھن لگے ہوئے ضمیر پر لعنت ملامت کرتا تھا اس کے دماغ میں ذرا سا گمان بھی نہ ہوا کہ وہ خود اس جعل‌سازی کا شکار ہو سکتا ہے۔ تروئےکوروف بھی اپنے کھڑے کئے ہوئے اس ہنگامے کے نتیجے کے بارے میں بہت کم سوچتا تھا۔ شاباشکین اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ تروئےکوروف کی طرف سے پیروی کرتے ہوئے، وہ ججوں کو دھمکاتا،

ان کو رشوتیں دیتا اور اپنے فائدے کے مطابق قانون کا مطلب بیان کرتا۔ اور سن اٹھارہ سو... کی نویں فروری کو دوبرووسکی کو شہر کی پولیس کے ذریعہ ایک پروانہ ملا کہ وہ عدالت کے سامنے حاضر ہو اور لفٹیننٹ دوبرووسکی اور جنرل تروئے کوروف کے درمیان زیر سماعت جاگیر کے مقدمے کے بارے میں عدالت کا فیصلہ سنے اور اپنی رضامندی یا مخالفت کے بارے میں دستخط کر دے۔ دوبرووسکی اسی دن شہر روانہ ہو گیا۔ سڑک پر تروئے کوروف نے اسے آ لیا۔ انہوں نے مغرور نگاہوں سے ایک دوسرے کو گھورا اور دوبرووسکی نے دیکھا کہ اس کے حریف کے ہونٹوں پر ایک کینہ پرور مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔

دوسرا باب

اندری گاوریلووچ شہر میں اپنے ایک سوداگر دوست کے یہاں ٹھیرا اور اگلی صبح مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہوا۔ کسی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جب اس کے فوراً بعد کیریلا پترووچ آیا تو کلرک اپنے کانوں میں قلم اڑکا کر فوراً کھڑے ہو گئے، عدالت کے اراکین نے بہت نمایاں عجز و انکسار کے ساتھ اس کا خیرمقدم کیا اور اس کے عہدے، عمر اور مرتبے کے احترام میں ایک کرسی بڑھائی۔ وہ کھلے دروازے کے پاس بیٹھ گیا۔ اندری گاوریلووچ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ زبردست خاموشی چھا گئی اور پیشکار اپنی کھنک دار آواز میں عدالت کا فیصلہ پڑھ کر سنانے لگا۔

ہم اسے مکمل نقل کرتے ہیں اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی یہ دیکھ کر حیرت محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک جاگیر کا مالک ناقابل

تردید حق کے باوجود، کس طرح روس میں بے دخل کر دیا جاتا تھا...*

اس فیصلے پر تمام حاضرین نے دستخط کئے۔

پیشکار بیٹھ گیا۔ مجسٹریٹ اٹھا اور تروئے کوروف سے کافی جھکتے ہوئے مخاطب ہوا اور اس کو دستاویز پر دستخط کرنے کی دعوت دی اور فتح مند تروئے کوروف نے اس کے ہاتھ سے قلم لیا اور اپنی مکمل تسلی کے اظہار میں دستخط کر دئے۔

اب دوبرووسکی کی باری آئی۔

پیشکار دستاویز اس کے سامنے لایا۔ لیکن دوبرووسکی سر جھکائے ہوئے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

پیشکار نے اپنی درخوست دھرائی کہ وہ مکمل رضامندی یا نارضامندی کے اظہار میں دستخط کردے۔ خلاف توقع ھی سہی، اس نے سنجیدگی سے سوچا کہ وہ حق پر ھے اور اس کا ارادہ تھا کہ قانون کی طرف سے مقررہ میعاد کے اندر اندر مناسب حکام کے سامنے اپیل کرے۔

دوبرووسکی نے کچھ نہ کہا... یکایک اس نے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور وہ اپنے پیر پٹکنے لگا اور پیشکار کو اتنے زور سے دھکیلا کہ وہ فرش پر جا رہا اور پھر داوات اٹھائی اور اسے مجسٹریٹ پر دے مارا۔ سب سکتے میں آ گئے۔ ”کیا!“ وہ چلایا۔ ”خدا کے گھر کو ناپاک کرنےوالو! نکلو یہاں سے ملعونو!“ پھر کیریلا پترووچ کی طرف مڑتے ہوئے بولا ”حضور عالی، خدا کے گھر میں شکاری اپنے کتوں

---

* یہاں پوشکن نے عدالت کا پورا حکم‌نامہ دیا ھے جو اس دور کی عدالتی دستاویزوں کے نوکرشاھانہ اور مضحکہ انگیز حد تک جاھلانہ انداز تحریر کا مرقع ھے۔ اس کا ترجمہ تقریباً ناممکن ھے۔ اس میں قانون دانوں کی ہر قسم کی لفاظیوں کی مدد سے یہ ثابت کیا گیا ھے کہ تروئے کوروف دوبرووسکی کی جاگیر کا مستقل جائز حقدار رہا ھے۔ (ایڈیٹر)

کو لے آئیں۔ یہ کا ہے کو کبھی کسی نے سنا ہوگا؟ خدا کے گھر میں کتے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ میں مزا چکھاؤں گا...،، پہرےدار شور سن کر عدالت کے اندر داخل ہوئے اور اس کو پکڑکر بڑی مشکل سے قابو میں کیا۔ اس کو باہر نکالا گیا اور گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ ترونئے کوروف، پوری عدالت کے ساتھ باہر نکلا۔ دوبرووسکی کی اچانک مجنونانہ چیخ پکار نے اس کے دماغ پر بڑا اثر کیا اور اس کی فتح کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔

جج، جن کو امید تھی کہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائیگا، اس سے دوستی کا ایک لفظ بھی نہ سن سکے اور وہ اسی دن پوکرووسکوئے روانہ ہوگیا۔ اس وقت تک دوبرووسکی اپنے بستر میں دراز ہو چکا تھا۔ ضلع کے معالج نے جو خوش قسمتی سے بالکل گیا گزرا نہ تھا اس کا خون نکالا اس کا علاج جونکوں اور سون مکھیوں سے کیا اور شام تک مریض کو افاقہ ہوا اور اس کے ہوش و حواس بحال ہوگئے۔ دوسرے دن اس کو کستےنیوکا پہنچایا گیا جو اب اس کا نہیں رہا تھا۔

تیسرا باب

وقت گزرتا رہا اور بدنصیب دوبرووسکی صحت‌یاب نہ ہو سکا۔ ہاں جنون کا دورہ دو بارہ نہ پڑا۔ لیکن صاف دکھائی دیتا تھا کہ اس کی طاقت جواب دے گئی ہے۔ وہ اپنی سابقہ مصروفیتوں سے سبکدوش ہو گیا۔ شاید ہی کبھی اپنے کمرے سے باہر نکلتا، اور لگاتار کئی کئی دن اپنے خیال میں ڈوبا رہتا۔ نیک دل بوڑھی، یگوروونا، جس نے دوبرووسکی کے بیٹے کی نگہداشت کا فرض انجام دیا تھا، اب اس کی نرس بن گئی۔ وہ اس کی دیکھ بھال اس طرح کرتی جیسے وہ بچہ ہو۔ وہ اس کو کھانے اور سونے

کا وقت یاد دلاتی، اس کو کھانا کھلاتی اور بستر پر لٹاتی۔ اندری گاوریلووچ چپکے سے اس کی بات مان لیتا اور کسی سے کوئی سروکار نہ رکھتا۔ اس میں اپنے معاملات کے بارے میں سوچنے اور حکم دینے کی سکت نہ رہی تھی۔ یگوروونا نے محسوس کیا کہ چھوٹے دوبرووسکی کو اطلاع دینا لازمی ہے، جو پٹرسبرگ میں خیمہ‌زن، پیادہ گارڈ فوج کی ایک رجمینٹ میں زیر کمیشن تھا۔ اور اس لئے حساب کے کھاتے سے ایک ورق پھاڑکر، اس نے باورچی خری‌تون سے ایک خط لکھوایا۔ کستے‌نیوکا میں وہ واحد شخص تھا جو لکھنا جانتا تھا۔ اس نے اسی دن یہ خط شہر کے ڈاک گھر بھیجوا دیا۔

لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے قارئین اس کہانی کے اصلی ہیرو سے جان پہچان حاصل کریں۔

ولادیمیر دوبرووسکی کی پرورش کیڈٹ کور میں ہوئی تھی۔ یہاں سے تعلیم پانے کے بعد وہ گارڈ دستے میں جمعدار ہو گیا۔ اس کا باپ اپنے بیٹے کے آرام کے لئے کوئی جتن نہ اٹھا رکھتا اور اس کو گھر سے امید سے کہیں زیادہ روپیہ ملتا تھا۔ وہ فضول خرچ اور اولوالعزم نوجوان تھا، وہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتا، جوا کھیلتا اور آئندہ کے بارے میں ذرا بھی سوچے بغیر ادھار لے لیتا۔ وہ مستقل اس امید پر تکیہ کئے ہوئے تھا کہ دیر سویر اسے ایک دولت‌مند دلہن مل جائیگی — ایک غریب نوجوان کا خواب۔

ایک شام، جب کئی افسر اس کے کمرے میں صوفوں پر بیٹھے سگریٹ کے کش اڑا رہے تھے، ولادیمیر کے خدمتگار گریشا نے اس کو ایک خط لا کر دیا، اس پر لکھے ہوئے پتے اور مہر نے نوجوان کو چونکا دیا۔

اس نے جلدی جلدی مہر توڑی اور مندرجہ ذیل عبارت پڑھنا شروع کی:

"ہمارے مالک، ولادیمیر اندریےوچ، میں تمہاری پرانی نرس، تم کو اپنے ابا کی صحت کے بارے میں بتانے کی جرأت کر رہی ہوں۔ ان کی حالت بہت نازک ہے،

کبھی کبھی ان پر هذیانی کیفیت طاری هو جاتی هے اور وہ دن بھر بیٹھے رهتے هیں، بالکل معصوم بچے کی طرح — لیکن زندگی اور موت خدا کے هاتھ میں هے۔ خوبصورت شاهیں، تم همارے پاس آجاؤ۔ هم تمهارے لئے گھوڑے پیسوچنوئے بھیج دینگے۔ لوگ کہتے هیں که عدالت همیں کیریلا پترووچ تروئے کوروف کی عملداری میں دے رهی هے — کیونکه، وہ کہتے هیں، هم ان کی رعیت هیں۔ لیکن هم همیشه تمهارے خادم رهے هیں اور هم نے اس قسم کی بات پہلے کبھی نهیں سنی تھی۔ تم پٹرسبرگ میں رهتے هو، تم زار سے بات کر سکتے هو۔ وہ همارے ساتھ بےانصافی نه هونے دینگے۔ میں هوں تمهاری وفادار کنیز اور نرس

اورینه یگوروونا بوزیریوا

میں گریشا کو اپنی ماستا بھری دعائیں بھیجتی هوں، کیا وہ اچھی طرح کام کرتا هے؟ ایک هفته هوا که یہاں برابر پانی برس رها هے اور گڈریا رودیا سنٹ نکولاس کے دن سے ایک دن پہلے چل بسا۔،،

ولادیمیر نے قدرے بھونڈی لکھائی کو بار بار پڑھا اور بڑے جذبات سے پڑھا۔ اس کے سر سے انتہائی بچپن میں هی اپنی ماں کا سایه اٹھ گیا تھا اور آٹھ برس کی عمر میں پٹرسبرگ بھیج دیا گیا تھا۔ وہ اپنے باپ سے بہت کم مانوس هو سکا تھا لیکن اس کے دل میں انتہائی روحانی قسم کی محبت پیدا هو گئی تھی اور وہ بھرے گھر کی چہکتی چہچہاتی زندگی پر جان دیتا تھا حالانکه وہ خود اس کی مسرتوں سے محروم تھا۔

اپنے باپ کو کھو بیٹھنے کے خیال نے اس کے دل میں انتہائی کرب پیدا کر دیا اور بدنصیب مریض کی حالت کے تصور نے، جس کو اس نے اپنی نرس کے خط سے بھانپ لیا تھا، اسے بدحواس کر دیا۔ اس نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا که اس کا باپ ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک نادان بوڑھی عورت اور ملازموں کے رحم و کرم

پر، تباهی میں گھرا ہوا بےیار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ جسمانی اور روحانی اذیتیں اسے کھائے جا رہی ہیں۔ ولادیمیر نے اپنی مجرمانہ بے نیازی پر خود کو خوب برا بھلا کہا۔ اس کو ایک عرصہ دراز سے اپنے باپ کا خط نہیں ملا تھا اور اس کو اس کی خیریت پوچھنے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش ہو رہا تھا کہ وہ شکار پر گیا ہوا ہوگا یا جاگیر کے معاملات میں غرق ہوگا۔

اس نے اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا اور اگر اس کے باپ کی صحت ایسی ہے کہ اس کی موجودگی ضروری ہو تو اس کے لئے وہ کمیشن کو بھی ٹھکرا دیگا۔ اس کے دوستوں نے جو اس کی ہیجانی کیفیت دیکھی تو وہاں سے کھسک گئے۔ جب ولادیمیر اکیلا رہ گیا تو اس نے چھٹی کے لئے ایک درخواست لکھی اور پائپ سلگا کر سوچ میں ڈوب گیا۔

اس نے اسی دن چھٹی کی درخواست پیش کر دی اور تین دن بعد، وہ گھوڑے گاڑی میں سوار، سڑک پر منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔

ولادیمیر گھوڑوں کی اس چوکی کی طرف مڑا جہاں سے اسے کستےنیوکا جانا تھا۔ اسے غم و الم سے بھرے ہوئے اندیشے ستا رہے تھے۔ وہ ڈرا کہ وہ اپنے باپ کو زندہ نہ دیکھ سکیگا۔ اس نے اس اداس اور غم انگیز زندگی کا تصور کیا جو گاؤں میں اس کا انتظار کر رہی تھی — سب سے دوری، تنہائی، افلاس اور جاگیر کے سلسلے میں تردد اور پریشانیاں — ایسی فکر اور پریشانیاں جن کے بارے میں اس کو کچھ معلوم نہ تھا۔ چوکی پر پہنچ کر وہ سیدھا چوکی کے داروغہ کے پاس گیا اور گھوڑوں کے بارے میں پوچھا۔ داروغہ نے اس کی منزل کا نام سن کر کہا کہ کستےنیوکا کے گھوڑے تو چار دن سے اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ جلد ہی اس کے پاس بوڑھا کوچبان انتون آ گیا جو اس کو اصطبل لے جایا کرتا تھا اور اس کے ٹٹو کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ جب اس نے ولادیمیر

کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور اس نے زمین بوس ہو کر کہا کہ بوڑھے سرکار ابھی زندہ ہیں۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑوں کو گاڑی میں جوتنے کے لئے دوڑا۔ ولادیمیر اندریےوچ نے ناشتہ کرنے سے انکار کر دیا اور بڑی جلدی میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ انتون دیہاتی راستوں پر گاڑی کو دوڑاتا رہا۔ وہ راستے میں بات چیت کرنے لگے۔

''انتون، میرے ابا اور تروئےکوروف کے درمیان مقدمے کا کیا قصہ ہے؟''

''خدا جانے ولادیمیر اندریےوچ — کہتے ہیں کہ کیریلا پترووچ سے ہمارے مالک کا جھگڑا ہو گیا اور کیریلا پترووچ نے عدالت میں اس پر مقدمہ چلایا حالانکہ وہ خود ہی بھلا جج سے کیا کم ہے۔ یہ ہم خادموں کا کام نہیں کہ اپنے مالکوں کی خواہش کے خلاف چوں چرا کریں۔ لیکن آپ کے ابا کو کیریلا پترووچ سے ٹکر نہیں لینی چاہئے تھی۔ ہاں ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ چمڑے کی پیٹی اور کلہاڑی کا کیا مقابلہ۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ کیریلا پترووچ اپنی من مانی کرتا ہے؟''

''ہاں سرکار وہ تو اپنی من مانی ہی کرتا ہے — کہتے ہیں کہ مجسٹریٹ اس کی جوتیاں چاٹتے ہیں اور تھانیدار بھاگ بھاگ کر اس کا حکم بجا لاتا ہے اور تمام اچھے کھاتے پیتے لوگ اس کو سلام کرنے آتے ہیں۔ اوہ خیر — جہاں بیر ہوگی وہاں پتھر بھی ضرور آئیں گے۔''

''کیا یہ سچ ہے کہ وہ ہماری جاگیر چھین رہا ہے؟''

''اوہ، مالک، ہم نے سنا ہے کہ یہ سچ ہے۔ چند دن پہلے کی بات ہے پوکرووسکوئے کے گرجا کے گھنٹے بجانے والے نے بپتسمے کی تقریب کے موقع پر ہمارے مکھیا سے کہا 'خیر تم مزے اڑا چکے — اب کیریلا پترووچ تمہیں اپنے قبضے میں لیگا'۔ لوہار مکیتا نے اس سے کہا، آؤ ساویلچ اپنے دوستوں کو کیوں پریشان کرو اور مجلس کو درہم برہم کرو؟ کیریلا پترووچ اپنا مالک آپ ہے،

لیکن اندری گاوریلووچ بھی مالک ہے اور ہم سب خدا اور زار کے بندے ہیں۔ تم لوگوں کا منہ نہیں بند کر سکتے۔ ‘‘

’’اس کا مطلب یہ ہے کہ تم تروئےکوروف کو اپنا مالک بنانا نہیں چاہتے؟‘‘

’’کیریلا پترووچ کو؟ خدا کی پناہ! خود اس کے اپنے آدمیوں کے برے دن ہیں۔ اور نئے لوگ — ان کی تو کھال ادھیڑ کر قیمہ بنا دیگا وہ! نہیں نہیں — بس ذرا اندری گاوریلووچ کے صحت‌یاب ہونے کی دیر ہے، اور اگر وہ اللہ کو پیارے ہو ہی گئے تو ہم صرف آپ کو چاہتے ہیں، اپنے سرپرست کو، اور بس۔‘‘ ان الفاظ کے ساتھ، انتون نے اپنا چابک لہرایا اور لگام کو جھٹکے دئے۔ گھوڑے تیز تیز دوڑتے رہے۔

بوڑھے کوچبان کی محبت سے متاثر ہو کر دوبرووسکی خاموش ہو گیا اور اپنے خیال میں کھو گیا۔ کوئی ایک گھنٹے تک سڑک پر سفر طے کرنے کے بعد گریشا کی آواز نے اسے چونکا دیا: ’’وہ رہا پوکرووسکوئے!‘‘ دوبرووسکی نے اپنا سر اٹھایا۔ وہ ایک بڑی سی جھیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے جس میں سے ایک ندی نکلتی تھی اور پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی دور تک موجیں مارتی نظر آتی تھی۔ ان پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی پر درختوں کے جھنڈ کے گھنے پتوں کے درمیان پتھر کے ایک بڑے سے مکان کی ہری چھت اور سیربین برج سر بلند نظر آ رہے تھے۔ ایک دوسری پہاڑی پر پانچ گنبدوں والا گرجا اور اس کا پرانا گھنٹہ گھر دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف کسانوں کی جھونپڑیاں، ان کی پھلواریاں اور کنویں تھے۔ دوبرووسکی اس جگہ سے مانوس تھا — اسے یاد آیا کہ اسی ٹیلے پر وہ ماشا تروئےکوروا کے ساتھ، جو اس سے دو برس چھوٹی تھی، کھیلا کرتا تھا۔ اس میں اس زمانے میں بھی ایک غیر معمولی حسینہ کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس نے انتون سے اس کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن دفعتاً ایک قسم کا حجاب آڑے آیا اور وہ پوچھنے سے باز رہا۔

جب وہ گھر کے قریب پہنچے تو اس کو باغ میں ایک سفید فراک لہراتا نظر آیا ۔ لیکن ٹھیک اسی لمحے، شہری اور دیہاتی کوچبانوں کی یکساں شان خود نمائی کے زیر اثر، انتون نے پل پر گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا اور گاؤں سے آگے نکل گیا ۔ گاؤں کو پیچھے چھوڑ کر ان کی گاڑی پہاڑی پر چڑھنے لگی اور ولادیمیر کو برچ کے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا اور الٹے ھاتھ کو، ایک کھلی ہوئی جگہ میں ایک بھورے رنگ کا مکان جس کی چھت لال تھی ۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ کسترےنیو کا گاؤں اور اس کے باپ کا سادہ سا گھر اس کے سامنے تھا ۔

دس منٹ بعد اس کی گاڑی گھر کے سامنے احاطے میں دوڑ رہی تھی ۔ اس نے اپنے چاروں طرف ناقابل بیان جذبات کے ساتھ دیکھا ۔ وہ بارہ برس بعد اپنی جائے پیدائش کو دیکھ رہا تھا ۔ اس کے لڑکپن کے زمانے میں باڑھ کے ساتھ ساتھ برچ کے جو پودے لگے تھے لمبے لمبے تناور درخت بن چکے تھے ۔ وہ صحن جس میں پھولوں کی تین چوکور کیاریاں تھیں اور جن کے درمیان ایک صاف ستھرا راستہ تھا، اب چراگاہ سا بن گیا تھا اور اس میں ایک گھوڑا گھاس چر رہا تھا ۔ کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کیا مگر انتون کو پہچان کر خاموش ہو گئے اور اپنی جھبری دموں کو ھلانے لگے ۔ ملازم اپنے گھروں سے دوڑے اور اپنے نوجوان مالک کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنے لگے ۔ وہ مشکل سے بھیڑ کو پار کر آگے بڑھا اور ٹوٹے پھوٹے زینے پر چڑھنے لگا ۔ برساتی میں اس کی ملاقات یگوروونا سے ہوئی اس نے لڑکے کی گردن میں بانہیں ڈال دیں جس کی کبھی اس نے نگرانی اور دیکھ بھال کی تھی ۔ وہ رونے لگی ۔

”بس، بس، انا“، وہ اس اچھی سی بوڑھی عورت کو گلے لگا کر بار بار کہتا رہا ۔ ”میرے ابا کیسے ھیں؟ وہ ھیں کہاں؟ کیا وہ بہت بدل گئے ھیں؟“

اس وقت ایک لمبا تڑنگا بوڑھا آدمی، زرد اور نڈھال، ڈریسنگ گاؤن اور نائٹ کیپ پہنے، ھال میں داخل ہوا ۔

’’اچھا تو تم آگئے، ولودیا،، وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا اور ولادیمیر بڑی گرم جوشی سے اپنے باپ سے لپٹ گیا۔

یہ خوشی اس بیمار کے لئے بہت زیادہ ثابت ہوئی اور اس کے گھٹنوں نے جواب دے دیا۔ اگر اسے اپنے بیٹے کا سہارا نہ ملتا تو وہ گر جاتا۔

’’اٹھے کیوں؟،، یگوروونا نے کہا۔ ’’کھڑا تو ہوا جاتا نہیں اور تم بھلے چنگے لوگوں کی طرح دوڑنا پھرنا چاہتے ہو۔،،

بوڑھے بیمار کو سونے کے کمرے میں پہنچایا گیا۔ اس نے اپنے بیٹے سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کا سر چکرایا اور وہ صرف ٹوٹے پھوٹے جملے کہہ سکا۔ جلد ھی اس نے یہ کوشش چھوڑ دی اور اس پر غفلت طاری ہو گئی۔ ولادیمیر اس کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنا بستر بھی باپ کے کمرے میں بچھا لیا اور التجا کی کہ اسے اپنے باپ کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا جائے۔ نوکروں نے حکم کی تعمیل کی اور گریشا کو غلام گردش کی طرف لے گئے جہاں انہوں نے اس کی آؤبھگت دیہاتی ریت کے مطابق کی اور اپنے خلوص اور سوالوں کی بارش سے اسکو عاجز کر دیا۔

چوتھا باب

جہاں کبھی عیش و نشاط کی محفل گرم تھی
آج وھاں ایک لاش ہے رکھی ہوئی۔

اپنی آمد کے چند دن بعد، نوجوان دوبرووسکی نے جاگیر کے معاملات پر نظر ڈالنے کی ٹھانی۔ لیکن اس کا باپ ضروری وضاحت نہ کر سکا اور اس نے کبھی کوئی وکیل تو رکھا

نہیں تھا۔ ولادیمیر نے اپنے باپ کے کاغذات کی چھان بین کی۔ لیکن اسے مجسٹریٹ کے پہلے خط اور اپنے باپ کے برہم جواب کے سوا اور کچھ نہ ملا۔ ان کاغذات سے اس کو اس کا ٹھیک حال نہ معلوم ہو سکا کہ اس پورے مقدمے کی صورت کیا ہے۔ اس نے آنےوالے حالات کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ حق اور انصاف کی فتح ہوگی۔

اس عرصے میں اندری گاوریلووچ کی صحت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ولادیمیر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ موت کے منہ میں ہے اور وہ کبھی اپنے باپ کے پلنگ سے نہ ہٹتا جو اب بالکل ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

اس اثنا میں اپیل داخل کرنے کی مقررہ میعاد ختم ہو گئی اور کوئی اپیل نہ کی گئی۔ کستےنیوکا اب تروئیےکوروف کا ہو گیا اور شاباشکین اس کی خدمت میں حاضر ہو کر کورنش بجا لایا اور مبارکبادیاں دیں، کیریلا پترووچ سے التجا کی کہ اپنی خوشی کے مطابق ایک دن مقرر کرے اور اپنی اس نئی جاگیر کو اپنے قبضے میں کر لے، چاہے تو بہ نفس نفیس یا کسی کارندے کے ذریعہ — جیسی اس کی مرضی ہو۔ کیریلا پترووچ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ وہ لالچی نہیں تھا اور اب اسے محسوس ہوا کہ انتقام کے جوش میں وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا اور اس کا ضمیر اسے ڈس رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کے دشمن اور اس کی جوانی کے دوست کی جان پر کیسی بن آئی تھی۔ فتح سے اس کا جی خوش نہ ہوا۔ اس نے نہایت غضبناک نظروں سے شاباشکین کو دیکھا اور اس کی خبر لینے کے لئے حیلہ ڈھونڈنے لگا لیکن جب کوئی بہانہ ہاتھ نہ آیا تو جل بھن کر بولا:

''جاؤ یہاں سے، میرے سوچنے کو اور چیزیں پڑی ہیں۔''

کیریلا پترووچ کے بگڑے تیور دیکھ کر شاباشکین تعظیماً جھکا اور وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ اور کیریلا پترووچ دوبارہ اکیلا سیٹی بجاتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ ''فتح

کے شادیانے بجاؤ !،، — یہ دھن اس کی زبردست پریشانی کی علامت تھی -

آخر اس نے گھوڑدوڑ والا تیز گھوڑا لانے کا حکم دیا - گرم کوٹ پہنا (ستمبر کا نکلتا مہینہ تھا) اور اکیلا پھاٹک سے نکل پڑا -

جب اس کی نظر اندری گاوریلووچ کے چھوٹے سے گھر پر پڑی تو اس کا دل مختلف قسم کے جذبات سے بھر گیا - ایک لمحے کے لئے فتح نے اس کی فرعونیت کو تسکین دی اور اس کے انتقام کی پیاس بجھائی اور نیک جذبات کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا - لیکن اچھے جذبات دو بارہ غالب آنے لگے - اس نے اپنے دیرینہ پڑوسی سے صلح صفائی کا ارادہ کر لیا اور سوچا کہ اس کو اس کی جائداد واپس کر کے جھگڑے کی بنیاد سرے سے ختم کر دے - اس فیصلے سے کیریلا پترووچ کا دل ھلکا ھو گیا اور اس نے اپنے گھوڑے کو اپنے پڑوسی کی جاگیر کی طرف سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا اور سیدھا اس کے صحن میں جا کر رکا -

بیمار اس وقت اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا - کیریلا پترووچ پر نظر پڑتے ھی اس کے چہرے سے بوکھلاھٹ اور خوف ٹپکنے لگا - اس کے چہرے پر خون کی سرخی نے اس کے رخساروں کی زردی دور کر دی - اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں - اس کے منہ سے بے ربط کلمے نکلے - اس کے بیٹے نے، جو اسی کمرے میں بیٹھا حساب کا کھاتہ دیکھ رھا تھا، سر اٹھایا اور یہ اچانک تبدیلی دیکھ کر حیران رہ گیا - مریض خوف اور غصے کی کیفیت میں کھڑکی کی طرف اشارہ کر رھا تھا - اس نے اپنے ڈریسنگ گاؤن کا دامن سمیٹا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کرسی سے ذرا سا اٹھا... اور یکایک فرش پر گر گیا - اس کا بیٹا دوڑ کر اس کے پاس آیا - بوڑھا باپ بے ھوش پڑا تھا اور مشکل سے سانس لے رھا تھا - اس کو دل کے دورے نے آلیا تھا -

''جلدی، جلدی، شہر جاؤ، ڈاکٹر کو بلا لاؤ !،، ولادیمیر چلایا -

ٹھیک اس وقت ایک نوکر کمرے میں داخل ہوا اور بولا ''کیریلا پترووچ آپ سے ملنا چاہتے ھیں۔''

ولادیمیر نے اس کو ایک غضب آلود نظر سے دیکھا۔

''کیریلا پترووچ سے کہو کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے آدمیوں کو اسے یہاں سے مار بھگانے کا حکم دوں وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جائے۔ جاؤ!''

ملازم بڑے شوق سے مالک کا حکم بجا لانے کے لئے دوڑا۔ یگوروونا نے اپنے ھاتھ ھوا میں بلند کر دئے۔

''اوہ مالک!'' وہ گونجتی ھوئی آواز میں چلائی۔ ''تم خود کو تباہ کر لوگے۔ کیریلا پترووچ سے یہ سودا ھم سب کو مہنگا پڑیگا!''

''چپ ھو جاؤ انا!'' ولادیمیر نے غصے سے کہا۔ ''جاؤ اور انتون کو ڈاکٹر لانے کے لئے شہر بھیجو۔''

یگوروونا کمرے سے باھر چلی گئی۔ ھال میں کوئی نہ تھا۔ سارے ملازم کیریلا پترووچ کو دیکھنے کے لئے باھر چلے گئے تھے۔ جب وہ برساتی میں پہنچی تو اس وقت ملازم اس کو چھوٹے سرکار کا پیغام سنا رھا تھا۔ کیریلا پترووچ نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس کی پوری بات سنی۔ اس کا چہرہ رات کی طرح بھیانک ھو گیا اور اس کے ھونٹوں پر ایک مجنونانہ مسکراھٹ کھیلنے لگی اور پھر وہ دھمکی‌آمیز نظروں سے ملازموں کو گھورتے ھوئے صحن سے نکل گیا۔ اس نے اس کھڑکی کی طرف نظر اٹھائی جہاں چند منٹ قبل اندری گاوریلووچ بیٹھا تھا اور جہاں اب وہ نظر نہیں آ رھا تھا۔ نرس برساتی میں جا کھڑی ھوئی اور اپنے مالک کی ھدایت بھول گئی۔

ملازم زور و شور سے اس واقعے پر بات چیت کر رھے تھے، یکایک ولادیمیر ان کے درمیان نمودار ھوا۔

''ڈاکٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابا چل بسے!'' اس نے بےربط لہجے میں کہا۔

ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ ملازم بوڑھے مالک کے کمرے کی طرف دوڑے۔ وہ اسی کرسی میں تھا جس میں اسے ولادیمیر نے بٹھایا تھا۔ اس کا سیدھا ھاتھ بےجان

سا لٹک رہا تھا، سر جھکا ہوا تھا اور جسم میں زندگی کی کوئی علامت نہ تھی۔ اس کا جسم اب تک گرم تھا لیکن موت نے اس کو کافی مسخ سا کر دیا تھا۔ یگوروونا نے بین کرکے رونا شروع کر دیا۔ ملازموں نے، جن کے سپرد لاش کر دی گئی تھی، اسے گھیر لیا۔ نہلایا اور وہی وردی پہنائی جو بہت پہلے ۱۷۹۷ء میں تیار ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے لاش اسی میز پر رکھی جس کے سامنے انہوں نے اتنے زمانے تک اپنے مالک کی خدمت انجام دی تھی۔

پانچواں باب

تین دن بعد، جنازے کو سپرد خاک کرنے کی رسم ادا ہوئی۔ اس بدنصیب بوڑھے کی لاش میز پر رکھی گئی۔ لاش کفن میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف موم بتیاں جل رہی تھیں۔ کھانے کا کمرہ ملازموں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ لاش کے آخری آرام گاہ تک لے جائے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ ولادیمیر اور تین ملازموں نے جنازہ اٹھایا۔ پادری آگے آگے تھا۔ چھوٹا پادری اس کے ساتھ ساتھ دعائیں گنگناتا ہوا چل رہا تھا۔ کستےنیوکا کے مالک نے آخری بار اپنے گھر کی دھلیز کو پار کیا۔ جنازہ درختوں کے جھنڈ کو پیچھے چھوڑکر آگے بڑھ گیا۔ اس کے پار ہی گرجا تھا۔ دن روشن اور ٹھنڈا تھا۔ خزاں رسیدہ درختوں سے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے۔

درختوں کے جھنڈ سے نکلتے ہی انہیں کستےنیوکا کا لکڑی کا بنا ہوا گرجا نظر آیا جو قبرستان کے لائیم کے پرانے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہیں ولادیمیر کی ماں بھی زمین کے اندر سوئی ہوئی تھی۔ اس کے قبر کے پہلو میں پچھلے دن ایک تازہ قبر کھد گئی تھی۔

گرجا کستےنیوکا کے کسانوں سے بھرا ھوا تھا جو اپنے مالک کو آخری خراج عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔ نوجوان دوبرووسکی بھجن گانےوالوں کی چوکی کے پاس کھڑا تھا۔ وہ نہ رو رھا تھا اور نہ دعا مانگ رھا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ یہ حزینہ تقریب ختم ھوئی۔ ولادیمیر نے سب سے پہلے لاش کو الوداع کہا اور اس کے بعد اس کے تمام نوکروں نے۔ تختہ برابر کیا گیا اور کیلیں جڑدی گئیں۔ عورتیں دھاڑیں مار مار کر بین کر رھی تھیں اور بہت سے مرد بھی اپنی انگلیوں سے آنسو پونچھتے ھوئے نظر آئے۔ ولادیمیر اور وھی تین ملازم جنازے کو قبرستان میں لے گئے اور گاؤں کی پوری آبادی ان کے پیچھے ھو لی۔ تابوت کو قبر میں اتارا گیا۔ اس کے بعد ھر ایک نے قبر میں ایک مٹھی ریت ڈالی اور جب قبر ڈھک گئی تو ھر ایک الوداع کہنے کے لئے جھکا اور وھاں سے چلا گیا۔ ولادیمیر سبھوں سے پہلے وھاں سے چلا گیا اور کستےنیوکا کے جنگل میں غائب ھو گیا۔

چھوٹے سرکار کی طرف سے، یگوروونا نے پادری اور اس کے ماتحت تمام راھبوں کو جنازے کے کھانے پر مدعو کیا اور ساتھ ھی یہ بھی کہہ دیا کہ ان کا میزبان اس تقریب میں کوئی حصہ نہ لیگا۔ اور پادری انتون، اس کی بیوی فیدوتوونا اور چھوٹا پادری پیدل ھی اس کے گھر کی طرف چل دئے اور راستے بھر یگوروونا سے مرحوم کے حسن و خوبی اور اس مستقبل کا ذکر کرتے رھے جو اس کے جانشین کی راہ دیکھ رھا تھا۔ (ترویئےکوروف کی آمد اور اس کا جو استقبال ھوا تھا اس کا حال پورے جوار میں مشہور ھو چکا تھا اور مقامی عاقل و فاضل قسم کے لوگ اس کے نتیجے کے طور پر آنےوالے اھم واقعات کی پیش گوئی کر رھے تھے۔)

”قسمت کا لکھا ھوکر رھتا ھے“، پادری کی بیوی نے کہا۔ ”لیکن اگر ولادیمیر اندریےوچ ھمارا مالک نہ ھو تو یہ ھمارے لئے باعث شرم ھے۔ وہ ایک بہادر نوجوان ھے، ایک بہادر نوجوان!“

''کیوں — اور کون ہوگا ہمارا مالک؟'' یگوروونا نے کہا۔ ''اور کیریلا پترووچ کو آسمان سر پر اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا پیارا شاہیں اس کی ٹکر کا ثابت ہوگا۔ وہ اپنا کام آپ سنبھال سکتا ہے اور خدا نے چاہا تو اس کے مدد کرنےوالے اس کے آڑے آئینگے۔ کیریلا پترووچ بہت مغرور ہے۔ لیکن جب میرے گریشا نے اسے دھتکارا تو کیا اس کو دم دبا کر بھاگتے نہ بنی: 'بوڑھے کتے یہاں سے دور ہو جا! نکل جا یہاں سے!''

''اوہ اوہ یگوروونا!'' چھوٹے پادری نے کہا ''میں حیران ہوں کہ تمہارے گریشا کو یہ کہنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ میں کیریلا پترووچ کے مقابلے میں بڑے پادری پر زیادہ آسانی سے بھونک سکتا ہوں۔ میں تو اسے دیکھ کر ہی مارے ڈر کے لرزنے لگتا ہوں اور مجھے پسینہ آ جاتا ہے اور خود بخود میری کمر جھکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔''

''یہ دنیا مایا جال ہے'' پادری بولا۔ ''ایک دن اس کا جنازہ بھی اندری گاوریلووچ کے جنازے کی طرح اٹھیگا۔ ممکن ہے کہ اس کا جنازہ زیادہ قیمتی ہو اور زیادہ مہمان مدعو ہوں اور بس۔ لیکن خدا کی نظر میں یہ سب برابر ہے۔''

''اہ فادر! ہم‌تو پورے گرجا کو دعوت دینا چاہتے تھے لیکن ولادیمیر اندریےوچ ٹس سے مس نہ ہوا۔ خوراک کی کمی نہیں۔ ہم ایک بہت بڑی شاندار دعوت کر سکتے تھے لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ آہ، خیر، چونکہ ہمارے مہمان تھوڑے ہیں اس لئے، عزیز دوستو، ہم تمہاری خاطر مدارات زیادہ کرسکینگے۔''

دریا دلی سے بھرے ہوئے اس وعدے اور عیش و طرب کی امید نے ان کے قدم تیز کر دئے۔ اور جلد ہی وہ دوبرووسکی کے گھر پہنچ گئے جہاں کھانے کی میز پہلے ہی سے تیار تھی اور پیالوں میں ووڈکا انڈیلی جا چکی تھی۔

اس اثنا میں ولادیمیر درختوں کے جھنڈ کے اندر زیادہ سے زیادہ دور تک دراتا چلا گیا۔ وہ اس مستقل‌چلنے

اور تھکن سے اپنے غم کو دبانے کی جد وجہد کر رہا تھا۔ وہ چلتا رہا چلتا رہا، اس سے بےپروا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ جھکی ہوئی شاخیں اس کے ہاتھ اور چہرے سے برابر الجھ رہی تھیں اور نوچ رہی تھیں۔ اس کے پاؤں دلدل میں دھنس رہے تھے لیکن وہ ان سب سے بےنیاز تھا۔ آخر وہ ایک چھوٹی سی وادی میں پہنچا جو چاروں طرف جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ ایک چشمہ خاموشی سے ان درختوں کے درمیان موجیں مار رہا تھا جن سے خزاں نے سارے پتے چھین لئے تھے۔ ولادیمیر رک گیا اور ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ گیا اور غم بھرے خیالات میں کھو گیا... تنہائی کا احساس اس کے دل میں چبھ رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس کا پورا مستقبل خوفناک بادلوں میں گھرا ہوا تھا۔ تروئے کوروف کی دشمنی سے تازہ بربادیوں کے اندیشے تھے۔ یہ ساری جائداد، جو ایک چھوٹی سی جائداد تھی، دوسرے کے ہاتھوں میں پہنچتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور اس حالت میں مستقبل میں اس کے لئے افلاس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ بہت دیر تک وہ چشمے کے کنارے بے حس و حرکت بیٹھا رہا اور اس کی سست‌رو لہروں کو دیکھتا رہا جو اپنے ساتھ سوکھے ہوئے پتوں کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ منظر زندگی سے کتنا ملتا ہے۔ ایک پامال تشبیہہ۔ آخر اسے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھا اور گھر کا راستہ ڈھونڈنے لگا۔ وہ دیر تک اس انجانے جنگل میں بھٹکتا پھرا۔ آخر اسے وہ راستہ ملا جو سیدھا اس کے گھر کے پھاٹک کی طرف جاتا تھا۔

اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے دوبرووسکی کو پادری اور اس کے ماتحت راہبوں کا غول نظر آیا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال کوند گیا کہ یہ ایک برا شگون تھا... وہ بے اختیار ایک طرف ہٹ گیا اور درختوں میں چھپ گیا۔ انہوں نے اس کو نہیں دیکھا اور بڑے چاؤ سے بات کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے۔

''مصیبت سے بچو اور اپنا بھلا کرو،، پادری اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ''ہمارے لئے یہاں کچھ بھی

نہیں ۔ چاہے جو کچھ ہو، اس سے ہمیں کچھ نہیں لینا دینا...،،

اس کی بیوی نے جواب میں کچھ کہا لیکن ولادیمیر اس کی بات سن نہ سکا ۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ — کسان اور گھر کے ملازم صحن میں بھیڑ لگائے کھڑے ہیں ۔ ولادیمیر کو دور آوازوں کا شور سنائی دیا ۔ کوچ گھر کے سامنے تین گھوڑوں والی دو گاڑیاں کھڑی تھیں ۔ کئی وردی پوش اجنبی برساتی میں کھڑے کچھ بحث کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے ۔

''آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟،، اس نے انتون سے پوچھا جو اس سے ملنے کے لئے دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا تھا ۔ ''کون لوگ ہیں یہ اور کیا چاہتے ہیں؟،،

''اوہ، ولادیمیر اندریےوچ، میرے مالک!،، بڈھے نے ہانپتے ہوئے کہا ۔ ''یہ ضلع عدالت سے آئے ہیں ۔ وہ ہمیں تروئےکوروف کے نرغے میں دینا چاہتے ہیں ۔ وہ ہمیں، حضور سے چھین لینا چاہتے ہیں!،،

ولادیمیر نے اپنا سر جھکا لیا اور ملازم اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے ۔

'' تم ہمارے مائی باپ ہو،، انہوں نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے چلاکر کہا ۔ '' ہم تمہارے سوا اور کوئی مالک نہیں چاہتے ۔ تم حکم دو اور ہم ججوں کا حساب کتاب برابر کر دینگے ۔ ہم تمہارے ساتھ غداری کرنے سے تو مر جانا بہتر سمجھتے ہیں...،،

ان کو دیکھتے ہوئے اس کے دماغ میں عجیب وغریب خیالات ابھرے۔

''یہاں تم خاموش ٹھیرو،، اس نے کہا ۔ ''میں جاؤنگا اور ان افسروں سے بات کروں گا ۔،،

''مالک، ان سے بات کروگے،، ہجوم سے آواز آئی ۔ ،،جاؤ ان رذیل کتوں کو شرم دلانے کی کوشش کر دیکھو ۔،،

ولادیمیر افسروں کے پاس پہنچا۔ شاباشکین اپنے ہاتھ کولھوں پر رکھے، اپنی ٹوپی سر پر جمائے، بڑی گستاخ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تھانیدار جو پچاس برس کا ایک لمبا، بھاری بھرکم سا آدمی تھا، اور جس کا مونچھوں‌والا چہرہ سرخ تھا، قریب آتے ہوئے دوبرووسکی کو جھلائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے چنگھاڑا:

''میں تم سے ایک بار پھر کہے دیتا ہوں،، وہ پھنسی پھنسی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''ضلع عدالت کے فیصلے کے مطابق تم آج سے کیریلا پترووچ کی آسامی ہو جن کی نمائندگی مجسٹریٹ شاباشکین کرتے ہیں۔ تم ان کا ہر حکم بجا لاؤ، اے بدمعاش عورتو، بہتر ہوگا کہ تم ان کو چاہنا شروع کر دو، کیونکہ وہ تمہیں جی جان سے چاہتے ہیں۔،،

تھانیدار خود اپنے طنز پر خوش ہوکر ہنسا اور دوسرے افسر بھی اس کی صدائے بازگشت بن گئے۔ ولادیمیر غصے سے کانپ رہا تھا۔

''کیا میں اس کا مطلب پوچھ سکتا ہوں؟،، اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے جھکتے ہوئے تھانیدار سے پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے،، فاضل افسر نے کہا ''کہ ہم یہاں کیریلا پترووچ کو قبضہ دلانے اور 'بعض دوسرے لوگوں، کو مشورہ دینے آئے ہیں کہ وہ اپنا بوریا بستر سنبھالیں۔،،

''تمہیں چاہئے تھا کہ تم کسانوں سے بات کرنے سے پہلے میرے پاس آتے اور جاگیر کے مالک کو جاگیر چھوڑنے کے متعلق بتاتے۔،،

''اور تم ہو کس کھیت کی مولی؟،، شاباشکین نے اس کو گستاخی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''خدا کی مرضی ہے، سرحوم زمیندار اندری ولد گاوریل دوبرووسکی، مر چکا ہے۔ اور ہم نہ تم کو جانتے ہیں اور نہ جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔،،

''یہ ہیں ہمارے چھوٹے سرکار۔ ولادیمیر اندریےوچ،، ہجوم میں سے ایک آواز آئی۔

''یہ کون ہے، کس کی مجال ہے بولنے کی؟'' تھانیدار نے دھمکی کے انداز میں پوچھا ''کیسا مالک؟ کون ولادیمیر ریبےوچ؟ تمہارے مالک کیریلا پتروویچ ہیں - سنا تم نے، بدمعاشو؟''

''اوہ نہیں وہ ہمارا مالک والک نہیں ہے!'' وہی آواز سنائی دی -

''یہ تو فساد ہے!'' تھانیدار چلایا - ''مکھیا - ادھر آؤ!''

گاؤں کا مکھیا آگے بڑھا -

''فوراً ڈھونڈو اس کو - جواب دینے کی مجال کیسے ہوئی! میں اس کو مزا چکھاؤنگا!''

مکھیا ھجوم کی طرف مڑا اور پوچھا کہ کون بولا تھا - لیکن کوئی کچھ نہ بولا - اور دفعتاً مجمع میں بھنبھناھٹ شروع ھوئی اور یہ بھنبھناھٹ تیز سے تیز تر ھوتی گئی - اور چند سکنڈ میں ایک ایسے شور میں بدل گئی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی - تھانیدار نے اپنی آواز نیچی کرلی اور انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگا -

''آؤ لڑکو - ھمیں انتظار کاھے کا؟'' ملازموں نے نعرہ لگایا - ''ان کا ستیاناس ھو!'' اور ھجوم آگے بڑھا -

شاباشکین اور دوسرے اراکین جلدی جلدی گھر کے اندر گھس گئے اور اندر سے تالا ڈال دیا -

''لڑکو ان کو باندھ لو!'' اسی آواز نے زور سے کہا اور ھجوم آگے بڑھا...

''رک جاؤ!'' دوبرووسکی چلایا - ''احمقو تم کیا کر رہے ھو؟ تم خود بھی برباد ھوگے اور مجھے بھی تباہ کروگے - تم اپنے گھر جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو - ڈرو مت، ھمارا زار رحم و کرم کرنا جانتا ہے - میں اس سے کہوں گا — وہ ھمارے ساتھ ناانصافی نہ ھونے دیگا - ھم سب اس کے بال بچے ھیں لیکن اگر تم ھنگامہ اور فساد کروگے تو وہ تمہاری حفاظت کیوں کر کر سکیگا؟''

دوبرووسکی کی باتوں، اس کی گونجتی گرجتی آواز اور پرجلال شخصیت کا خاطر خواہ اثر ہوا! لوگ ٹھنڈے پڑے اور بکھر گئے اور احاطہ سنسان ہو گیا۔ کمیشن کے ممبر اب تک گھر کے اندر بند تھے۔ آخر شاباشکین نے چپکے دروازے کا تالا کھولا، برساتی میں آیا، اور بڑی نیاز مندی کے ساتھ دوبرووسکی کے سامنے جھکا اور اس کی پناہ کا شکریہ ادا کیا۔

ولادیمیر نے حقارت سے اس کی بات سنی اور کچھ نہ بولا۔

''ہم نے فیصلہ کیا ہے،، مجسٹریٹ نے کہا ''کہ آپ کی اجازت سے ہم رات یہیں بسر کریں، کیونکہ اب اندھیرا ہو چکا ہے اور راستے میں ممکن ہے کہ آپ کے کسان ہم پر حملہ کر دیں۔ کیا آپ ہمارے لئے ہال میں پیال نہیں بچھوا دینگے؟ پو پھٹتے ہی ہم گھر چلے جائینگے۔،،

''جو جی چاہے کرو،، دوبرووسکی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''میں اب یہاں کا مالک نہیں ہوں۔،،

ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنے باپ کے کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

چھٹا باب

''تو قصہ تمام ہوا،، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''آج صبح تک میرے سر پر ایک چھت کا سایہ تھا اور کھانے کو روٹی۔ کل مجھے اس کو چھوڑ دینا پڑیگا جہاں میں نے جنم لیا تھا، وہ گھر جس میں میرا باپ مرا، اور مجھے یہ گھر اس آدمی کے ہاتھوں میں چھوڑنا پڑیگا جس نے میرے باپ کی جان لی اور مجھے کنگال بنایا۔،، اور اس نے اپنی

ماں کی تصویر پر اپنی آنکھیں جما دیں۔ مصور نے اس کو ایک چھجے کے کٹہرے پر کہنیاں ٹیکے ہوئے دکھایا تھا۔ وہ صبح کے سفید لبادے میں تھی اور اس کے بالوں میں گلاب کا سرخ پھول تھا۔ ''یہ تصویر بھی میرے باپ کے دشمنوں کے قبضے میں آجائیگی،، ولادیمیر نے سوچا۔ ''یہ تصویر ٹوٹی پھوٹی کرسیوں کے ساتھ گودام گھر میں پھینک دی جائیگی یا گلیارے میں ٹانگ دی جائیگی تاکہ اس کے شکاریوں کی پھبتیوں اور حقارت آمیز باتوں کا نشانہ بنے۔ ماں کے سونے کے کمرے میں یا تو اس کے کارندے کا ٹھکانہ بن جائیگا یا اس کا حرم آباد ہو جائیگا۔ نہیں نہیں! سوگ میں ڈوبا ہوا یہ گھر جس سے وہ مجھے نکال رہا ہے کبھی بھی اس کی ملکیت نہ بن سکیگا،، ولادیمیر کے جبڑے جکڑ گئے۔ اس کے دماغ میں عجیب بھیانک خیالات جڑ پکڑ رہے تھے۔ کارکنوں کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ گھر میں عیش کر رہے تھے، کبھی اس چیز کا مطالبہ کرتے کبھی اس چیز کا اور اس کے غمزدہ خیالات کو درہم برہم کرکے رکھ دیتے۔ آخر سناٹا چھا گیا۔

ولادیمیر نے صندوق اور درازیں کھولیں اور مرحوم باپ کے کاغذات دیکھنے لگا۔ زیادہ تر یہ گھریلو حساب کتاب کے کاغذات تھے اور مختلف چیزوں کے متعلق خط وکتابت۔ ان کو پڑھے بنا ھی ولادیمیر نے پھاڑ کر پھینک دیا۔ لیکن ان کاغذات میں اس کو ایک پلندا ملا جس پر لکھا ہوا ''میری بیوی کے خطوط،،۔ اس کے دل میں ہیجان سا مچ گیا۔ اس نے ان کو پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط کسترےنیوکا سے، ترکوں کی مہم کے زمانے میں لکھے گئے تھے اور ان پر فوج کے پتے لکھے تھے۔ اس کی ماں نے ان میں اپنی تنہائی کی زندگی اور گھریلو پریشانی اور تردد کی تصویر کھینچی تھی اور بڑے دلگداز انداز میں دردھجر کا ذکر کیا تھا اور اس کے باپ سے التجا کی تھی کہ جلدی گھر آجاؤ اور اپنی رفیقہ حیات کے بازوؤں میں سما جاؤ۔ ایک خط میں اس نے ننھے ولادیمیر کی صحت کی

طرف سے تردد کا اظہار کیا تھا اور دوسرے خط میں اس کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس کے لئے ایک خوش و خرم اور درخشاں مستقبل کی پیش گوئی کی تھی۔ خطوں کے پڑھنے میں، ولادیمیر ایسا کھویا کہ سب کچھ بھول گیا۔ وہ گھریلو راحتوں کی دنیا میں کھو گیا۔ اور اس کو وقت کی پرواز کا احساس بھی نہ رہا، یہاں تک کہ بابائے وقت نے گیارہ بجا دئیے۔ تب اس نے خطوط کو جیب میں رکھا، ایک موم بتی اٹھائی اور مطالعے کے کمرے سے چلا گیا۔ کلرک ہال کے فرش پر سوئے ہوئے تھے۔ میز پر گلاس رکھے تھے اور کمرے میں رم کی تیز بو بسی ہوئی تھی۔ ولادیمیر انتہائی بیزاری کے ساتھ دروازے کی طرف جاتے ہوئے ان کے پاس سے گزرا۔ دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ جب کنجی نہ ملی تو وہ ہال میں واپس آگیا۔ کنجی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور دروازے کے پاس پڑے ہوئے ایک آدمی سے ٹکرا گیا جس کے ہاتھ میں کلہاڑی چمک رہی تھی۔ موم بتی کی روشنی میں ولادیمیر نے لوہار ارخیپ کو پہچان لیا۔

''تم کیا کر رہے ہو یہاں؟،، اس نے پوچھا۔

''اوہ، تم ہو، ولادیمیر اندریےوچ!،، ارخیپ نے سرگوشی کی۔ ''خدا تم پر رحمت نازل کرے اور تم کو سلامت رکھے! بہت اچھا کیا تم نے کہ موم بتی لے آئے۔،،

ولادیمیر نے اس کو حیرت سے دیکھا۔

''تم یہاں چھپے کیا کر رہے ہو؟،، اس نے لوہار سے پوچھا۔

''جی چاہا... آگیا... کہ دیکھوں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا،، ارخیپ ہکلایا۔

''یہ کلہاڑی کیوں ہے ہاتھ میں؟،،

''کلہاڑی؟ ایسے زمانے میں آدمی کلہاڑی کے بغیر کیسے چل سکتا ہے؟ یہ کلرک ایسے بدمعاش ہیں، جانتے ہی ہو، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی نیت کیا ہے...،،

''تم نشے میں ہو۔ کلہاڑی الگ رکھو اور سو جاؤ۔''

''نشے میں؟ میں؟ مالک، خدا گواہ ہے، ولادیمیر اندریےوچ ایک بوند بھی جو منہ میں ٹپکائی ہو۔ اس وقت پینے کا دھیان کس مسخرے کو آئیگا؟ کسی نے کاھیکو کبھی ایسا سنا ہوگا کہ کارک یوں دندناتے پھریں اور مالکوں کو ان کے اپنے گھر سے نکال باھر کریں؟.. ذرا سنو، خراٹے لے رہے ھیں کس ٹھاٹ سے، خدا کے مار! ھم ان سب کا قصہ پاک کر سکتے ھیں اور چونا لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے!''

دوبرووسکی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''سنو ارخیپ'' اس نے ایک ذرا رک کر کہا۔ ''تم کچھ اچھا نہیں سوچ رہے ھو۔ یہ کارکوں کا قصور نہیں ہے، لالٹین جلاؤ اور میرے ساتھ آؤ۔''

ارخیپ نے اپنے مالک کے ھاتھ سے موم بتی لی، چولھے کے پیچھے اسے ایک لالٹین مل گئی۔ اس نے لالٹین جلائی اور اس کے بعد دونوں چپکے چپکے برساتی سے صحن میں اترے۔ پہریدار گھنٹہ بجا رہا تھا، کتے بھونک رہے تھے۔

''کون پہرہ دے رہا ہے؟'' دوبرووسکی نے پوچھا۔

''ھم ھیں مالک'' ایک آواز نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''واسیلیسا اور لوکیریا۔''

''تم اپنے اپنے گھر جاؤ'' دوبرووسکی نے ان سے کہا۔ ''تمہاری ضرورت نہیں۔''

''تم جا سکتی ھو!'' ارخیپ نے حکم دیا۔

''شکریہ، مائی باپ'' عورتوں نے جواب دیا اور اپنے گھر کی طرف چل دیں۔

دوبرووسکی آگے بڑھا۔ دو آدمی اس کے قریب آئے — انہوں نے آواز دی اور دوبرووسکی نے گریشا اور انتون کی آواز پہچان لی۔

''تم سوتے کیوں نہیں؟'' اس نے ان سے پوچھا۔

''ھم کیسے سو سکتے ھیں؟'' انتون نے کہا۔ ''یہ

سوچ کر کیسے نیند آ سکتی ہے کہ ہم کیا سے کیا ہو گئے۔ کس کو یقین آ سکتا تھا کہ...،،

"ڈھارس رکھو!،، دوبرووسکی نے بیچ میں کہا۔ "یگورووونا کہاں ہے؟،،

"بڑے گھر میں اپنے کمرے میں،، گریشا نے جواب دیا۔

"جاؤ اور اس کو بلا لاؤ، اپنے تمام لوگوں کو گھرسے باھر نکال لاؤ، ایک شخص بھی اندر نہ رہے سوائے کارکوں کے۔ اور تم انتون، گاڑی میں گھوڑے جوتو۔،،

گریشا چلا گیا اور چند منٹ میں اپنی ماں کے ساتھ واپس آ گیا۔ بوڑھی عورت نے اس رات اپنے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ گھر میں کارکوں کے سوا کسی نے بھی پلک نہ جھپکائی تھی۔

"کیا سب یہاں موجود ہیں؟،، دوبرووسکی نے پوچھا۔ "گھر میں تو کوئی نہیں رہا؟،،

"کوئی نہیں، بس کارک ہیں وہاں۔،،

"جاؤ، پیال یا سوکھی گھاس لے آؤ،، دوبرووسکی بولا۔

لوگ اصطبل کی طرف دوڑے اور سوکھی گھاس کی گانٹھ کی گانٹھ اٹھا لائے۔

"برساتی میں رکھو ان گانٹھوں کو یہ ٹھیک رہیگا۔ اب میرے لڑکو مجھے ذرا آگ دینا۔،،

ارخیپ نے لالٹین کی چمنی کھولی اور دوبرووسکی نے اس سے لکڑی کا ایک ٹکڑا جلایا۔

"ایک منٹ ٹھیرو،، اس نے ارخیپ سے کہا۔ "شائد میں نے ہال کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ بھاگ کر جاؤ اور اسے کھول دو۔،،

ارخیپ دروازے کے اندر گیا۔ دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ارخیپ زیرلب بڑبڑایا اور کنجی گھما دی "کھول دو — اوہ، نہیں!،، وہ دوبرووسکی کے پاس واپس آ گیا۔

دوبرووسکی نے بھڑکتی ہوئی لکڑی بڑھائی، گھاس بھڑک اٹھی اور شعلے لپکنے لگے اور سارا احاطہ روشن ہو گیا۔

''ہائے ہائے!'' یگوروونا ترس بھری آواز میں چلائی ''کیا کر رہے ہو تم، ولادیمیر اندریےوچ؟''

''چپ!'' دوبرووسکی نے کہا۔ ''اچھا، میرے بچو، خدا حافظ! جہاں خدا لے جائے، میں چل دیا — اپنے نئے مالک کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزارو۔''

''مائی باپ، ہمارے داتا!'' وہ سب چلائے ''تم کو چھوڑنے سے تو یہی اچھا ہے کہ ہم مر جائیں۔ ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔''

گھوڑے لائے گئے۔ دوبرووسکی گاڑی میں گریشا کے برابر بیٹھ گیا اور اپنے لوگوں کو ملنے کی ایک جگہ بتائی۔ کستےنیوکا کا جنگل — انتون نے گھوڑوں کو چابک لگایا اور وہ احاطے سے باہر نکل گئے۔

ہوا تیز ہونے لگی۔ ایک منٹ بعد سارا گھر شعلوں میں گھر گیا۔ سرخ سرخ دھوئیں کی موجیں چھت کے اوپر اٹھ رہی تھیں۔ شیشے ٹوٹنے اور زمین پر جھناکے کے ساتھ گر کر بکھرنے لگے۔ ہوا میں دھکتی ہوئی روشنیاں تیرنے لگیں۔ اور بےبسی کی چیخ پکار اور دھائی سنائی دینے لگی: ''ہم جل رہے ہیں، مدد، مدد!''

''اوہ نہیں!'' ارخیپ نے ایک خباثت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''ارخیپ میرے بھائی'' یگوروونا نے کہا ''ارے ان منحوسوں کو بچا لو، خدا تمہیں اس کا اجر دیگا۔''

''نہیں، ہرگز نہیں'' لوہار نے جواب دیا۔

اس لمحے کلرک کھڑکی میں نظر آئے اور وہ کھڑکی کے دہرے شیشوں کو توڑنے لگے۔ لیکن چھت دھڑام سے نیچے آ رہی اور اب چیخ پکار نہیں سنائی دے رہی تھی۔

دیکھتے دیکھتے احاطہ گھریلو ملازموں سے بھر گیا۔ عورتیں اپنی حقیر چیزیں بچانے کے لئے چیختی چلاتی دوڑیں، بچے اچھلنے کودنے لگے اور شعلوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہونے لگے۔ چنگاریوں کا طوفان اٹھتا رہا اور بڑے گھر کے پاس والے گھروں نے بھی آگ پکڑ لی۔

''اب سب ٹھیک ہے،، ارخیپ نے کہا۔ ''آگ کی جلن کیسی لگتی ہے! پوکرووسکوئے سے تو بڑا سہانا دکھتا ہوگا۔،،

لیکن اب کسی نئی چیز نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ایک جلتے ہوئے گئوشالے کی چھت پر ایک بلی دوڑ رہی تھی اور بڑی وحشت کے ساتھ ادھر ادھر کہیں کودنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی اس لئے کہ گئوشالہ چاروں طرف شعلوں میں گھرا ہوا تھا۔ میاؤں میاؤں کر کے بیچاری بلی رحم کی التجا کر رہی تھی اور اس کی مصیبت دیکھ کر لڑکوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''نامعقولو تم ہنس کاہے پر رہے ہو؟،، لوہار نے بھنا کر کہا۔ ''کیا تم کو خدا کا ڈر نہیں؟ خدا کی ایک مخلوق برباد ہو رہی ہے اور تم خوش ہو رہے ہو۔ نالائق کہیں کے۔ ،، اور اس نے جلتی ہوئی چھت سے ایک سیڑھی لگائی اور بلی کو بچانے کے لئے اوپر چڑھ گیا۔ بلی نے اس کے ارادے کو بھانپ لیا اور اچھل کر اس کی آستین پکڑ کر لٹک گئی اور انتہائی خوف اور ممنونیت کے ساتھ اس کو دیکھنے لگی۔ لوہار، بری طرح جلا ہوا بلی کے ساتھ نیچے آ گیا۔

''اچھا، لڑکو رخصت!،، اس نے بدحواس ملازموں سے کہا۔ ''میرے لئے اب یہاں کچھ نہیں رہا۔ خدا تم لوگوں کو خوش رکھے۔ اگر کبھی تم لوگوں کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔،،

لوہار چل دیا اور آگ اور کچھ دیر تک دھکتی بھڑکتی رہی۔ آخر شعلے تھمے اور اندھیرے میں انگارے دھکتے رہے اور اب کستےنیوکا کے بےگھر باشندے ان کے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔

ساتواں باب

دوسرے دن آگ کی خبریں ضلع بھر میں آگ کی طرح پھیل گئیں - ہر شخص کی زبان پر اسی کا ذکر تھا اور جتنے منہ اتنی باتیں، طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں - کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ دوبرووسکی کے آدمی جنازے کے بعد پی کر آپے سے باہر ہو گئے اور محض ان کی بےپروائی سے گھر میں آگ لگ گئی - دوسروں نے سارا الزام کارکوں کے سر دھرا جو (ان کے قول کے مطابق) نئے گھر میں آنے کا جشن منا رہے تھے - بہتوں کا خیال تھا کہ کسی حادثے کی وجہ سے گھر میں آگ لگی تھی اور ضلع عدالت کا سارا عملہ اور سارا گھر جل کر راکھ ہو گیا - کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے حقیقت کو تاڑ لیا اور کہا کہ خود دوبرووسکی انتہائی غم و غصے میں اس بھیانک تباہی کا سبب بنا تھا - دوسرے دن ہی تروئے کوروف نے اس کا معائنہ کیا اور جائے وقوع پر چھان بین اور تفتیش کی - پتہ چلا کہ تھانیدار، مجسٹریٹ، سرکاری وکیل اور کلرک اور ساتھ ہی ولادیمیر دوبرووسکی، اس کی نرس یگورووونا، خدمت‌گار گریشا، کوچبان انتون اور لوہار ارخیپ غائب ہیں... تمام ملازموں نے گواہی دی کہ جب چھت گری تو سب کلرک اس کے نیچے دب کر جل مرے اور اس کے بعد ملبے سے ان کی ہڈیاں کھود کر نکالی گئیں - دو عورتوں، واسیلیسا اور لوکیریا نے کہا کہ انھوں نے آگ لگنے سے ٹھیک پہلے دوبرووسکی اور لوہار ارخیپ کو دیکھا تھا - عام شہادتوں کے مطابق یہ طے پایا کہ لوہار ارخیپ زندہ ہے اور وہ واحد مجرم نہیں تو کم از کم سب سے بڑا مجرم ضرور تھا - دوبرووسکی زبردست شک وشبہے کا مرکز بن گیا - کیریلا پتروِوچ نے پورے حادثے کی تفصیل روانہ کی اور ایک نیا مقدمہ کھل گیا -

بہت جلد دوسری خبروں نے تجسس اور قیاس آرائیوں

کو ہوا دینا شروع کر دیا۔ ضلع... میں، ڈاکوؤں کا ایک گروہ ابھرا اور اس نے قرب و جوار کو دہلا کر رکھ دیا۔ ان کے خلاف حکام نے جو قدم اٹھائے وہ ناکافی ثابت ہوئے۔ تابڑتوڑ ڈاکے پڑنے لگے۔ اور ہر نیا ڈاکہ پچھلے ڈاکے سے زیادہ زوردار ہوتا۔ نہ سڑکوں پر آدمی محفوظ تھا اور نہ دیہاتوں میں۔ اس صوبے میں، دن دھاڑے، تین گھوڑوں والی گاڑیوں میں سوار یہ ڈاکو دندناتے نظر آتے۔ وہ مسافروں اور ڈاک چوکی کی گاڑیوں کو روکتے، گاؤں میں جاتے، زمینداروں کو لوٹتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دیتے۔ ان ڈاکوؤں کا سردار اپنی انوکھی حرکتوں، جرأت و بہادری اور ایک قسم کی وسیع القلبی کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا۔ اس کے بارے میں حیرت‌ناک باتیں کہی جاتیں۔ ہر شخص کی زبان پر دوبرووسکی کا نام تھا۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ ان جیالے ڈاکوؤں کا سردار سوائے دوبرووسکی کے اور کوئی نہیں۔ ایک بات پر ہر شخص تھا کہ تروئےکوروف کی جاگیر کو ڈاکوؤں نے ہاتھ بھی نہ لگایا تھا، ڈاکوؤں نے ایک گئوشالے کو بھی نہیں چھوا تھا، اور نہ کبھی جاگیر کی گاڑی کو روکا تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں، تروئےکوروف شیخی بگھارتا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ صوبے بھر میں اس کی دھاک ہے۔ ساتھ ہی وہ پولیس بھی اس کا سبب تھی جو اس نے اپنے گاؤں میں پال رکھی تھی۔ شروع میں تو تروئےکوروف کے پڑوسی اس کی خودپرستی اور زعم پر ہنستے اور آئے دن ان کو یہ سننے کی امید رہتی کہ یہ بن بلائے مہمان پوکرووسکوئے پہنچ گئے جہاں ان کی خوب آؤبھگت ہوئی اور انہوں نے خوب خوب اپنے ہاتھ رنگے لیکن انجام‌کار ان کو یہ ماننا پڑا کہ ڈاکو بھی تروئےکوروف کی عزت کرتے ہیں اور یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی... دوبرووسکی کے ہر تازہ حملے کا حال سن کر تروئےکوروف اپنا سینہ پھلاتا اور گورنر، تھانیدار، اور کمپنی کمانڈروں کا خوب خوب مذاق اڑاتا جن کے نرغے سے دوبرووسکی ہمیشہ صاف نکل جاتا اور اس کا بال بھی بیکا نہ ہوتا۔

پھر یکم اکتوبر کا دن آیا — تروئیےکوروف گاؤں کے نگہبان بزرگ کا دن... لیکن ان تقریبوں اور ان کے بعد رونما ہونےوالے واقعات کی تصویر کھینچنے سے پہلے ہمیں، پڑھنے والوں کو ان بعض لوگوں سے روشناس کرنا چاھئے جو اب تک انجانے ھیں یا جن کا ذکر کہانی کے شروع میں محض سرسری آیا ہے۔

آٹھواں باب

بلاشبہہ قارئین نے یہ تاڑ لیا ھوگا کہ کیریلا پترووچ کی لڑکی، جس کے بارے میں ہم نے ابھی چند ھی لفظ کہے ھیں، اس داستان کی ھیروئن ہے۔ جب ھماری داستان شروع ھوئی تھی، اس وقت اس کی عمر سترہ برس تھی اور اس کا حسن اپنے پورے شباب پر تھا۔ اس کا باپ اس پر جان دیتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بھی اپنی من مانی کیا کرتا۔ کبھی تو وہ اس کی ہر ہر خواھش پوری کرتا اور کبھی اسے بےرحمی کی حد کو پہنچی ھوئی سخت گیری سے دھلا کر رکھ دیتا۔ اگرچہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس سے بہت ھلی ھوئی ہے، وہ کبھی بھی اس کا پورا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ھو سکا۔

اس کی نشو و نما کچھ اس طرح ھوئی کہ وہ اس سے اپنے خیالات وجذبات چھپانے کی عادی ھو گئی اور کبھی بھی اس کو پورا یقین نہ آتا کہ وہ اس کا استقبال کس طرح کریگا۔ اس کی کوئی ھم جنس سہیلی نہ تھی اور وہ تنہائی میں پل کر جوان ھوئی تھی۔ پاس پڑوس کے زمینداروں کی بیوی بیٹیاں کبھی کبھار ھی وھاں آتیں کیونکہ کیریلا پترووچ کی بات چیت اور تفریحی مشغلوں کا رنگ ڈھنگ ایسا ھوتا جس میں مردوں کی ضرورت ھوتی ہے، بھلا اس میں عورتوں کا کہاں گزر۔ ھماری حسینہ کبھی کبھار ھی

ان سہمانوں کے سامنے آتی جو کیریلا پترووچ کے ساتھ دعوتیں اڑاتے اور عیش کرتے - ایک بہت بڑی لائبریری، جو زیادہ تر اٹھارھویں صدی کے فرانسیسی ادیبوں کی کتابوں سے آراستہ تھی، اس کے لئے وقف تھی - اس کا باپ، جس نے ''باکمال باورچن،، کے سوا اور کچھ نہ پڑھا تھا، کتابوں کے انتخاب میں ماشا کی رہنمائی کرنے سے معذور تھا اور ماشا ہر قسم کی کتابوں کو الٹ پلٹ کرکے قدرتی طور پر اپنے پڑھنے کے لئے صرف ناول کا انتخاب کرتی - اس طرح اس نے اپنی تعلیم ختم کی جو ایک زمانہ پہلے مادامسوزیل میمی کی سرپرستی اور رہنمائی میں شروع ہوئی تھی - مادامسوزیل میمی کو کیریلا پترووچ نے بےانتہا لطف وکرم سے نوازا اور آخرمیں جب یہ لطف و کرم رنگ لایا اور بہت نمایاں ہونے لگا تو ایک دن چپکے سے اس نے اس کو ایک دوسری جاگیر چلتا کر دیا - مادامسوزیل نے اپنے پیچھے خوشگوار یادیں چھوڑی تھیں - وہ ایک نیک دل لڑکی تھی اس لئے کبھی بھی اس نے کیریلا پترووچ پر اپنے بےپناہ اثر کا غلط فائدہ نہیں اٹھایا - اس معاملے میں وہ کیریلا پترووچ کی ان دوسری منظور نظر لڑکیوں سے بہت مختلف تھی جو بڑی جلدی جلدی بدلتی رہتی تھیں - کیریلا پترووچ خود اس کو دوسروں پر ترجیح دیتا تھا اور کالی کالی آنکھوں والے نو برس کے شریر لڑکے کی پرورش و پرداخت، جس کا چہرہ مادامسوزیل میمی کے جنوبی خد وخال سے بہت ملتا تھا، خود کیریلا پترووچ نے کی- وہ اس کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا حالانکہ بہت سے ننگے پاؤں چھوکرے، جو کیریلا پترووچ کی صورت سے ملتے جلتے تھے، اس کی کھڑکیوں کے نیچے ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے اور وہ کسان چھوکرے سمجھے جاتے تھے -

کیریلا پترووچ نے اپنے چھوٹے سے ساشا کے لئے ماسکو سے ایک فرانسیسی اتالیق بلوایا جو ٹھیک اس وقت پوکرووسکوئے میں وارد ہوا جب وہ واقعات رونما ہو رہے تھے جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے-

کیریلا پترووچ نے اس اتالیق کو اس کے خوشگوار رنگ ڈھنگ اور سادہ لب و لہجے کی وجہ سے پسند کیا۔ عام سفارشی کاغذات کے علاوہ اس نے ترونئے کوروف کے ایک رشتہ‌دار کا خط بھی پیش کیا جس کے گھر وہ چار سال اتالیق کی حیثیت سے کام کرچکا تھا۔ کیریلا پترووچ نے ان سب کاغذات کا جائزہ لیا۔ اس فرانسیسی اتالیق کے سلسلے میں جو چیز اسے ایک آنکھ نہ بھائی، وہ اس کی نوجوانی تھی اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اس دلکش خامی کو اس صبر و تحمل اور تجربے کے منافی سمجھتا تھا جو ایک استاد کے بدنصیب پیشے کے لئے اتنا ضروری ہے۔ اس کے اپنے اندیشے تھے اور اس نے فوراً ھی اتالیق کے سامنے ان کو صاف کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس غرض سے اس نے ماشا کو بلوایا (کیریلا پترووچ فرانسیسی نہیں بولتا تھا اور وہ اس کی ترجمان تھی)۔

''یہاں آؤ ماشا۔ موسیو سے کہو کہ سب ٹھیک ہے۔ میں اسے رکھ لونگا۔ لیکن اس سے کہہ دو کہ وہ میری لڑکیوں کی طرف آنکھہ نہ اٹھائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میں اسے سیدھا واصل جہنم کر دونگا... میری طرف سے اس کا ترجمہ کر دو ماشا۔،،

ماشا کے چہرے پر رنگ آ گیا اور اس نے استاد کی طرف مڑتے ہوئے فرانسیسی میں کہا کہ اس کا باپ اس کی سمجھ بوجھ پر بھروسہ کرتا ہے اور اس سے شریفانہ رہن سہن کی توقع کرتا ہے۔

فرانسیسی نوجوان اس کے سامنے جھکا اور جواب دیا کہ اسے توقع ہے کہ اگر وہ لطف و کرم کا مستحق بننے میں ناکام بھی ہوا تو کم‌از کم اپنے لئے عزت کی جگہ ضرور پیدا کر لیگا۔

ماشا نے اس کا جواب لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا۔

''بہت اچھا،، کیریلا پترووچ نے کہا ''لیکن اسے نہ عزت کی ضرورت ہے اور نہ لطف و کرم کی۔ اس کا کام بس اتنا ہے کہ ساشا کی نگرانی کرے اور اسے گرامر اور جغرافیہ پڑھائے۔ اس کا ترجمہ کر دو۔،،

ماریا کیریلوونا نے اپنے باپ کی باتوں کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کے سخت اور کھردرے جملوں کو نرم کر دیا اور کیریلا پترووچ نے فرانسیسی نوجوان کو گھر کے اس بازو کی طرف چلتا کر دیا جہاں ایک کمرہ اس کے لئے محفوظ کر دیا گیا تھا۔

ماشا نے نوجوان فرانسیسی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ رئیسانہ تعصبوں میں گردن تک ڈوبی ہوئی تھی اور استاد کو نوکر یا مستری تصور کرتی تھی اور اس کی آنکھوں میں ملازم اور مستری آدمی نہیں تھے۔ اور نہ اسے اس اثر کا پتہ چلا جو اس نے موسیو دیفورژ پر چھوڑا تھا۔ نہ اس کو اس کی بو کھلاھٹ کا اندازہ ہوا، نہ اس کی گھبراھٹ اور بدلی ہوئی آواز کا۔ وہ اس کے بعد کئی دن تک اس سے ملتی رھی لیکن اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لیکن اس کو ایک بہت ھی غیرمتوقع طریقے سے، ایک بالکل دوسرے رنگ مین اسے دیکھنے کا سبق سیکھنا تھا۔

کیریلا پترووچ کی جاگیر میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے بھالو پالے جاتے تھے جن کو تربیت دی جاتی تھی۔ اور یہ پوکرووسکوئے کے مالک کےلئے انتہائی دل پسند تفریح کا سامان تھے۔ جب تک وہ بہت چھوٹے رہتے، وہ روزانہ ڈرائنگ روم میں لائے جاتے اور کیریلا پترووچ ایک ایک گھنٹہ ان سے کھیلتا اور اپنی بلیوں اور کتے کے پلوں کو ان سے لڑنے کے لئے للکارتا رھتا۔ جب وہ بڑے ھوتے تو ان کو زنجیر سے باندھ کر رکھا جاتا اور شکار کو اچھی طرح گھیرنے کے لئے تیار کیاجاتا۔ کبھی کبھی ان کو بڑے مکان کی کھڑکیوں کے سامنے لایا جاتا اور شراب کا خالی پیپہ جس میں کیلیں گڑی ھوتیں، اس کے سامنے لڑھکا دیا جاتا۔ بھالو اس کو سونگھتے، پھر احتیاط سے اسے چھوتے اور ان کے پنجوں میں کیلیں چبھتیں۔ درد سے بپھر کر بھالو پیپے پر اور بھی زور سے پنجہ مارتے اور انہیں اور زیادہ تکلیف ھوتی۔ اس پر بھالو کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور وہ اس پر پل پڑتے اور اس وقت تک اس سے گتھے رہتے

جب تک کہ بدنصیب درندوں کے سامنے سے پیپہ ہٹایا نہ جاتا ۔ بعض وقت دو بھالوؤں کو گاڑی میں جوت دیا جاتا اور اس میں مہمانوں کو، خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں، بٹھا دیا جاتا اور بھالوؤں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جدھر چاہیں دندناتے پھریں ۔ لیکن کیریلا پترووچ کے اس محبوب عملی مذاق کی اور بھی تفصیل بیان کرنی چاہئے ۔

ایک بھوکے بھالو کو دیوار میں گڑی ہوئی ایک کڑی میں بندھی ہوئی رسی سے باندہ دیا جاتا ۔ رسی کی لمبائی کمرے کی لمبائی کے برابر ہوتی اور اس طرح اس خوفناک درندے کے حملے سے بچنے کے لئے واحد محفوظ حصہ اس کے مقابل کا کونا ہوتا۔ کسی بالکل اناڑی آدمی کو اس کے دروازے کے اندر داخل کیا جاتا اور اچانک اس کو بھالو کی طرف ڈھکیل دیا جاتا، باہر سے دروازہ بند کر لیا جاتا اور اس مذاق کے بدنصیب شکار کو اس جھبرے سادھو کا سامنا کرنا پڑتا ۔ بدنصیب مہمان، اپنے چتھڑے چتھڑے کپڑوں کے ساتھ لہو لہان اور بدحواس، آخر اس محفوظ کونے میں پہنچ جاتا ۔ لیکن کبھی کبھی اس کو تین تین گھنٹے اسی کونے میں کھڑا رہنا پڑتا ۔ وہ دیوار کے سہارے کھڑا رہتا اور صرف دو قدم کے فاصلے پر چنگھاڑتے اور اچھلتے ہوئے بپھرے درندے کو گھورتا رہتا جو اس کے پاس پہنچنے کی کوشش میں کبھی اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو جاتا اور کبھی رسی تڑانے کی کوشش کرتا ۔ جی، یہ اس روسی نواب کی شاندار تفریح تھی ۔ اتالیق کے آنے کے چند دن بعد، ترویئےکوروف کو اس کے وجود کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ اسے بھالو کے کمرے کا مزا چکھایا جائے ۔ اس غرض سے اس نے ایک صبح اتالیق کو بلوا بھیجا اور ایک اندھیرے گلیارے میں لے گیا ۔ یہاں تک کہ ایک طرف اچانک ایک دروازہ کھلا اور دو ملازموں نے اس فرانسیسی نوجوان کو اس میں ڈھکیل دیا اور اس کو باھر سے بند کر دیا ۔ جب اس کے حواس ٹھکانے ہوئے تو اس نے دیکھا کہ ایک بندھے ہوئے بھالو سے اس کا آمنا سامنا ہے جو دور سے ہی اپنے اس

سہمان کو دیکھ کر نتھنے پھلا رہا تھا اور کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا، دفعتاً اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر وہ اس کی طرف لپکا... فرانسیسی ذرا بھی پریشان نہ ہوا اور پیچھے نہ ہٹا اور حملے کا انتظار کرنے لگا۔ بھالو قریب آیا، دیفورژ نے ایک چھوٹا سا پستول اپنی جیب سے نکالا، اس کی نال بھوکے درندے کے کان پر رکھی اور گھوڑا دبا دیا۔ بھالو ڈھیر ہو گیا۔ ہر شخص دوڑا ہوا آیا۔ دروازہ کھول دیا گیا اور کیریلا پترووچ داخل ہوا اور اپنے لطف و مذاق کا یہ انجام دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

کیریلا پترووچ نے اس معاملے کی پوری جانچ پڑتال شروع کی کہ دیفورژ کو کس نے پہلے سے خبردار کر دیا کہ اس کے ساتھ یہ مذاق ہونےوالا ہے اور اس کی جیب میں بھرا ہوا پستول کیوں رکھا تھا؟ اس نے ماشا کو بلوایا۔ ماشا فوراً جائے وقوع پر پہنچی اور کیریلا پترووچ کی باتوں کا ترجمہ کرکے فرانسیسی کو سنایا۔

''میں نے بھالو کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا،، دیفورژ نے جواب دیا۔ ''لیکن میں ہمیشہ اپنے پاس پستول رکھتا ہوں کیوں کہ میں کسی قسم کی توھین برداشت کرنا نہیں چاھتا جسکے لئے میں اپنے پیشے کے مطابق دوسری طرح تسکین پانے کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔،،

ماشانے حیران نظروں سے اسے گھور کر دیکھا اور اس کے الفاظ کا ترجمہ کرکے اپنے باپ کو سنایا۔ کیریلا پترووچ نے کوئی جواب نہ دیا اور حکم دیا کہ بھالو کو ھٹا دیا جائے اور اس کی کھال اتار لی جائے۔ پھر اس نے اپنے گھر کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ھے نا یہ خوب آدمی؟ یہ کوئی بزدل نہیں، میں قسم کھا سکتا ھوں!،،

اس لمحے سے اس نے فرانسیسی کو پسند کرنا شروع کر دیا اور پھر دوبارہ اسے آزمائش میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

اس واقعے کا جتنا زوردار اثر ماریا کیریلوونا پر پڑا اور کسی پر نہیں پڑا۔ دیفورژ کا تصور اس کے دماغ پر

چھا کر رہ گیا۔ جو مردہ بھالو کے پاس کھڑا، اطمینان اور سکون سے بات کر رہا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ، جرأت، وقار اور خودداری صرف ایک طبقے کا اجارہ نہیں۔ اور اس دن سے اس نے اس نوجوان اتالیق سے عزت اور احترام کے ساتھ پیش آنا شروع کر دیا اور روز بروز یہ رویہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ ان کے درمیان باضابطہ میل جول ہو گیا۔ ماشا کی آواز بہت سریلی اور دل کش تھی اور اس میں موسیقی کی زبردست صلاحیتیں تھیں۔ دیفورژ نے اس کو موسیقی سکھانے کی پیش کش کی۔ اب یہ تاڑ لینے میں کوئی دقت نہ ہوگی کہ ماشا اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی لیکن اب تک اس کو خود اس کا احساس نہ تھا۔

دوسری جلد

نواں باب

تہوار سے ایک دن پہلے مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ کچھ تو اسی بڑے مکان میں ٹھہرائے گئے اور کچھ بازووالے گھروں میں۔ باقی لوگوں کو کارندے اور پادری کے گھر میں ٹھہرایا گیا اور جو بچے ان کو کھاتے پیتے کاشتکاروں کے یہاں۔ اصطبلوں میں گاڑیوں کے گھوڑے بھرے ہوئے تھے، اور احاطے اور چھپروں میں قسم قسم کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ نو بجے صبح کی عبادت کا گھنٹہ بجا اور سبھوں نے نئے پختہ گرجا کا رخ کیا جو کیریلا پتروو‌چ نے بنوایا تھا اور ہر سال اس کو سجانے کے لئے تحفے تحائف اور عطئے دیا کرتا تھا۔ ممتاز قسم کے عبادت گزاروں کی ایسی بھرمار تھی کہ بیچارے سادہ لوح کسانوں کے لئے گرجا میں جگہ ملنی مشکل ہو گئی۔ اور وہ برساتی

اور صحن میں کھڑے ہو گئے۔ عبادت ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ کیریلا پترووچ کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ چھ گھوڑوں‌والی گاڑی میں آیا، بڑی شان سے اپنی جگہ پر پہنچا۔ اس کے ساتھ ماریا کیریلوونا تھی۔ تمام لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ مرد تو اس کے حسن کی داد دے رہے تھے اور عورتیں اس کے لباس کے پیچ وخم پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ عبادت شروع ہوئی، خود کیریلا پیترووچ کے بھجن گانےوالوں نے اپنی اپنی مخصوص جگہ کھڑے ہوکر نغمہ چھیڑا، خود کیریلا پترووچ نے دھیمی آواز میں سر میں سر ملایا۔ وہ نہ تو دائیں دیکھ رہا تھا نہ بائیں اور جب پادری نے ''ہمارے گرجا کے بانی،، کا ذکر کیا تو اس نے ایک خودپرستانہ انکسار کے ساتھ سر جھکایا۔

عبادت ختم ہوئی۔ سب سے پہلے کیریلا پترووچ صلیب کے پاس گیا۔ سب اس کے پیچھے پیچھے آگے بڑھے اور تب پڑوس کے لوگ اس کے پاس سلام ونیاز کے لئے آئے۔ خواتین نے ماشا کو گھیر لیا۔ کیریلا پترووچ نے گرجا سے باہر جاتے ہوئے پوری محفل کو اپنے یہاں ضیافت میں شریک ہونے کی دعوت دی، گاڑی میں سوار ہوا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے مہمان اپنی اپنی گاڑیوں میں اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ کمرے مہمانوں سے کھچا کھچ بھر گئے۔ نئے نئے مہمانوں کا تار بندھا ہوا تھا اور وہ مشکل سے کھسکتے ہوئے میزبان تک پہنچ سکتے تھے۔ خواتین ایک دائرہ سا بنائے بڑے پرتکلف انداز میں بیٹھی تھیں۔ وہ دقیانوسی قسم کے زرق برق مگر پرانے لباسوں میں تھیں۔ سب کے جسموں پر ہیرے جواہرات کی نمائش ہو رہی تھی۔ مہمانوں نے مچھلی کے انڈوں اور وودکا پر ہلہ بول دیا تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر آپس میں بحث کر رہے تھے۔ بڑے کمرے میں ۸۰ آدمیوں کے لئے میز بچھائی گئی تھی۔ نوکر ہماھمی کے ساتھ بھاگتے پھر رہے تھے اور میز پر بوتلیں اور جام رکھ رہے تھے اور میزپوش کی شکنیں مٹا رہے تھے۔ آخرکار بٹلر نے اعلان کیا: ''کھانا تیار ہے،،۔ کیریلا پترووچ سب سے پہلے

اپنی جگہ پر بیٹھا، اس کے بعد خواتین اپنی جگہوں پر عمر کے لحاظ سے جلوہ افروز ہوئیں۔ جوان خواتین ہرنوں کے ایک غول کی طرح اکٹھی ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئیں۔ ان کے سامنے مرد بیٹھے اور میز کے آخری کنارے پر اتالیق اور ساشا۔

خدمتگار مہمانوں کے عہدے اور مرتبے کے اعتبار سے ان کی خاطر تواضع کر رہے تھے۔ اگر کسی آدمی کے مرتبے کے بارے میں معاملہ کچھ گڈمڈ سا ہو تو اس صورت میں وہ لافاتر کے قیافہ‌شناس پر عمل کرتے تھے اور عام طور پر یہ اندازہ ٹھیک ہی ہوتا تھا۔ پلیٹوں اور چمچوں کی کھنک مہمانوں کی بات چیت کی آواز میں مدغم ہو رہی تھی۔ کیریلا پترووچ نے آسودہ خاطری کے ساتھ نظر میز پر ڈالی اور مہمان‌نوازی سے پوری طرح لطف‌اندوز ہوا... اور ٹھیک اس وقت چھ گھوڑوں والی ایک گاڑی ڈیوڑھی کے سامنے آ کر رکی۔

''کون ہے؟،، میزبان نے پوچھا۔

''انتون پافنوتچ!،، بہت سی آوازوں نے ایک ساتھ کہا۔

دروازہ کھلا اور انتون پافنوتچ اندر داخل ہوا، وہ ہٹے کٹے بدن کا کوئی پچاس سالہ آدمی تھا، اس کا چہرہ گول اور چیچک دہ تھا۔ اس کی ٹھوڑی میں تین بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے دعوت کے کمرے میں گھستے ہی مسکراتے ہوئے جھکنا اور معذرت کرنا شروع کر دیا۔

''ایک پلیٹ یہاں لگاؤ!،، کیریلا پترووچ نے آواز دی۔ انتون پافنوتچ مہربانی کرکے بیٹھو اور بتاؤ کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے کہ تم ہمارے گرجے کی عبادت میں شامل نہیں ہوئے اور کھانے میں شریک ہونے میں اتنی دیر کر دی۔ یہ ڈھنگ کچھ ایسے شخص کے تو ہونے سے رہے جو اتنا پاکباز اور کھانے کا اتنا شوقین ہو۔،،

''معافی کی التجا کرتا ہوں،، انتون پافنوتچ نے اپنے شوخ سبز رنگ کے لبادے کے کاج میں کھانے کے رومال کا کونا ٹھونستے ہوئے جواب دیا۔ ''کیریلا پترووچ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں وقت سے روانہ ہوا تھا۔

مشکل سے کوئی دس ورسٹ* کا فاصلہ طے ہوا ہوگا کہ سامنے کے پہئے کا ٹائر پھٹ گیا۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک گاؤں تھا۔ لیکن جتنی دیر میں میرا آدمی گاؤں پہنچا، اور وہاں اس نے لوہار کو تلاش کیا اور پھر پہئے کو ٹھیک ٹھاک کیا، پورے تین گھنٹے بیت گئے۔ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اور کستےنیوکا کے جنگلوں والے چھوٹے راستے سے آنے کی میری ہمت نہیں تھی۔ اس لئے پورا چکر کاٹنا پڑا...،،

''اوھو!،، کیریلا پترووچ نے بات کاٹی۔ ''اچھا میں دیکھتا ہوں کہ تم بہادر نہیں ہو! تمہیں ڈر کاھیکا ہے؟،،

''کاھیکا، کیریلا پترووچ؟ دوبرووسکی کا، ظاہر ہے! اس سے پہلے کہ کچھ اتہ پتہ چلے کہ تم کہاں ہو وہ آدبوچتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے وہ کیسا آدمی ہے، وہ کسی مسافر کو نہیں چھوڑتا اور خاص طور پر مجھے تو اور بھی ستائیگا۔،،

''بھائی میرے تمہارے ساتھ یہ خصوصیت کیوں؟،،

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں، کیریلا پترووچ، کیوں۔ اندری گاوریلووچ کے خلاف مقدمے کی وجہ سے اور کیوں! کیا میں نے آپ کو خوش کرنے کے لئے، میرا مطلب ہے، کیا اپنے ضمیر اور انصاف کے تقاضے سے مجبور ہوکر یہ گواہی نہیں دی تھی کہ دوبرووسکی کستےنیوکا پر ناجائز قبضہ جمائے ہوئے تھا اور آپ نے محض رحم و کرم کی بنا پر یہ قبضہ دے رکھا تھا۔ مرحوم نے (خدا مغفرت کرے!) قسم کھائی تھی کہ وہ مجھ سے اس کی کسر نکالیگا اور بلا شبہہ بیٹا اپنے باپ کا عہد ضرور پورا کریگا۔ اب تک تو اللہ نے بچائے رکھا ہے۔ اب تک انہوں نے میرے ایک ہی کھلیان کا ستیاناس کیا ہے۔ لیکن ایک نہ ایک دن وہ گھر پر دھاوا ضرور بولینگے۔ دیکھ لینا ہاں!،،

---

* ورسٹ — فاصلے کا پرانا روسی پیمانہ جو تقریباً دو تہائی میل کے برابر تھا۔ (ایڈیٹر)

''اور گھر میں کچھ لوٹنے کےلئے ہے بھی یا نہیں،،
کیریلا پترووچ بولا - ''میں قسم کھاکے کہہ سکتا ہوں تمہاری تجوری ٹھساٹھس بھری ہوئی ہے...،،

''اب نہیں کیریلا پترووچ! کبھی بھری ہوتی تھی لیکن اب بالکل خالی ہے۔،،

''یہ سب نہیں چلیگا انتون پافنوتچ! ہم سب تم کو جانتے ہیں - تم اتنا روپیہ کیا کروگے؟ تم سور کی طرح رہتے ہو، کبھی مہمان نہیں بلاتے، اپنے کسانوں کا خون چوس چوس کر ان کو ادھ‌موا کر دیتے ہو اور روپیہ بچانے کے سوا اور کچھ نہیں سوچتے -،،

''تم مذاق کر لو کیریلا پترووچ،، انتون پافنوتچ زبردستی مسکراتے ہوئے بڑبڑایا - ''لیکن ہم تو لٹ گئے، بس، ہمارے پاس اور کچھ نہیں -،، اور انتون پافنوتچ اپنے میزبان کی پھبتی کو بھر منہ مچھلی کے ساتھ نگل گیا۔

کیریلا پترووچ نے اس کی جان بخشی اور اب نزلہ ضلع کے تھانیدار کی طرف رجوع ہوا - وہ اس سے پہلے اس کے گھر کبھی مہمان نہیں ہوا تھا اور میز کے آخر میں اتالیق کے پاس بیٹھا تھا -

''اور اب جناب تھانیدار صاحب آپ تو دوبرووسکی کو پکڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں نا؟،،

تھانیدار نے خوشامدانہ چہرہ بنایا، جھکا، مسکرایا اور آخرکار ہکلاتے ہوئے بولا:

''ہم کوشش کرینگے، حضور عالی -،،

''ہوں - تم کوشش کروگے - ہر شخص ایک زمانے سے کوشش کر رہا ہے لیکن اب تک اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اور آخر تم اسے پکڑو بھی کیوں؟ دوبرووسکی کی ڈکیتیاں تو سونے کا خزانہ ہیں پولس کے لئے: سیرسپاٹا، جانچ پڑتال، مفت کے گھوڑے سارا روپیہ تمہاری جیب میں جاتا ہے - آخر تم اپنے سرپرست کو کیوں برباد کرو؟ یہ ٹھیک ہے، ہے نا تھانیدار؟،،

''بالکل ٹھیک، حضور عالی!،، تھانیدار نے بالکل بوکھلاکر جواب دیا -

مہمانوں کا قہقہہ پھٹ پڑا۔

''میں اس آدمی کی ایمانداری کو پسند کرتا ہوں،، کیریلا پترووچ نے کہا۔ ''پھر بھی، افسوس ہم مرحوم تاراس الکسئےوچ کو کھو بیٹھے ــ اگر وہ لوگ اسے زندہ جلا نہ دیتے تو صوبے میں زیادہ امن چین ہوتا۔ دوبرووسکی کی تازہ‌ترین خبریں کیا ہیں؟ آخری بار وہ کہاں دیکھا گیا ہے؟،،

''میرے گھر میں کیریلا پترووچ۔ پچھلے منگل کو اس نے میرے ساتھ کھانا کھایا،، ایک عورت کی تیز آواز سنائی دی۔

ساری آنکھیں اننا ساویشنا گلوبووا کی طرف پھر گئیں جو ایک سادہ مزاج بیوہ تھی۔ اس کی نرم دلی اور خوش مزاجی کی وجہ سے سب لوگ اسے بہت چاہتے تھے۔ سب متجسس نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں کیا کہتی ہے:

''معلوم ہونا چاہئے کہ کوئی تین ہفتے ہوئے میں نے اپنے کارندے کو اپنے وانیوشا کے لئے روپیہ لےکر ڈاک کی چوکی بھیجا۔ میں اپنے بیٹے کو لاڈ پیار میں بگاڑتی نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر میں چاہوں بھی تو مجھ میں سکت ہے ہی نہیں۔ لیکن تم جانو ــ گارد دستے کے افسر کو ذرا ٹھاٹ باٹ سے رہنا پڑتا ہے اور مجھ سے جہاں تک بن پڑتا ہے اپنی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ وانیوشا کو بھیجتی ہوں۔ خیر، میں اس کو دو ہزار روبل بھجوا رہی تھی اور اگرچہ رہ رہ کر مجھے دوبرووسکی کا اندیشہ ہوا، میں نے سوچا کہ شہر قریب ہے صرف سات ورسٹ کی دوری پر، شائد خدا مجھ پر اپنا رحم کرے۔ لیکن شام کے وقت جو میرا کارندہ لوٹا تو رنگ فق، کپڑے دھجی دھجی اور پیدل۔ میں دم بخود رہ گئی۔ میں نے پوچھا 'قصہ کیا ہے؟ تمہیں کیا ہوا؟'، اور اس نے کہا 'مجھے ان بدمعاشوں نے لوٹ لیا اننا ساویشنا۔ وہ تو مجھے مار ہی ڈالتے۔ دوبرووسکی خود ان کے ساتھ تھا اور وہ تو مجھے پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیتے۔

لیکن خود دوبرووسکی کو مجھ پر رحم آگیا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن انہوں نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا اور گھوڑا اور گاڑی بھی لے گئے۔، میں کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ اللہ رحم کرے! اب میرا وانیوشا کیا کریگا؟ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے لڑکے کو خط لکھوں اور سارا ماجرا کہہ سناؤں اور خالی خولی دعائیں بھیج دوں اور بس۔

''ایک ہفتہ گزر گیا، دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا۔ ایک دن کیا دیکھتی ہوں کہ ایک گاڑی میرے دروازے کے سامنے آکر رکی۔ کوئی فوجی جنرل مجھ سے ملنا چاھتا ھے۔ 'خوشی سے!'، میں نے کہا۔ کوئی پینتیس برس کا ایک آدمی اندر آیا، سانولا، کالے بال، چہرے پر داڑھی اور مونچھیں، ھوبھو کولنیف کا حلیہ۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ میرے مرحوم شوھر کا دوست اور رفیق‌کار تھا۔ وہ اس طرف سے گزر رھا تھا اور اسے خیال آیا کہ اپنے دوست کی بیوہ سے ضرور ملنا چاھئے۔ اسے معلوم تھا کہ میں یہیں رھتی ھوں۔ جو کچھ بھی اس وقت گھر میں کھانے پینے کو تھا، میں نے اس کے سامنے رکھ دیا، اور ھم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رھے یہاں تک کہ ھماری گفتگو کا رخ دوبرووسکی کی طرف مڑ گیا اور میں اپنا دکھڑا روئی۔ میرے جنرل کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ 'تعجب ھے'، وہ بولا۔ 'میں نے سنا ھے کہ دوبرووسکی ھر کس و ناکس پر حملہ نہیں کرتا بلکہ اس کا نشانہ تو گنے چنے امیر لوگ بنتے ھیں۔ اور وہ تو ان کو بھی بالکل کھنگال کر نہیں رکھ دیتا۔ صرف اپنا حصہ لیتا ھے اور باقی ان کے پاس چھوڑ دیتا ھے۔ اور کوئی بھی اس پر قتل کا جرم نہیں عائد کرتا۔ ضرور دال میں کالا ھے۔ براہ کرم اپنے کارندے کو تو بلوائیے۔ میں نے کارندے کو بلوایا اور وہ حاضر ھو گیا۔ جس آن اس کی نظر جنرل پر پڑی اس کی سٹی گم ھو گئی۔ 'بھائی میرے، ذرا بتانا مجھے، دوبرووسکی نے تم کو کس طرح لوٹا اور کس طرح اس نے تم کو قتل کرنے کی کوشش

کی۔، میرا کارندہ تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ اس کے پاؤں پر گر گیا۔ 'مالک مجھے معاف کر دو۔ شیطان نے مجھے بہکایا، میں لالچ میں آگیا، — میں جھوٹ بولا۔، جنرل نے جواب دیا 'تو اس صورت مین تم کو اصلی واقعہ کیسے پیش آیا اس کا سارا ماجرا سناؤ اور میں سنونگا۔، میرے کارندے کے اڑے ہوش ٹھکانے نہ آئے۔ 'چلو، جنرل نے کہا 'بتاؤ دوبرووسکی سے تمھاری مڈبھیڑ کہاں ہوئی؟، — 'مالک وھاں جہاں صنوبر کے دو پیڑ ھیں، — 'اور اس نے تم سے کیا کہا؟، — 'اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس کا ملازم ھوں، کہاں اور کس کام کے لئے جا رھا ھوں، ۔ اچھا اور پھر؟، ۔ 'تب اس نے خط اور روپیہ مانگا، اچھا پھر؟، ۔ 'میں نے اس کو خط اور روپیہ دے دیا، — 'اور اس نے کیا کیا؟ اس نے کیا کہا؟، — 'معاف کر دو مالک!، ۔ 'ھاں اس نے کیا کہا؟، 'اس نے مجھے خط اور روپیہ واپس دے دیا اور کہا کہ اپنا راستہ لو۔ اسے ڈاک کی چوکی پر لے جاؤ!، ۔ 'اور تم نے کیا کیا؟، 'مجھے معاف کر دو مالک!، 'میں تمھاری خبر لونگا، جنرل نے سختی سے کہا 'اور آپ مادام اس کے بکس کی تلاشی لیں اور اس کو میرے حوالے کر دیں۔ میں اس کو ذرا سبق پڑھاؤنگا۔ جانتی ھیں آپ، کبھی دوبرووسکی خود گارڈ دستے کا افسر تھا۔ وہ اپنے ایک ساتھی کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔، میں بھانپ گئی کہ حضور عالی کون ھیں اور ان سے بحث کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ کوچبان نے کارندے کو اپنے پاس باندھ کر بٹھا لیا اور روپیہ مل گیا۔ جنرل رک گیا اور اس نے میرے ساتھ کھانا کھایا، اس کے بعد فوراً ھی کارندے کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ دوسرے دن جنگل میں میرا کارندہ شاہ بلوط کے درخت سے بندھا ھوا ملا۔ اسے پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیا گیا تھا۔،،

سب نے ھمہ‌تن گوش ھوکر اننا ساویشنا کا قصہ سنا، خاص طور پر جوان لڑکیوں نے۔ دل ھی دل میں ان میں سے بہتوں کو دوبرووسکی سے ھمدردی ھو گئی

تھی اور وہ اسے ایک رومانی ہیرو سمجھ رہی تھیں۔ خاص طور پر ماریا کیریلوونا، جو دن دوپہر خواب دیکھنے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی اور جو مادام راڈکلف کے پراسرار اور دہشت انگیز قصے کہانیوں کی فضا میں پروان چڑھی تھی۔

''اور تم یہ سمجھتی ہو انا ساویشنا کہ دوبرووسکی خود تمہارے گھر آیا تھا؟،، کیریلا پتروویچ نے کہا۔ ''تمہیں بڑی غلط فہمی ہوئی۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارا مہمان کون تھا، دوبرووسکی تو وہ ہرگز نہیں تھا۔،،

''دوبرووسکی نہیں تھا، جناب؟ دوبرووسکی نہیں تو اور کون سڑکوں پر اپنی گاڑی ہانکتا دوڑاتا پھرتا ہے اور مسافروں کو روک کر ان کی تلاشی لیتا ہے؟،،

''یہ میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن یہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دوبرووسکی نہیں تھا۔ مجھے وہ ایک بچے کی حیثیت سے یاد ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اس کے بال کالے ہو گئے ہونگے، مگر اس کا رنگ کھلتا ہوا سنہرا تھا اور اس کے بال گھنگھریالے تھے۔ لیکن ایک اور بات جو میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ ہے کہ وہ میری ماشا سے پانچ برس بڑا تھا اور اس وقت اس کی عمر پینتیس برس نہیں بلکہ تئیس برس ہونی چاہئے۔،،

''بالکل درست، حضور عالی،، تھانیدار نے کہا۔ ''میری جیب میں دوبرووسکی کی خصوصیات کی ایک فہرست موجود ہے اور اس کی عمر ٹھیک تئیس برس لکھی ہوئی ہے۔،،

''اخاہ!،، کیریلا پتروویچ چلایا ''تو پھر ہمیں پڑھ کے سناؤ، ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ وہ کس قسم کا جانور ہے،— ہو سکتا ہے کبھی ہمارا اس سے سابقہ پڑ جائے، تو پھر خدا نے چاہا تو بچ کے نہیں نکل سکے گا۔،،

تھانیدار نے اپنی جیب سے کچھ میلا کچیلا سا کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ اس نے اس کو بڑی شان سے کھولا اور گنگناتی ہوئی سی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

دوبرووسکی کے سابقہ ملازموں کی شہادت کے مطابق دوبرووسکی کے حلیے اور وضع قطع کی تفصیل:

''عمرتئیس برس، میانہ قد، مونچھ داڑھی صاف، آنکھیں بھوری، بال سنہرے، ناک سیدھی۔ خاص نشانی: کسی نے کوئی خاص نشانی نہیں بتائی۔''

''بس؟'' کیریلا پترووچ نے پوچھا۔

''بس'' تھانیدار نے کاغذ کو دوبارہ موڑتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں، تھانیدار! تمہارے پاس تو ایک قیمتی دستاویز ہے! ہاں ان نشانیوں سے تو ہمیں دوبرووسکی کا پتہ لگانے میں بڑی سہولت ہوگی۔ ہم میں سے کون میانے قد کا نہیں ہے، کس کے بال سنہرے نہیں ہیں، کس کی ناک سیدھی اور آنکھیں بھوری نہیں؟ میں بازی لگاکر کہتا ہوں کہ تم تین گھنٹے تک دوبرووسکی سے بات کرتے رہوگے اور کیا مجال کہ تمہیں ذرا شبہہ بھی ہوکہ تمہارا واسطہ کس سے پڑا ہے۔ بڑے عالی دماغ ہیں یہ کلرک، کیا کہنے!''

تھانیدار نے چپکے سے یہ دستاویز اپنی جیب میں واپس رکھی اور خاموشی سے مرغابی کے بھنے ہوئے گوشت اور گوبھی پر ٹوٹ پڑا۔ اس اثنا میں ملازموں نے لوگوں کے سامنے قسم قسم کے کھانے لاکر رکھے اور ہر مہمان کا جام بھر دیا۔ بڑی طمطراق سے قفقازی شراب کے کاگ اڑے اور لوگوں نے اس کو شمپین کے نام سے شکر و ممنونیت کے ساتھ قبول کیا۔ لوگوں کے رخسار دھکنے لگے اور بات چیت زیادہ بلند، زیادہ طرب انگیز اور بےربط ہوتی چلی گئی۔

''اوہ، اچھا'' کیریلا پترووچ نے کہا۔ ''واقعی مرحوم تاراس الکسئےوچ جیسا تھانیدار دوبارہ دیکھنے میں نہ آئیگا! اس سے کبھی چوک نہ ہوتی تھی، اس کا نشانہ خالی نہ جاتا تھا، اس کی نگاہوں سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہ تھی۔ افسوس انہوں نے اس کو زندہ جلا دیا، اتنا بھلا مانس، اگر وہ زندہ ہوتا تو ڈاکوؤں کے گروہ کا ایک آدمی بھی اس کی مٹھی سے بچ کر نہ نکل سکتا۔ دوبرووسکی

خود بھی بچ نہ سکتا تھا اور نہ اس کی مٹھی گرم کرکے اپنی آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ تاراس الکسئیےوچ اپنا روپیہ ضرور وصول کرلیتا اور پھر اسے جانے نہ دیتا۔ مرحوم کا کچھ یہ انداز تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں خود اس معاملے میں قدم اٹھاؤں اور اپنے ملازموں کو لے کر بدمعاشوں کا پیچھا کروں۔ میں شروع میں کوئی بیس آدمیوں کو مسلح کرونگا اور وہ جنگل سے لٹیروں کا صفایا کر دینگے۔ ہمارا کوئی آدمی بھی پلپلے دل کا نہیں۔ ان میں سے ہر ایک تن تنہا بھالو سے لڑ سکتا ہے، بدمعاشوں کے گروہ کے سامنے ان کے قدم نہیں اکھڑ سکتے۔،،

''تمہارا بھالو کیسا ہے کیریلا پترووچ؟،، انتون پافنوتچ نے پوچھا جس کو ان الفاظ نے جھبرے دوست کی یاد دلا دی کیونکہ وہ خود بھی اس عملی مذاق کا شکار ہو چکا تھا۔

''بھالو چل بسا،، کیریلا پترووچ نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ اپنے ایک دشمن کے ہاتھوں بہادری کی موت مرا۔ اور اس کا فاتح وہ رہا۔،، کیریلا پترووچ نے دیفورژ کی طرف اشارہ کیا ''اس نے تمہارا انتقام — اگر اجازت ہو تو — تم کو تو یاد ہوگا، یاد ہے نا؟،،

''میں سمجھتا ہوں کہ مجھے یاد ہے،، انتون پافنوتچ نے اپنے سر کا پچھلا حصہ کھجاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اچھا تو بروئن چل بسا۔ بچارا بھالو، مجھے اس کا افسوس ہے، واقعی مجھے اس کے مرنے کا افسوس ہے! کتنا دلچسپ تھا وہ! اور کتنا چالاک! اس کا جیسا دوسرا بھالو نہیں مل سکیگا۔ موسیو نے اس کو مار کیوں ڈالا؟،،

کیریلا پترووچ نے بڑی شان سے اپنے فرانسیسی اتالیق کے کارنامے کا قصہ بیان کرنا شروع کیا کیونکہ اس میں اپنے گردوپیش کی ہر چیز کی بڑائی کرنے کی قابل رشک صلاحیت تھی۔ مہمانوں نے دم بخود ہو کر بروئن کی موت کا قصہ سنا اور دیفورژ کو استعجاب بھری نظروں

سے گھورنے لگے، جو اس سے بالکل بے نیاز کہ گفتگو کا رخ خود اس کی بہادری کی طرف مڑ گیا ہے، اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا تھا اور بار بار اپنے تیزو طرار شاگرد کو تنبیہہ کر رہا تھا۔

تین گھنٹے کے بعد کھانے کا سلسلہ ختم ہوا۔ میزبان نے اپنا رومال میز پر رکھ دیا اور سب اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے جہاں کافی، تاش اور شراب کا دور ان کا انتظار کر رہا تھا جس کا اتنا زوردار آغاز کھانے کی میز پر ہو چکا تھا۔

دسواں باب

شام کے سات بجے، کچھ مہمانوں نے چلنے کا ارادہ کیا لیکن میزبان نے، جو مزے میں آ چکا تھا، پھاٹکوں کو بند کر دینے کا حکم دیا اور اعلان کیا کہ کوئی بھی پو پھٹنے سے پہلے اس کے احاطے سے باہر نہ نکلے۔ جلد ھی موسیقی گونجنے لگی اور ناچ کے کمرے کا دروازہ کھل گیا اور ناچ کا دور شروع ھوا۔ میزبان اور اس کے بعض مصاحب کونے میں بیٹھے جام پر جام چڑھاتے اور نوجوانوں کی رنگ رلیوں پر خوش ھوتے رہے۔ ذرا بڑی عمر کی عورتوں نے تاش کا دور چلایا۔ ایسی تمام جگہوں کی طرح جہاں نیزہ بردار سواروں یا کسی اور فوجی دستے کا پڑاؤ نہ ھو، مردوں کی تعداد عورتوں سے کم تھی، حالانکہ تمام موزوں مرد یہاں جمع کر لئے گئے تھے۔ اتالیق ان میں سب سے نمایاں تھا اور سب سے زیادہ ناچ رہا تھا۔ ساری لڑکیاں اپنے ساتھ ناچنے کے لئے اس کو چن رھی تھیں اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت اچھی طرح اس کے ساتھ والز کی دھن پر ناچ

سکتی ہیں۔ ماریا کیریلوونا اور اس نے کمرے کے کئی چکر لگائے اور دوسری جوان خواتین کی طنزیہ نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہیں۔ آخر کار، آدھی رات کو، تھکے ہوئے میزبان نے ناچ بند کرنے اور رات کے کھانے کا حکم دیا اور خود سونے کے لئے چلا گیا۔

اس کی عدم موجودگی نے محفل میں زیادہ آزادی اور جان پیدا کر دی۔ اب لوگوں کو عورتوں کے پہلو میں بیٹھنے کی جرأت ہوئی۔ لڑکیوں نے ہنسنا اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ذرا بڑی عمر کی عورتوں نے میز کے ادھر ادھر بیٹھ کر زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ مرد پی رہے تھے، بحث کر رہے تھے اور قہقہے مار رہے تھے۔ مختصر یہ کہ رات کے کھانے کا پروگرام انتہائی طرب انگیز رہا اور بہت سی پرلطف یادیں چھوڑیں۔

صرف ایک آدمی نے لطف ومسرت کی اس پوری محفل میں حصہ نہیں لیا۔ انتون پافنوتچ کچھ جھنجھلایا جھنجھلایا خاموش بیٹھا تھا۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا کھاتا رہا اور بری طرح بےچینی میں مبتلا رہا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں اس پوری گفتگو نے اس کے دل کا سکون چھین لیا تھا اور ہمیں جلد ہی معلوم ہو جائیگا کہ اس کی معقول وجہ تھی۔

جب انتون پافنوتچ نے خدا کو حاضروناظر جان کر یہ کہا تھا کہ اس کی تجوری خالی پڑی ہے تو اس نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ چھوٹی سی تجوری واقعی خالی تھی۔ اور وہ روپیہ جو کسی زمانے میں اس کے اندر رکھا جاتا تھا، اب وہاں سے نکال کر چمڑے کی تھیلی میں رکھ دیا گیا تھا اور وہ تھیلی قمیص کے نیچے اس کے سینے پر بندھی ہوئی تھی۔ صرف اسی ایک طریقے سے وہ اپنے تمام شک و شبہہ اور ڈر پر قابو پا سکتا تھا۔ ایک اجنبی گھر میں رات بسر کرنے پر مجبور ہونے کے بعد اسے ڈر ہوا کہ شائد اسے دور کا کوئی کٹا ہوا کمرہ دے دیا جائے جہاں ڈاکو آسانی سے گھس سکتے

ہیں - اس لئے اس نے ایک قابل اعتماد ساتھی کی تلاش شروع کی اور آخر اس کی نظر انتخاب دیفورژ پر پڑی - اس کا طاقتور بدن اور اس سے زیادہ بھالو کے سامنے اس کے بہادری کے مظاہرے نے، (بھالو کے بارے میں سوچ کر تو اس بدنصیب کے سارے جسم میں کپکپی دوڑ جاتی تھی) اس کی نظر انتخاب کو اور بھی تقویت بخشی - جب مہمان میز سے اٹھے تو انتون پافنوتچ نوجوان فرانسیسی کے گرد منڈلانے لگا - کبھی اپنا گلا صاف کرتا اور کبھی اس کی طرف لپکتا - اور آخرکار اس نے ان الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا -

''ہوں موسیو، کیوں نہ یہ رات تمہارے کمرے میں بسر کر لوں؟ تم جانو...،،

''Que dèsire, monsieur*،، دیفورژ نے بڑی خوش اخلاقی سے جھکتے ہوئے پوچھا -

''اوہ موسیو — یہ بہت بری بات ہے کہ تم نے اب تک روسی نہیں سیکھی ہے! .. "Fe veux, moi, cher vous coucher, comprenny voo?" **

"Monsieur, tres volontiers" *** دیفورژ نے جواب دیا -

"Veuillez donner des ordres en consèquence." ****

انتون پافنوتچ اپنی فرانسیسی دانی پر نازاں فوراً حکم صادر کرنے کے لئے چلا گیا -

مہمان ایک دوسرے کو شب بخیر کہہ رہے تھے اور اپنے اپنے مقررہ کمروں میں جا رہے تھے - انتون پافنوتچ فرانسیسی کے ساتھ اس بازو میں گیا جس میں اس کا کمرہ تھا - رات اندھیری تھی - دیفورژ لالٹین کی روشنی کی مدد سے راستہ دکھا رہا تھا اور انتون پافنوتچ بہت

---

* کہئے کیا چاہتے ہیں آپ؟

** میں چاہتا ہوں، میں تمہارے پاس سونا؟

*** بڑی خوشی سے -

**** مہربانی سے حکم دیجئے -

خوش خوش اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ ہر تھوڑی تھوڑی دیر میں اپنی تھیلی کو سینے پر دبا کر دیکھ لیتا تھا اور دل کو ڈھارس بندھا لیتا تھا کہ روپیہ اب تک محفوظ ہے۔

کمرے میں آکر اتالیق نے ایک موم بتی روشن کی اور دونوں کپڑے بدلنے لگے۔ اپنے کپڑے اتارنے کے دوران، انتون پافنوتچ کمرے میں گھوم گھوم کر قلابوں اور کھڑکیوں کا معائنہ کرتا رہا اور سر دھنتا رہا کیونکہ اس کی جانچ پڑتال کا نتیجہ بہت اطمینان بخش نہ تھا۔ دروازے میں صرف ایک قلابہ تھا اور کھڑکی کی جاڑے والی دوھری چوکھٹ اب تک لگی نہ تھی۔ اس نے دیفورژ سے اس کی شکائت کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا فرانسیسی کا علم اتنی پیچیدہ بات کہنے سے عاجز تھا۔ فرانسیسی اس کی بات نہ سمجھا اور انتون پافنوتچ کو اپنی بڑبڑاھٹ بند کرنی پڑی۔ ان کے بستر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور جب وہ دونوں بستر میں دراز ہو گئے تو اتالیق نے موم بتی بجھا دی۔

* ”Pourquoi vous بجھے pourquoi?“ انتون پافنوتچ ”بجھانے“ کے لئے روسی لفظ کو، اپنے بس بھر بڑی خوبصورتی سے فرانسیسی زبان میں کھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اندھیرے میں سو نہیں سکتا۔“

دیفورژ اس کی شکائت اور احتجاج کو بالکل نہ سمجھا اور شب بخیر کہہ کر کروٹ لے لی۔

”کمبخت بدیسی“ انتون پافنوتچ اپنے شانوں پر کمبل کو لپیٹتے ہوئے غرایا۔ ”آخر اس کو موم بتی گل کرنے کی کیا پڑی تھی؟ اب تو اسے بھگتنا پڑیگا۔ موسیو! موسیو! میں بغیر روشنی کے سو نہیں سکتا...“ ”Je veux avec vous parler.“ ** وہ بکتا رہا۔

---

* بھئی موم بتی کیوں بجھا دی؟

** میں تم سے بات کرنا چاھتا ھوں۔

لیکن فرانسیسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور جلد ھی خراٹے لینے لگا۔

''وحشی فرانسیسی، خراٹے لینے لگا مزے سے'' انتون پافنوتچ نے سوچا۔ ''اور میں پلک بھی نہیں جھپکا سکتا۔ کسی لمحے بھی چور کھلے دروازے سے اندر آ سکتے ھیں یا کھڑکی میں کود سکتے ھیں اور بندوق بھی داغی جائے تو یہ جانور جاگنے والے نہیں۔''

''موسیو! موسیو! خدا سمجھے تجھ سے!''

انتون پافنوتچ خاموش ھو گیا۔ تھکن اور شراب کا نشہ رفتہ رفتہ اس کے خوف پر غالب آگیا، وہ اونگھنے لگا اور جلد ھی بےخبر سو گیا۔

لیکن اسے تو ایک عجیب و غریب انداز سے اٹھنا تھا۔ نیند میں اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے کالر کو بڑی نرمی سے کھینچ رھا ھے۔ انتون پافنوتچ نے آنکھیں کھولیں اور خزاں کی صبح کی پھیکی روشنی میں اس کو دیفورژ سامنے کھڑا نظر آیا۔ فرانسیسی کے ایک ھاتھ میں جیبی پستول تھا اور دوسرے ھاتھ کی انگلیوں سے وہ اس قیمتی تھیلی کے بند کھول رھا تھا۔ انتون پافنوتچ کے ھوش اڑ گئے۔

"Qu'est-que c'est, Monseer?" * اس نے دھشت سے کانپتی ھوئی آواز میں کہا "Qu'est-que c'est, Monseer?"

''ھش! چپکے پڑے رھو!'' اتالیق نے ٹھیٹھ روسی میں کہا۔ ''اپنا منہ بند رکھو ورنہ صفایا۔ میں ھوں دوبرووسکی۔''

* کیا ھے، کیا ھے، موسیو؟

گیارھواں باب

اب ہم قاری کی اجازت سے، پچھلے واقعات کے پیش نظر کہانی کے ان واقعات پر روشنی ڈالینگے جو ہم اب تک بیان نہیں کر سکے ہیں۔

... گھوڑوں کی چوکی پر، چوکی کے داروغہ کے گھر میں جس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں، کونے میں ایک مسافر بیٹھا تھا جس کی آنکھوں میں سہمے ہوئے صبر و برداشت کی جھلک تھی اور اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جاہ و منصب والا آدمی نہیں ہے یا کوئی پردیسی ہے جو داروغہ کی نظر میں کسی قسم کا حق نہیں رکھتا۔ اس کی ہلکی پھلکی گاڑی صحن میں کھڑی پہئوں میں تیل دئے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس میں ایک چھوٹا سا تھیلا رکھا تھا جو اس کی چغلی کھا رہا تھا کہ اس کے مالک کی جیب بہت ہلکی ہے۔ مسافر نے نہ تو چائے کا مطالبہ کیا اور نہ کافی کا بلکہ بیٹھا ہوا کھڑکی سے باھر دیکھتا اور سیٹی بجاتا رہا اور اس کی اس حرکت پر داروغہ کی بیوی جو پردے کے دوسری طرف بیٹھی تھی، بہت ہی چڑ رہی تھی۔

''خدا نے ہمارے پاس پتہ نہیں کسی سیٹی بجانےوالے کو بھیج دیا ہے،، اس نے زیرلب کہا۔ ''سیٹی بجائے چلا جا رہا ہے، کمبخت بدیسی، ستیاناس ہو اس کا!،،

''اور کیوں نہ بجائے سیٹی بھلا؟،، داروغہ بولا۔ ''اس میں ہرج کیا ہے؟ سیٹی بجاتا ہے بجانے دو!،،

''ہرج؟،، اس کی بیوی نے بگڑ کر جواب دیا۔ ''نہیں جانتے کہ یہ برا شگون ہے؟،،

''برا شگون؟ تمہارا مطلب ہے کہ سیٹی بجا بجا کر روپیہ اڑایا جا سکتا ہے؟ اوہ پاخوسونا، سیٹی بجے یا نہ بجے، ہمارے پاس روپیہ ہے ہی کب!،،

''اس کو چلتا کرو سیدورچ - اس کو تم یہاں کیوں رکھے ہوئے ہو؟ اس کو گھوڑے دو اور جہنم میں جانے دو !''

''وہ انتظار کر سکتا ہے پاخوموونا! اصطبل میں ہمارے پاس صرف تین 'تروئکائیں' ہیں اور چوتھی تروئکا کے گھوڑے آرام کر رہے ہیں - اور کسی وقت بھی شریف اچھے بھلے مسافر آسکتے ہیں - میں ایک فرانسیسی کے لئے اپنی گردن نپوانے کو تیار نہیں ہوں - دیکھو - میں نے کہا تھا نا؟ وہ کوئی فراٹے بھرتا چلا آ رہا ہے - اور کتنا تیز ! مان لو اگر یہ کوئی جنرل ہو تو !''

برساتی میں ایک گاڑی آ کر رکی - ملازم کوچبان کی جگہ سے اترا، گاڑی کا دروازہ کھولا، اور دوسرے ہی لمحہ ایک جوان آدمی فوجی کوٹ میں ملبوس اور سفید ٹوپی سر پر رکھے داروغہ کے پاس آیا اور اس کے پیچھے پیچھے ملازم ایک صندوق اٹھائے ہوئے تھا - اس نے صندوق کو کھڑکی پر رکھ دیا -

''گھوڑے!'' افسر نے تحکمانہ لہجے میں کہا -

''اسی آن!'' داروغہ نے جواب دیا - ''اور حکم نامے حضور !''

''اور کوئی حکم نامہ نہیں - میں... جا رہا ہوں... تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟''

ایک لمحے کو داروغہ بھونچکا رہ گیا پھر فوراً دوڑ کر کوچبانوں سے کہنے گیا کہ جلدی کریں - نوجوان نے کمرے میں چند بار چہل قدمی کرنے کے بعد آڑ کے پیچھے جاکر داروغہ کی بیوی سے آہستہ سے پوچھا کہ دوسرا مسافر کون ہے -

''خدا ہی جانے'' اس بھلی عورت نے جواب دیا - ''کوئی فرانسیسی ہے - وہ پانچ گھنٹے سے گھوڑوں کا انتظار کر رہا ہے اور سیٹیاں بجا رہا ہے - میں اس نگوڑے لعنت کے مارے سے عاجز آ گئی ہوں -''

نوجوان نے مسافر سے فرانسیسی زبان میں بات شروع کی -

"کیا میں پوچھہ سکتا ہوں کہ تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"اگلے شہر کو" فرانسیسی نے جواب دیا۔ "اور وہاں سے مجھے ایک زمیندار کے گھر جانا ہے جس نے مجھے اتالیق کی حیثیت سے مقرر کیا ہے۔ مجھے امید تھی کہ آج ہی میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤنگا لیکن جناب داروغہ نے کچھ اور فیصلہ کیا۔ موسیو افسر، اس ملک میں گھوڑا ملنا بہت مشکل ہے۔"

"مقامی زمینداروں میں سے کس زمیندار کے یہاں تم جا رہے ہو؟" افسر نے پوچھا۔

"موسیو تروئےکوروف کے یہاں۔"

"تروئےکوروف؟ کون تروئےکوروف؟"

"Ma foi, mon officier* ... میں نے اس کے بارے میں بھلی باتیں کم سنی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ، وہ ایک بگڑے دل اور من موجی آدمی ہے اور اپنے ملازموں کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی بھی اس کے پاس زیادہ دنوں تک نہیں ٹکتا۔ ہر شخص اس کے نام سے تھراتا ہے۔ وہ اپنے اتالیق کا بھی کوئی لحاظ خیال نہیں کرتا اور اب تک ان میں سے دو کو تو وہ پیٹ پیٹ کر موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔"

"اور آپ نے ایسے بھوت کے یہاں ملازمت کرنے کا ارادہ کیا ہے!"

"موسیو افسر، میں کیا کروں؟ اس نے اچھی تنخواہ کی پیش کش کی ہے۔ تمام ضروریات زندگی کے علاوہ تین ہزار روبل سالانہ۔ شائد میں دوسروں سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوں۔ میری بوڑھی ماں ہے۔ آدھی تنخواہ تو میں ان کو خرچ کے لئے بھجوا دونگا اور پانچ برس میں ایک خاصی اچھی رقم بچا لونگا — اور یہ آئندہ آزاد

---

* سچ تو یہ ہے جناب عالی۔

زندگی گزارنے کے لئے کافی ہوگا اور پھر الوداع! پھر میں پیرس جاؤنگا اور پیسے کسی دھندے میں لگاؤنگا۔،،

”کیا کوئی آپ کو ترویئےکوروف کے گھر میں جانتا ہے؟،، افسر نے پوچھا۔

”کوئی بھی نہیں،، استاد نے جواب دیا۔ ”اس نے مجھے اپنے ماسکو کے ایک دوست کے ذریعہ بلوایا ہے جس کے باورچی نے جو میرا ہم وطن ہے، مجھے ایک سفارشی خط دیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے استاد بننے کی نہیں بلکہ حلوائی بننے کی تربیت حاصل کی تھی۔ لیکن یہ سن کر کہ آپ کے دیس میں تعلیم و تدریس کا پیشہ بڑا نفع بخش ہے...،،

افسر اپنی سوچ میں ڈوب گیا۔

”سنو،، اس نے فرانسیسی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مان لو کہ تم کو اس ملازمت کا خیال ترک کر دینے اور فوراً پیرس لوٹ جانے کے بدلے دس ہزار روبل نقد پیش کئے جائیں تو؟،،

فرانسیسی نے افسر کو حیران نظروں سے گھور کر دیکھا اور مسکرایا اور اپنا سر ہلایا۔

”گھوڑے تیار ہیں،، چوکی کے داروغہ نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

ملازم نے اس کے الفاظ دھرائے۔

”ایک منٹ رکو،، افسر نے کہا ”ایک منٹ کے لئے کمرے سے باہر جاؤ۔،،

چوکی کا داروغہ اور ملازم باہر نکل گئے۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں،، اس نے فرانسیسی میں کہا۔ ”میں تمہیں دس ہزار دے سکتا ہوں۔ مجھے صرف اس کی ضرورت ہے کہ تم اپنے کاغذ مجھے دے دو اور یہاں سے غائب ہو جاؤ۔،،

یہ کہہ کر اس نے اپنی صندوقچی کھولی اور نوٹوں کی کئی گڈیاں نکالیں۔

فرانسیسی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔

''میری غیر موجودگی... میرے کاغذات،، اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''یہ رہے میرے کاغذات... لیکن آپ مذاق کر رہے ہیں۔ میرے کاغذات آپ کے کس کام کے؟،،

''اس سے تمہیں مطلب نہیں۔ میں صرف پوچھتا ہوں کہ تم حامی بھرتے ہو یا نہیں؟،،

فرانسیسی نے، جس کو اب تک اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا، کاغذات نوجوان افسر کی طرف بڑھا دئے، اور اس کی نظریں ان کاغذات پر دوڑنے لگیں۔

''تمہارا پاسپورٹ... خوب! تعارف کا خط۔ ذرا میں اسے پڑھ لوں۔ پیدائش کا سرٹیفکیٹ — شاندار! لو یہ رہے تمہارے روپے، تم سیدھے واپس جا سکتے ہو خدا حافظ...،،

فرانسیسی بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

افسر پلٹ کر اس کے پاس آیا۔

''ہاں ایک بات کہنا تو میں بھول گیا۔ اپنی عزت کی قسم کھاؤ کہ یہ سب کچھ میرے تمہارے سوا اور کسی کو معلوم نہ ہوگا — اپنی عزت کی قسم۔،،

''اپنی عزت کی قسم،، فرانسیسی نے جواب دیا۔ ''لیکن میرے کاغذات — ان کے بغیر میں کیا کرونگا؟،،

''جب تم قریب ترین شہر میں پہنچو تو اعلان کر دو کہ دوبرووسکی نے تم کو لوٹ لیا۔ تم پر یقین کر لیا جائیگا اور تمہیں ضروری سرٹیفکیٹ دے دئے جائینگے۔ خدا حافظ۔ خدا تمہیں جلد ازجلد پیرس پہنچا دے اور خدا کرے کہ تم اپنی ماں کو بخیر و عافیت پاؤ۔،،

دوبرووسکی کمرے سے باہر نکلا، گاڑی میں سوار ہوا اور گھوڑے اسے سرپٹ لے اڑے۔

چوکی کا داروغہ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا رہا اور جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اپنی بیوی کی طرف مڑا۔

''پاخوموونا جانتی ہو وہ کون تھا؟ وہ دوبرووسکی تھا!،، وہ بولا۔

اس کی بیوی بے‌تحاشا کھڑکی کی طرف دوڑی۔ لیکن بیکار — دوبرووسکی بہت دور نکل چکا تھا۔ وہ پنجے جھاڑ کر میاں کے پیچھے پڑ گئی۔

”کیا تمہیں خدا کا ڈر نہیں رہا سیدورچ؟“ وہ چلائی۔ ”یہ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟ میں کم از کم ایک نظر دوبرووسکی کو دیکھ تو لیتی اور کون جانے وہ کبھی اب ادھر آئیگا بھی یا نہیں! تم بے‌شرم ہو، ہاں واقعی تم بے‌شرم ہو!“

فرانسیسی اس طرح خاموش کھڑا تھا جیسے اس کے پیر جم گئے ہوں۔ افسر سے اس کا معاہدہ، روپیہ، سب اسے خواب معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن نوٹ کی گڈیاں اس کی جیب میں تھیں اور یہ اس لاجواب حادثے کے سچ ہونے کا روشن ثبوت تھیں۔

اس نے یہ طے کیا کہ شہر تک گھوڑے لے جائے۔ کوچبان اطمینان سے گھوڑوں کو ہانکتا رہا اور شہر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔

فرانسیسی نے گھنٹےوالے پھاٹک تک پہنچنے سے پہلے کوچبان سے روکنے کے لئے کہا۔ پھاٹک پر صرف ایک ٹوٹا پھوٹا سا سنتری خانہ تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر پیدل شہر کی طرف چل دیا۔ اور اشاروں میں کوچبان کو سمجھایا کہ وہ بطور بخشش گاڑی اور بکس لے جا سکتا ہے۔ کوچبان اس کی اس دریا دلی پر اسی طرح حیران ہو گیا جس طرح فرانسیسی خود دوبرووسکی کی تجویز پر ہوا تھا۔ اس نے، بہر حال یہ سوچ کر کہ اس پردیسی کا دماغ چل گیا ہے خوب جھک جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اس وقت شہر میں جانے کو نا مناسب تصور کرتے ہوئے ایک چائے خانے کی طرف مڑ گیا جس کا مالک اس کا بڑا اچھا دوست تھا۔ وہاں اس نے رات گزاری اور اگلی صبح اپنے گھر کی راہ لی لیکن بغیر گاڑی اور بکس کے۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، فرانسیسی کے کاغذات

پر قبضہ کرنے کے بعد دوبرووسکی تروئیے کوروف کے سامنے بیباکی سے آیا اور اس کے گھر میں رہنے لگا۔ چاہے اس کی نیت جو ہو (اس کے بارے میں ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا) اس کے طرز عمل میں کوئی مشتبہہ اور بری بات نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ننھے ساشا کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں زیادہ دردسر نہ پالتا تھا، وہ اس کو کھیلنے اور سیرسپاٹے کی پوری آزادی دیتا۔ وہ سبق کے معاملے میں زیادہ سخت نہیں تھا مگر دکھاوے کو اسے لکھنے پڑھنے کا کام دیتا رہتا۔ لیکن وہ اپنی دوسری شاگرد کو موسیقی سکھانے میں بڑی محنت اور تندھی سے کام لیتا اور اس کے ساتھ گھنٹوں پیانو پر جما رہتا۔ ہر شخص اتالیق کو پسند کرتا تھا۔ کیریلا پترووچ تو شکار کھیلنے کے دوران میں اس کی بےباک بہادری کے لئے، ماریا کیریلوونا اس کی انتھک لگن اور ایک شرمائی شرمائی سی کیفیت میں ڈوبے ہوئے حسن اخلاق کے لئے، — ساشا اسے اس لئے چاھتا تھا کہ وہ اس کی شرارتوں کو نظر انداز کر دیتا تھا، نوکر چاکر اس کی نیک طبیعت اور فیاضی سے خوش تھے جو اس کے اندر اس کی حیثیت کے لحاظ سے زیادہ ھی معلوم ھوتی تھی۔ اور ظاھری طور پر وہ بھی پورے خاندان سے بہت ھی گھل مل گیا تھا اور ان کے درمیان بالکل گھر جیسا محسوس کرتا تھا۔

ایک استاد کی حیثیت سے بحال ھونے کے دن سے جشن و طرب کے اس یاد گار دن تک ایک مہینہ بیت چکا تھا اور کسی کو ذرا شبہہ نہ ھوا تھا کہ یہ سلیم الطبع نوجوان فرانسیسی حقیقت میں ایک خوفناک ڈاکو تھا جس کا نام سنتے ھی تمام مقامی زمینداروں کے دل دھل جاتے تھے۔ اس پورے زمانے میں دوبرووسکی ایک بار بھی پوکرووسکوئیے سے باھر نہیں گیا۔ لیکن اس کے کارناموں کی خبریں گاؤں والوں کے پرواز خیال کی بدولت برابر تر و تازہ رھیں۔ ھاں یہ بھی ممکن ھے کہ اپنے سردار کی غیر موجودگی میں بھی ڈاکوؤں کے گروہ نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ھوں۔

جب اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ رات بسر کر رہا ہے جس کو اپنا ذاتی دشمن سمجھنے میں وہ حق بجانب ہو سکتا تھا، ایک ایسا شخص جس نے دوبرووسکی کی بربادی میں نمایاں حصہ لیا تھا، تو وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کو تھیلی کے بارے میں معلوم تھا اور اس نے اس پر قبضہ جمانے کی ٹھان لی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نے اچانک استاد سے ڈاکو میں بدل کر انتون پافنوتچ کو کتنا بھونچکا کر دیا۔

اگلی صبح نو بجے، مہمان، جنھوں نے رات پوکرووسکوئے میں بسر کی تھی، ایک ایک کر کے ڈرائنگ روم میں جمع ہونا شروع ہوئے۔ یہاں سماوار سے، جس کے پاس ہی ماریا کیریلوونا صبح کے لبادے میں ملبوس بیٹھی تھی، دھواں نکل رہا تھا اور کیریلا پترووچ اپنے ڈریسنگ گاون اور سلیپر میں، قاب جیسے بڑے پیالے سے چسکیاں لے رہا تھا۔ سب سے آخر میں انتون پافنوتچ آیا۔ وہ اتنا نڈھال اور پریشان نظر آ رہا تھا کہ کیریلا پترووچ نے اس سے پوچھا کہ خیریت تو ہے۔ انتون پافنوتچ نے خوف زدہ نگاھوں سے استاد کو دیکھتے ہوئے بے معنی جواب دیا۔ استاد وھاں یوں بیٹھا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چند منٹ بعد ایک ملازم نے اندر آ کر بتایا کہ انتون پافنوتچ کی گاڑی تیار ہے۔ اور اس نے اپنے میزبان کی التجاؤں کے باوجود جلد ہی رخصت لی اور کمرے سے باھر نکل کر فوراً ہی چلتا ہو گیا۔ ہر شخص حیران تھا کہ آخر بات کیا ہوئی۔ کیریلا پترووچ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے دوست نے بہت زیادہ کھا لیا تھا۔ چائے اور الوداعی ناشتے کے بعد دوسرے مہمان بھی رخصت ہونے لگے اور جلد ہی پوکرووسکوئے مہمانوں سے خالی ہو گیا اور ہر چیز حسب معمول اپنے ڈھرے پر آ گئی۔

بارھواں باب

چند دن بیت گئے اور کوئی قابل ذکر بات رونما نہیں ہوئی۔ پوکرووسکوئے کے رھنے والوں کی زندگی میں بڑی یک رنگی سی تھی۔ کیریلا پترووچ ہر دن شکار پر جاتا تھا۔ پڑھنا، ٹہلنا گھومنا اور موسیقی کے سبق لینا — اور خاص طور پر موسیقی کے سبق لینا — ماریا کیریلوونا کے مشغلے تھے۔ اب کچھ کچھ وہ اپنے دل کو سمجھنے لگی تھی اور اس بات پر بےاختیار اسے جھنجلاھٹ ہو رہی تھی کہ وہ ھرگز اپنے فرانسیسی نوجوان کے حسن و خوبی سے یکسر بےنیاز نہ تھی۔ نوجوان عزت و احترام اور اخلاق و ادب کی حدوں کو کبھی پار نہ کرتا۔ اس طرح وہ اس کے غرور کی تسکین بھی کر دیتا اور اس کے سہمے سہمے سے اندیشوں کا ازالہ بھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ اعتبار کے ساتھ خود کو اس نشاط انگیز احساس کے سپرد کرتی چلی گئی۔ دیفورژ پاس نہ ھوتا تو وہ اداس اداس سی رھتی اور جب پاس ھوتا تو وہ کسی دوسرے کی طرف توجہ نہ کرتی۔ ھر چیز میں اس کی رائے لیتی اور ھمیشہ اس کی رائے سے اتفاق کرتی۔ اسے اب تک فرانسیسی سے محبت بھلے نہ ھوئی ھو، مگر اس کے دل میں جذبات کا شعلہ پہلی ھی رکاوٹ یا ذرا سے نشیب و فراز سے بھڑک اٹھنے کو تیار تھا۔

ایک دن، ماریا کیریلوونا ھال میں داخل ھوئی جہاں اتالیق اس کا انتظار کر رہا تھا تو دیفورژ کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے پیانو کا ڈھکن اٹھایا اور چند سر چھیڑے لیکن دوبرووسکی نے درد سر کا بہانہ کرکے سبق کو درمیان سے روک دیا اور نغموں کی کتاب کو بند کرتے ھوئے اس نے ماریا کیریلوونا کے ھاتھ میں آھستہ سے ایک پرچہ تھما دیا۔ اس نے پرچہ لے لیا اور اسے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کر کیا رھی ھے۔ دوسرے ھی لمحے وہ اپنے اس قدم پر پچھتانے

لگی لیکن دوبرووسکی کمرے سے جا چکا تھا - ماریا کیریلوونا خود اپنے کمرے میں گئی، پرچہ کھولا اور اس کی نگاھوں سے یہ سطریں گزریں :

''آج شام کو سات بجے دریا کے پاس والے کنج میں ملو - تم سے بات کرنا ضروری ھے -''

تجسس اس کا دل کرید رھا تھا - بہت دنوں سے اسے اس کے احساسات کے اقرار کی توقع تھی - دونوں کے دل میں اس کی خواھش تھی اور دونوں اس سے ڈرتے تھے - وہ اپنے قیاس کی تصدیق کرانا چاھتی تھی لیکن اسے احساس تھا کہ ایک ایسے آدمی سے اقرار محبت سننا نامناسب تھا جو اپنی سماجی حیثیت کی بدولت اس کو اپنا نہ سکتا ھو - اس نے طے کر لیا کہ وہ ملاقات کی مقررہ جگہ پر جائیگی حالانکہ ایک بات اس کے دماغ میں صاف نہیں تھی - آخر وہ اتالیق کا اقرار محبت کس انداز سے سنے - امیرانہ برھمی کے ساتھ یا دوستانہ شکوہ و شکائت کے ساتھ، ھنسی مذاق کے ساتھ یا خاموش ھمدردی کے ساتھ؟ لیکن وہ مستقل گھڑی کو تاکتے رھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکی - شام کا دھندلکا چھایا، موم بتیاں اندر لائی گئیں اور کیریلا پترووچ اپنے چند مہمانوں کے ساتھ جو اس سے ملنے آئے تھے، تاش کھیلنے کے لئے جم گیا - کھانے کے کمرے میں گھڑی نے پونے سات بجائے اور ماریا کیریلوونا چپکے سے برساتی میں نکل گئی، اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی اور باغ میں چلی گئی -

یہ ایک اندھیری شام تھی، آسمان پر ایسی گھٹائیں چھا رھی تھیں کہ دو قدم کی چیزیں بھی سجھائی نہ دیتیں - لیکن ماریا کیریلوونا جانے پہچانے راستوں پر تیز تیز قدموں سے چلتی رھی اور ایک منٹ میں کنج کے پاس جا پہنچی - وہ ذرا ٹھٹکی تاکہ اپنے حواس درست کر لے اور بےنیازی اور اطمینان کی شان سے دیفورژ کے سامنے آئے - لیکن دیفورژ تو اس کے سامنے کھڑا تھا -

''شکریه تم نے میری درخواست نہیں ٹھکرائی،، اس نے آهسته اور اداس لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نه آتیں تو میرا دل ٹکڑے ٹکڑے هو جاتا۔،،

ماریا کیریلوونا نے ایک رسمی فقره دوهرایا:

''مجھے امید هے که تم مجھے اپنے اس قدم پر پچھتانے پر مجبور نہیں کروگے۔،،

وه کچھ نه بولا اور ایسا لگا که وه همت سے کام لینے کی کوشش کر رها هے۔

''حالات کا تقاضه هے که میں تم سے جدا هو جاؤں . . .'' اس کے منه سے آخر یه الفاظ نکلے۔ ''تم کو خود هی جلد معلوم هو جائیگا . . . لیکن تم سے جدا هونے سے پہلے مجھے خود بتانا هے که . . .،،

ماریا کیریلوونا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سوچا که یه باتیں آنےوالے اقرار محبت کا پیش خیمه هیں۔

''میں وه نہیں هوں جو تم سمجھتی هو،، اس نے سر جھکاتے هوئے اپنی بات جاری رکھی ''میں فرانسیسی دیفورژ نہیں هوں۔ میں هوں دوبرووسکی۔،،

ماریا کیریلوونا کے منه سے چیخ نکل گئی۔

''میں التجا کرتا هوں — پریشان نه هو۔ تمہیں میرے نام سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ هاں، میں وه بدنصیب هوں جس کو تمہارے باپ نے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے سے محروم کر دیا۔ اس کو اپنی موروثی جاگیر سے نکال دیا اور اسے ڈاکو بناکر چھوڑا۔ لیکن تم کو مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نه خود اپنے لئے اور نه اپنے ابا کے لئے۔ سب کچھ ختم هو چکا هے۔ میں نے ان کو معاف کر دیا۔

''تمہیں معلوم رهے که تم نے ان کی جان بچائی هے۔ میرا اراده تها که میں سب سے پہلے تمہارے ابا کے خون سے هاتھ رنگونگا۔ میں ان کے محل کے چاروں طرف چکر لگاتا تها اور یه سوچتا اور طے کرتا تها که آگ کہاں سے لگائی جائے، کس جگه سے ان کے سونے کے کمرے میں قدم رکھا جائے، کس طرح ان کے بھاگنے کے تمام

راستہ کاٹ دئے جائیں، — اور تم ایک آسمانی حور کی طرح میرے پاس سے گزریں اور میرا دل تمہارا غلام ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا جس گھر میں تم رہتی ہو، وہ میرے لئے مقدس ہے۔ کوئی بھی جس کا تم سے خونی رشتہ ہے، میرے غیض و غضب کا نشانہ نہیں بنیگا۔ میں نے انتقام کے تمام خیال کو پاگل پن کہہ کر ٹال دیا۔ نہ جانے کتنے دنوں تک پوکرووسکوئے باغ کے چکر کاٹے اس امید میں کہ دور سے تمہارے سفید لباس کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ جب تم بےپروائی سے چہل‌قدمی میں مگن ہوتیں تو میری نگاہیں تمہارا پیچھا کرتیں اور ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں چھپتا ہوا میں تمہیں دیکھتا رہتا اور اس خیال سے خوش ہوتا کہ میں تمہاری نگہبانی کر رہا ہوں۔ اور تمہارے لئے ایسا کوئی خطرہ نہیں جس کے سامنے ان دیکھے طور پر میں موجود نہ ہوں۔ آخر ایک موقع ہاتھ آیا۔ میں تمہارے گھر میں رہنے لگا۔ یہ تین ہفتے میرے لئے مسرت کا بہترین لمحہ رہے ہیں... ان کی یاد میری غم زدہ زندگی میں اجالا کریگی.. لیکن مجھے ایک ایسی خبر ملی ہے جس نے یہاں میرے قیام کو ناممکن بنا دیا ہے۔ آج مجھے تم سے جدا ہو جانا چاہئے... آج، اسی آن۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا کہ تم مجھ پر لعنت نہ بھیجو اور مجھ سے نفرت نہ کرو۔ کبھی کبھی دوبرووسکی کو یاد کر لینا۔ تم جانتی ہو وہ ایک دوسری قسمت کے ساتھ پیدا ہوا تھا، اس کا دل تم کو چاہنے کے لائق تھا، یہ کہ کبھی...،،

اسی لمحہ ایک ہلکی سی سیٹی سنائی دی اور دوبرووسکی چپ ہو گیا... اس نے ماریا کا ہاتھ پکڑا اور اس پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دئے۔ سیٹی دوسری بار سنائی دی۔

”مجھے معاف کر دو،، دوبرووسکی نے کہا۔ ”یہ سیٹی میرے لئے تھی، اب میرا جانا ضروری ہے، ایک لمحے کی دیر بھی میری تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔،،

وہ اس کے پاس سے چند قدم ہٹ گیا اور ماریا کیریلوونا اپنی جگہ پر خاموش کھڑی رہی۔ یکایک دوبرووسکی پلٹا اور دو بارہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''جب کبھی'' اس نے نرمی اور محبت بھری آواز میں کہا۔ ''جب کبھی خطرہ تمہیں آن گھیرے اور تمہیں کسی کا آسرا نہ ہو، کوئی بھی تمہاری حفاظت نہ کر سکے تو مجھ سے وعدہ کرو کہ اس صورت میں، اپنی ہر ضرورت کے لئے تم مجھے یاد کروگی؟ کیا تم وعدہ کرتی ہو کہ تم میری محبت کو کبھی نہیں ٹھکراؤگی؟''

ماریا کیریلوونا خاموش روتی رہی۔ سیٹی کی آواز تیسری بار آئی۔

''کیا تم مجھے تباہ کرنا چاہتی ہو؟'' دوبرووسکی چلایا۔ ''میں اس وقت تک تمہارے پاس سے نہیں جاؤنگا جب تک کہ تم مجھے جواب نہیں دوگی۔ تم مجھ سے اس کا وعدہ کرتی ہو یا نہیں؟''

''میں وعدہ کرتی ہوں'' غم زدہ حسینہ نے سرگوشی میں جواب دیا۔

دوبرووسکی کی ملاقات کی بدولت ماریا کیریلوونا انتہائی ہیجان کے ساتھ روانہ ہوئی۔ جب وہ واپس آئی تو اسے معلوم ہوا کہ ہر شخص بھاگ رہا ہے۔ گھر میں بڑی بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ اور صحن میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ برساتی میں ایک تروئکا کھڑی تھی۔ دور سے کیریلا پترووچ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ جلدی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ وہ ڈری کہ اس کی غیرموجودگی کا پتہ لگ گیا ہوگا۔ بڑے کمرے میں اس کی ملاقات کیریلا پترووچ سے ہوئی جہاں ہمارا دوست، تھانیدار، مہمانوں میں گھرا کھڑا تھا۔ وہ اس پر سوالات کی بوچھار کر رہے تھے۔ وہ سفر کے لباس میں سرتاپا کیل کانٹے سے لیس، ان لوگوں کے سوالات کا جواب پر اسرار انداز سے دے رہا تھا۔

''کہاں تھیں تم ماشا؟'' کیریلا پترووچ نے پوچھا۔ ''تم نے موسیو دیفورژ کو تو نہیں دیکھا، ایں؟''

ماشا نے اپنی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔

''ذرا دیکھو!،، کیریلا پتروو چ نے کہا۔ ''تھانیدار اس کو گرفتار کرنے آیا ہے اور مجھے یقین دلانا چاھتا ہے کہ وہ دوبرووسکی ہے۔،،

''حضور عالی، اس کی تمام خصوصیات،، تھانیدار نے عزت و احترام کے ساتھ کہا۔

''اوہ، بھئی!،، کیریلا پتروو چ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم اپنی ان خصوصیات کے ساتھ جہاں جی چاہے جا سکتے ہو! میں اس وقت تک اپنے فرانسیسی نوجوان کو تمہارے حوالے کرنے کو تیار نہیں جب تک کہ میں خود ہی اس معاملے کی جانچ پڑتال نہ کر لوں۔ اس جھوٹے انتون پافنوتچ کی بات پر کون کان دھریگا؟ اس نے خواب دیکھا ہوگا کہ اتالیق اس کو لوٹ رہا ہے۔ اس نے اسی صبح مجھ سے یہ سب کچھ کیوں نہیں کہا؟،،

''فرانسیسی نے اس کو دھمکی دی تھی، حضور عالی،، تھانیدار نے جواب دیا ''اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ اس کو راز رکھیگا...،،

''جھوٹ کی پوٹ!،، کیریلا پتروو چ نے کہا۔ ''میں ابھی ابھی سارا معاملہ ٹھیک کرتا ہوں۔ اتالیق ہے کہاں؟،، اس نے اندر آتے ہوئے ملازم سے کہا۔

''اس کا کہیں پتہ نہیں،، ملازم نے جواب دیا۔

''تو پھر اسے تلاش کرو،، تروئے کوروف چلایا۔ اب خود اس کے دل پر شبہہ نے چھاپہ مارا۔ ''ذرا دکھانا مجھے اس کی خصوصیات کے بارے میں اپنی قیمتی دستاویز،، اس نے تھانیدار سے کہا جس نے فوراً ہی کاغذ اس کو تھما دیا۔

''ہوں، عمر تئیس برس، میانہ قد، مونچھ داڑھی صاف، آنکھیں بھوری... یہ ٹھیک ہے مگر صرف اس سے کچھ نہیں ثابت ہوتا۔ اتالیق ہے کہاں؟،،

''اس کا کہیں پتہ نہیں،، پھر جواب ملا۔

کیریلا پترووچ پریشان ہونے لگا۔ ماریا کیریلوونا مردہ نظر آ رہی تھی۔

''تم زرد ہو رہی ہو ماشا،، اس کے باپ نے کہا۔ ''انہوں نے تمہیں ڈرا دیا۔،،

''نہیں ابا،، ماشانے جواب دیا ''میرے سرمیں درد ہے۔،،

''تم اپنے کمرے میں جاؤ ماشا اور پریشان نہ ہو۔،،

ماشا نے اس کا ہاتھ چوما اور تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں جاتے ہی وہ اپنے بستر پر گر پڑی اور بدحواس سسکیاں بھرنے لگی۔ کنیزیں دوڑتی ہوئی آئیں، انہوں نے بڑی مشکل سے اس کے کپڑے بدلے اور اتنی ہی مشکل سے، ٹھنڈے پانی اور تیز نمک کی مدد سے اس کو سکون پہنچانے میں کامیاب ہوئیں۔ پھر انہوں نے اس کو بستر میں لٹا دیا اور وہ میٹھی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اس اثنا میں فرانسیسی نوجوان کا اتہ پتہ نہ چلا۔ کیریلا پترووچ ہال میں ٹہل رہا تھا اور انتہائی نحوست بھرے انداز میں ''فتح کے شادیانے بجاؤ!،، کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ مہمان آپس میں سرگوشی کر رہے تھے، تھانیدار الو معلوم ہو رہا تھا۔ اور فرانسیسی کا کہیں پتہ نشان نہ تھا۔ کوئی شبہہ نہیں کہ وہ بچ نکلا اور اسے کسی نے ہوشیار کر دیا تھا۔ لیکن کس نے کہا اس سے اور کس طرح، یہ بات ایک پہیلی بنی رہی۔

گھڑی نے گیارہ بجائے اور کسی کو سونے کا خیال نہ آیا۔ آخرکار کیریلا پترووچ نے غصے سے تھانیدار سے کہا:

''اچھا تو بس! تم یہاں رات بھر تو نہیں جمے رہ سکتے۔ میرا گھر سرائے نہیں ہے۔ بھئی اگر وہ واقعی دوبرووسکی ہے تو تم میں اس کو گرفتار کرنے کے لئے مستعدی اور پھرتی کی کمی ہے۔ جاؤ گھر جاؤ اور اگلے موقع پر ذرا اور تیزی سے آنے کی کوشش کرنا۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب تم سب گھر جاؤ۔،، اور مہمانوں کی طرف مڑتے ہوئے اس نے کہا ''تم اپنی گاڑیوں کو جوتنے کا حکم دو، میں سونا چاہتا ہوں۔،،

تیرھواں باب

پھر بغیر کسی قابل ذکر واقعہ کے کچھ وقت گزر گیا ۔ لیکن اگلے موسم گرما میں کیریلا پترووچ کی گھریلو زندگی میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔

اس کی جاگیر سے کوئی تیس ورسٹ کے فاصلے پر شہزادہ ویریئسکی کی شاندار جاگیر تھی ۔ شہزادہ اپنی جائداد کو ایک پنشن یافتہ میجر کے ہاتھ میں چھوڑ کر دیس بدیس کے چکر لگاتا پھر رہا تھا اور پوکرووسکوئے اور ارباتوف کے درمیان کوئی لگاؤ نہ تھا ۔

لیکن، مئی کے آخر میں، شہزادہ پردیس سے لوٹا اور اپنے گاؤں گیا جس کو اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ وہ لطف اور تفریح کی زندگی کا عادی ہونے کی وجہ سے، تنہائی کی زندگی برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ اور اپنی آمد کے تین دن بعد ھی وہ تروئےکوروف کے ساتھ کھانا کھانے کے لئے چل پڑا جس سے زمانہ دراز پہلے اس کی جان پہچان ہوئی تھی ۔

شہزادہ کوئی پچاس برس کا تھا لیکن وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا معلوم ہوتا تھا ۔ ہر قسم کی بےاعتدالیوں نے اس کی صحت خراب کر دی تھی اور اس کے چہرے پر اسٹ نشان چھوڑ دئے تھے ۔ اس کے باوجود اس کے چہرے میں خوشگوار اور امتیازی بات تھی اور سوسائٹی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے اس میں مجلسی آداب و اخلاق پیدا ہو گئے تھے جن کا اظہار وہ خاص طور پر عورتوں کے سامنے کرتا تھا ۔ اس کو ہمیشہ دل بستگی کی ضرورت ہوتی اور ہمیشہ اکتایا رہتا ۔ کیریلا پترووچ کو اس کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی ۔ اسے اپنے مہمان کی آمد پر بہت فخر اور عزت افزائی محسوس ہوئی، کیونکہ وہ نگر نگر گھوما ہوا آدمی تھا ۔ اپنے قاعدے کے مطابق اس نے مہمان کی دل بستگی اور خاطر تواضع کے لئے اپنی جاگیر کی سیر کرائی ۔ اور خاص طور پر

کتا گھر دکھایا - لیکن شہزادے کا دم وھاں کی بساند میں بالکل گھٹ کر رہ گیا اور وہ ایک معطر رومال ناک پر رکھ کر وھاں سے جلدی جلدی باھر نکل آیا - دقیانوسی قسم کے باغ جن میں لائم کے کٹے چھٹے درخت، مستطیل تالاب اور سیدھے راستے تھے، اسے بالکل پسند نہ تھے - اس کو انگریزی باغ اور اس کی اپنی زبان میں ''قدرتی مناظر،، پسند تھے - لیکن اس نے ان مناظر کی تعریف کی اور داد دی - ایک ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ھے - وہ گھر کے اندر واپس گئے - شہزادہ لنگڑا رھا تھا اور سیر سے تھک کر چور وہ ابھی سے اپنے یہاں آنے پر پچھتا رھا تھا -

لیکن بڑے کمرے میں ان کی ملاقات ماریا کیریلوونا سے ھوئی اور بڈھے عیاش پر اس کے حسن نے جادو کردیا - تروئے کوروف نے مہمان کو اس کے پاس بٹھایا اور شہزادہ اس کی موجودگی سے چہک اٹھا اور اس میں پھر زندگی عود کر آئی اور اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لئے وہ دلچسپ قصے سنانے لگا - کھانے کے بعد کیریلا پترووچ نے شہسواری کی دعوت دی - لیکن شہزادے نے اپنے مخمل کے جوتوں اور گٹھیا کے درد کا بہانہ کر کے معذرت کر لی - اس نے گاڑی میں سیر کی تجویز پیش کی تاکہ وہ اپنے دلکش ھمنشین سے جدا نہ ھو - گاڑی جوتی گئی - دونوں بڈھے اور جوان سال حسینہ اس میں سوار ھوئے اور سیر کو چل پڑے - بات چیت کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹا - ماریا کیریلوونا خوش خوش، اس مجلسی آدمی کی دلچسپ اور خوش اخلاقی کی باتیں سنتی رھی - یکایک ویریئسکی کیریلا پترووچ کی طرف مڑا اور جلی ھوئی عمارت کے پاس سے گزرتے ھوئے پوچھا کہ یہ جلی ھوئی کیوں ھے اور آیا یہ عمارت اس کی ھے؟ کیریلا پترووچ کی تیوریاں چڑھ گئیں - اس جلی ھوئی عمارت کو دیکھ کر جو یادیں تازہ ھوئیں وہ ھرگز خوشگوار نہ تھیں - اس نے جواب میں کہا کہ یہ زمین اب اسی کی ھے - اس سے پہلے دوبرووسکی کی تھی -

''دوبرووسکی کی؟،، ویریئسکی نے دوھرایا ''کیا؟ وہ بدمعاش نمبر ایک؟،،

''اس کے باپ کی،، ترویئےکوروف نے کہا۔ ''باپ بھی بدمعاش تھا۔،،

''ھمارے رینالدو کا کیا بنا؟ کیا وہ زندہ ھے؟ کیا وہ پکڑا گیا؟،،

''وہ زندہ ھے اور شتر بےمہار بنا ھوا ھے اور جب تک کہ ھمارے تھانیدار اس سے ملے ھوئے ھیں وہ پکڑا نہیں جا سکتا۔ ھاں، شہزادے صاحب، دوبرووسکی تو ارباتوف آ چکا ھے، ھے نا؟،،

''ھاں، معلوم ھوتا ھے کہ اس نے پچھلے برس کچھ جلایا ولایا اور لوٹ مار مچائی تھی۔ کیوں ماریا کیریلوونا اگر اس رومانی ھیرو سے جان پہچان حاصل ھو تو خاصا دلچسپ رھیگا؟،،

''دلچسپ؟،، ترویئےکوروف نے کہا ''وہ اس کو جانتی ھے۔ وہ پورے تین ھفتے تک اسے موسیقی سکھاتا رھا لیکن خدا کا شکر ھے کہ اس نے موسیقی سکھانے کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔،،

کیریلا پترووچ نے اپنے فرانسیسی اتالیق کا قصہ سنانا شروع کیا۔ ماریا کیریلوونا انگاروں پر لوٹ رھی تھی۔ لیکن ویریئسکی پوری دلچسپی سے سنتا رھا۔ اسے یہ سب بہت عجیب معلوم ھوا اور اس نے موضوع بدل دیا۔ لیکن جب وہ واپس پہنچے تو اس نے گاڑی تیار کرنے کے لئے کہا اور رات بھر ٹھیرنے کے لئے اپنے میزبان کے مسلسل اصرار کے باوجود چائے کے بعد فوراً ھی چل کھڑا ھوا۔ بہر حال، جانے سے پہلے اس نے کیریلا پترووچ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور ماریا کیریلوونا کو بھی ساتھ لانے کے لئے کہا اور پر فخر ترویئےکوروف نے وعدہ کر لیا کیونکہ اپنے پڑوسی شہزادے کے رتبے، دو ستاروں اور تین ھزار کمیروں کے پیش نظر وہ ویریئسکی کو اپنے برابر کا آدمی سمجھتا تھا۔

دو دن بعد، کیریلا پترووچ اور اس کی لڑکی شہزادہ ویریئسکی کے یہاں گئے۔ جب کیریلا پترووچ ارباتوف کے پاس پہنچا تو وہ کسانوں کے صاف ستھرے جھونپڑے اور مالک کا پتھروں کا محل دیکھ کر جو انگریزی محل کی طرز پر تعمیر ہوا تھا دل ہی دل میں تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ گھر کے سامنے ایک سبزہ‌زار تھا جہاں اس کے سوئٹزرلینڈوالے مویشی گھاس چر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک جانور کی گردن میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں جو ٹن ٹن بج رہی تھیں۔ مکان کے چاروں طرف ایک بڑا سا باغ پھیلا ہوا تھا۔ میزبان مہمانوں سے برساتی میں ملا اور اس نے اپنے ہاتھ کا سہارا جوان سال لڑکی کو دیا۔ وہ ایک شاندار ہال میں داخل ہوئے جس میں تین آدمیوں کے لئے میز سجی تھی۔ شہزادہ مہمانوں کو کھڑکی پر لے گیا تاکہ وہ سامنے پھیلے ہوئے حسین منظر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ کھڑکیوں کے نیچے دریائے وولگا، مال سے لدی ہوئی پھولے پھولے بادبان والی کشتیوں کو اپنے دھاروں پر سنبھالے ہوئے، بہہ رہا تھا اور مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں،جن کو ''موت کا جال،، کہا جاتا ہے، پانی کی سطح پر ادھر ادھر ڈگمگاتی تیر رہی تھیں۔ دریا کے اس پار پہاڑیوں اور کھیتوں کا وسیع سلسلہ تھا اور کہیں کہیں ابھرے ہوئے دیہاتوں نے ان میں بڑی زندگی پیدا کر دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ وقت تصویروں کی گیلری دیکھنے میں بتایا۔ یہ وہ تصویریں تھیں جو شہزادے نے دوسرے ملکوں میں خریدی تھیں۔ شہزادے نے ہر تصویر کا موضوع ماریا کیریلوونا کو سمجھایا، مصوروں کی زندگی کی داستانیں سنائیں اور ان کی خوبیاں اور خامیاں بیان کیں۔ اس نے فرسودہ اور رسمی زبان میں ان تصویروں پر روشنی نہیں ڈالی بلکہ جو کچھ کہا، جذبات اور ندرت کے ساتھ کہا۔ ماریا کیریلوونا نے اس کی باتیں لطف اور دلچسپی کے ساتھ سنیں۔ اس کے بعد وہ کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ تروئے کوروف نے امفی‌تریون کی شرابوں اور باورچی کے کمال فن کی خوب داد دی اور

ان کے ساتھ خوب خوب انصاف کیا۔ ماریا کیریلوونا کو ایک ایسے شخص سے بات چیت کرنے میں ذرا گھبراہٹ یا جھجک نہیں محسوس ہو رہی تھی جس سے وہ زندگی میں صرف دو بار ملی تھی۔ کھانے کے بعد میزبان نے مہمانوں کو باغ میں چلنے کی دعوت دی جہاں انہوں نے ایک بڑی سی جھیل کے کنارے جس میں ٹاپو ابھرے ہوئے تھے، ایک کنج میں بیٹھ کر کافی پی۔ یکایک باجوں کی آواز سنائی دی اور چھ چپوؤں والی ایک کشتی بالکل کنج کے پاس آکر رکی۔ وہ تینوں اس میں سوار ہوئے اور ٹاپوؤں کے درمیان کشتی رانی کرتے رہے۔ ان میں سے بعض ٹاپوؤں پر جاکر انہوں نے سیر بھی کی۔ ان میں سے ایک پر سنگ مرمر کا ایک مجسمہ تھا، دوسرے پر ایک ویران کنج اور تیسرے پر ایک ستون جس پر کچھ پراسرار سی عبارت ابھری ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر ماریا کیریلوونا کے دل میں لڑکیوں والا تجسس پیدا ہوا اور شہزادے کا مہذبانہ مگر مبہم جواب اس کی تسلی نہ کر سکا۔ وقت غیر محسوس طور پر گزر گیا اور شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا اور شبنم کا بہانہ کر کے، شہزادے نے مہمانوں کو گھر کے اندر چلنے کے لئے کہا جہاں سماوار ان کا انتظار کر رہا تھا۔ شہزادے نے ماریا کیریلوونا سے کہا کہ اس بوڑھے کنوارے کے گھر میں تم ہی میزبان کا فرض ادا کرو۔ اس نے چائے پیالیوں میں نکالی اور برابر مہمان نواز اور باتونی میزبان کی بے پناہ داستان سرائیوں پر کان لگائے رہی۔ یکایک تڑسے گولی چلنے کی آواز آئی اور سارا آسمان چنگاریوں سے روشن ہو گیا۔ شہزادے نے ماریا کیریلوونا کو ایک شال دی اور باپ بیٹی کو بالکنی میں چلنے کی دعوت دی۔ گھر کے سامنے صدرنگ آتش بازیاں شوں شاں کرتی ہوئی فضا میں بلند ہوتیں... چکراتیں اور فصل کی بالیوں، کھجور نما درختوں اور جھرنوں کی طرح پھیلتیں اور بکھر جاتیں۔ آگ کی بارش اور ستاروں کا انتشار ابھرتا اور غائب ہو جاتا اور دوبارہ بھڑک اٹھتا۔ ماریا کیریلوونا نے ان سب

چیزوں سے ایک بچے کی طرح لطف اٹھایا۔ شہزادہ اس کی خوشی اور شوق پر بہت مسرور ہوا اور تروئیےکوروف یہ سوچ کر حد درجہ خوش تھا کہ شہزادے نے اس کے لئے اپنے احترام کا اظہار کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر کتنا خرچ کیا تھا اور کتنی زحمت اٹھائی تھی۔

رات کا کھانا بھی اتنا ہی شاندار تھا جتنا کہ دن کا۔ اس کے بعد مہمان اپنے اپنے مقررہ کمروں میں گئے اور اگلی صبح وہ اس وعدے کے ساتھ رخصت ہوئے کہ وہ پھر جلد ہی ملینگے۔

چودھواں باب

ماریا کیریلوونا کشیدے کا فریم سنبھالے اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی... کونراد کی محبوبہ کے برعکس جو عشق و محبت کے خواب دیکھتی ہوئی سبز ریشم سے گلاب کا پھول کاڑھتی تھی۔ اس نے رنگوں میں کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ جس ڈیزائن کی نقل کر رہی تھی وہ بجنسہ اس کے کپڑے پر ابھر آیا حالانکہ اس کا دھیان کام پر نہیں، کہیں اور تھا۔

اچانک آھستہ سے ایک ھاتھ کھڑکی میں گھسا اور ایک خط اندر آ گرا اور اس سے پہلے کہ ماریا کیریلوونا کی حیرانی دور ہوتی ھاتھ غائب ھو گیا۔ اسی لمحہ ایک ملازم اندر آیا اور اس نے اس کو اپنے باپ کے سامنے حاضر ھونے کا پیغام دیا۔ اس نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے خط اپنے رومال کے نیچے چھپایا اور تیز تیز قدموں سے باپ کے مطالعے کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

کیریلا پترووچ تنہا نہیں تھا۔ شہزادہ ویریئسکی بھی اس کے پاس تھا۔ ماریا کیریلوونا کو دیکھ کر شہزادہ

اٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے اس کے سامنے جھکا۔ اس کے انداز میں ایک بوکھلاہٹ تھی جو اس کے لئے ایک نئی چیز تھی۔

''ادھر آؤ ماشا،، کیریلا پترووچ نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک خوش خبری سناؤں۔ امید ہے کہ اس کو سن کر تمہیں خوشی ہوگی۔ تمہارا ایک منسوب — شہزادہ تمہاری طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔،،

ماشا پر بجلی گر گئی اور موت کی سی زردی اس کے چہرے پر چھا گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ شہزادہ اس کے پاس گیا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور جذبات بھری آواز میں پوچھا کہ آیا وہ اس کی زندگی کو مسرت بخشنے کے لئے راضی ہے۔ ماشا چپ رہی۔

''وہ راضی ہے، ہاں وہ راضی ہے،، کیریلا پترووچ نے کہا۔ ''لیکن تم جانتے ہو شہزادے یہ لفظ منہ سے نکالنا لڑکیوں کے لئے بہت دشوار ہے۔ اچھا میرے بچو تم ایک دوسرے کو پیار کرو اور پھولو پھلو۔،،

ماشا بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ بوڑھے شہزادے نے اس کا ہاتھ چوما اور یکایک ماشا کے زرد گالوں پر آنسو ڈھلکنے لگے۔

شہزادے نے بھویں سکیڑ لیں۔

''جاؤ یہاں سے!،، کیریلا پترووچ چلایا۔ ''جاؤ اور اپنے آنسو پونچھ کر دوبارہ خوش و خرم واپس آؤ۔ لڑکیوں کی جب منگنی ہوتی ہے تو وہ ضرور روتی ہیں۔،، اس نے ویریئسکی کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''ان کی یہی ریت ہے... اب شہزادے آؤ ہم کاروباری باتیں کریں۔ میرا مطلب ہے جہیز بری کے متعلق۔،،

ماریا کیریلوونا نے واپس جانے کی اجازت کا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ الٹے پاؤں لوٹی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اور خود کو بڈھے شہزادے کی بیوی تصور کرکے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بڈھا دفعتاً اسے انتہائی قابل نفرت اور بیزار کن

نظر آنے لگا۔ اس سے شادی کا خیال اسے سولی یا قبر کی طرح بھیانک نظر آرہا تھا۔ ''نہیں، نہیں،، اس نے انتہائی مایوسی کے ساتھ جواب دیا۔ ''بہتر یہ ہے کہ مر جاؤں، راہبہ بن جاؤں، اس سے تو بہتر ہے کہ میں دوبرووسکی سے شادی کر لوں!،، اب اسے خط کا خیال آیا اور اسے چاؤ سے پڑھنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ خط اسی کا ہے۔ واقعی یہ اسی کا لکھا ہوا تھا اور اس میں ان چند لفظ کے سوا اور کچھ نہ تھا: ''اسی جگہ پر رات کے دس بجے۔،،

پندرھواں باب

چاند چمک رہا تھا۔ جولائی کی ایک خاموش رات تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر ہوا کے جھونکے کھیلتے ہوئے آتے تھے اور پورے باغ میں ہلکی ہلکی سر سراھٹ دوڑ جاتی تھی۔

سائے کی طرح سبک روی کے ساتھ یہ جواں سال حسینہ ملاقات کی جگہ پر پہنچی۔ وہاں اب تک کوئی بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ یکایک دوبرووسکی کنج کے پیچھے سے نکلا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''میں سب جانتا ہوں،، اس نے دھیمی اور افسردہ آواز میں کہا۔ ''اپنا وعدہ یاد ہے؟،،

''تم مجھے بچانا چاہتے ہو،، ماشا نے کہا ''لیکن — لیکن مجھ سے خفا نہ ہونا — اس سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم کس طرح میری مدد کر سکتے ہو؟،،

''میں تم کو اس آدمی سے نجات دلا سکتا ہوں جس سے تم نفرت کرتی ہو۔،،

''میں التجا کرتی ہوں، اس پر ہاتھ نہ اٹھانا، اگر تم کو مجھ سے محبت ہے تو ہرگز اس کو ہاتھ نہ لگانا۔ میں کسی بھی بھیانک قدم کا سبب بننا نہیں چاہتی۔،،

''میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ تمہاری خواہش کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ اس کی زندگی تمہاری دین ہے۔ تمہارے نام پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ تم میرے جرائم میں بھی پاک اور بے داغ رہوگی۔ لیکن میں تم کو تمہارے سنگ دل باپ سے کیوں کر بچاؤں؟''

''اب بھی امید باقی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے آنسوؤں اور غم سے ان کا دل پسیج جائیگا۔ وہ بڑے ہٹ دھرم ہیں لیکن وہ مجھکو بہت چاہتے ہیں۔''

''امید موہوم! ان آنسوؤں میں ان کو وہ سراسیمگی اور بےاعتنائی نظر آئیگی جو ایسی تمام لڑکیوں میں عام ہے جو محبت کے بجائے فائدے کے لئے بیاہی جاتی ہیں۔ اس وقت کیا ہوگا اگر ان کے سر میں یہ سماجائے کہ تمہاری خواہش کے باوجود تمہیں خوش خرم بنانا چاہئے؟ اس وقت کیا ہوگا اگر وہ زبردستی تم کو گھسیٹ کر گرجا لے جائیں اور ہمیشہ کے لئے تمہاری قسمت ایک بڈھے شوہر کے ہاتھ میں دے دیں گے؟''

''تو پھر، تو پھر مجبوری ہے، مجھے آکر لے جاؤ، میں تمہاری بیوی بن جاؤں گی۔''

دوبرووسکی چونک گیا۔ اس کے زرد چہرے پر رنگ آ گیا لیکن دوسرے ہی لمحہ پھر اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ زرد ہو گیا۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

''اپنی ساری طاقت یکجا کر لو اور اپنے باپ سے التجا کرو۔ ان کو یہ سمجھاؤ کہ ایسا مستقبل کتنا بھیانک ہوگا جس میں تمہاری دوشیزگی اور جوانی کو ایک اپاھج اور عیاش بڈھے کے پہلو میں مرجھانا پڑیگا۔ دل کڑا کر کے ان کو تم کڑوی سچائی سے آگاہ کر دو۔ اگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تو ان کو بتا دو کہ تم...

ایک ایسے آدمی کا آسرا ڈھونڈوگی جس سے ان پر بجلی گر پڑیگی - ان سے کہو کہ دولت سے تمہیں ایک لمحے کو بھی تسلی نہیں ہوگی، صرف غربت کے دل پر عیش و طرب کا مرہم کارگر ہو سکتا ہے اور وہ بھی چند لمحے کو، صرف اس کا نیاپن دور ہونے تک — ان کو چین نہ لینے دو، نہ ان کے غصے سے ڈرو اور نہ ان کی دھمکیوں سے - میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ جب تک امید کی ایک ہلکی سی کرن باقی ہے ہتھیار نہ ڈالو - اگر کوئی چارہ نہ رہ جائے تو پھر ...''

دوبرووسکی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا اور ہانپنے لگا - ماشا رونے لگی...

''اف، میں دکھی اور بدنصیب آدمی!'' اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ نکلا - ''میں اپنی زندگی تمہارے لئے بھینٹ کر دونگا - تم کو دور سے دیکھ کر، تمہارے ہاتھ کو چھو کر مجھے ایک وجدانی کیف حاصل ہوگا - اور اب جب کہ وہ لمحہ آیا کہ میں تمہیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے لگاؤں اور کہوں 'میری حور، آؤ ہم دونوں ایک ساتھ مر جائیں!' میں، بیچارا تباہ و برباد آدمی، ہاں مجھے اس نعمت سے پوری طاقت کے ساتھ انکار کر دینا چاہئے... میں تمہارے قدموں پر گرنے کی، خدا سے اس انعام کے لئے شکر گزار ہونے کی جسارت نہیں کر سکتا جس کے لائق میں نہیں، جسے میں سمجھ نہیں سکتا - اوہ مجھے اس سے کتنی نفرت کرنی چاہئے جو... لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب میرے دل میں نفرت کے لئے کوئی جگہ نہیں -''

اس نے اپنا ہاتھ اس کی نازک سی کمر میں ڈال دیا اور اس کو آہستہ سے اپنے سینے کی طرف کھینچا - اس نے اس نوجوان ڈاکو کے شانے پر پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سر رکھ دیا - دونوں خاموش تھے -

وقت گزرتا رہا -

''مجھے جانا چاہئے'' ماشا نے آخر کہا -

دوبرووسکی جیسے خواب سے چونک پڑا ہو۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنا دی۔

''اگر تم میری مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کرو،، اس نے کہا ''تو اس انگوٹھی کو اسی شاہ بلوط کے کھوکھلے میں ڈال دو۔ مجھے معلوم ہو جائیگا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔،،

دوبرووسکی نے اس کا ہاتھ چوما اور درختوں کے درمیان غائب ہو گیا۔

سولھواں باب

شہزادہ ویریئسکی کی منگنی پورے جوار میں راز باقی نہیں رہی تھی۔ کیریلا پترووچ کو مبارکبادیاں موصول ہونے لگیں۔ اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ماشا اپنا فیصلہ کن جواب ہر دن اگلے دن پر ٹالتی رہی۔ اس اثنا میں وہ اپنے بڈھے منگیتر کے ساتھ سردمہری اور بےاعتنائی کا سلوک کرتی رہی۔ اس سے شہزادے کو ذرا پریشانی نہ ہوتی۔ اسے محبت کی تلاش نہیں تھی۔ اس کے لئے خاموش رضامندی کافی تھی۔

لیکن وقت بیتتا رہا۔ آخر ماشا نے قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اس نے شہزادہ ویریئسکی کو خط لکھا اور اس میں وسیع القلبی کا جذبہ ابھارنے کی کوشش کی اور صاف صاف اسے بتا دیا کہ وہ اس کی طرف ذرہ برابر بھی مائل نہیں اور اس سے التجا کی کہ وہ اس کے ساتھ شادی سے انکار کر دے اور اس کو باپ کے جبر سے بچائے۔ اس نے تنہائی میں یہ خط شہزادہ ویریئسکی کو دے دیا۔ اس نے تنہائی میں خط پڑھا لیکن اپنی منگیتر کی صافگوئی کا اس دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے برعکس اس نے

محسوس کیا کہ شادی میں اور بھی جلدی کرنی چاھئے۔ اور اس غرض سے اس نے اپنے ھونے والے سسر کو یہ خط دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

کیریلا پترووچ آگ بگولہ ھو گیا۔ شہزادے نے بڑی مشکل سے اس کو قائل کیا کہ ماشا پر یہ ظاھر نہ ھو کہ اس کو اس خط کا علم ھے۔ کیریلا پترووچ نے حامی بھرلی کہ وہ اس کو خط کے بارے میں نہیں بتائیگا لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ ھونے دیا جائے اور اگلے دن ھی شادی کی تاریخ مقرر کر لی۔ شہزادے کو یہ بات حد درجہ معقول معلوم ھوئی اور وہ اپنی منگیتر کے پاس گیا اور کہا کہ اس کے خط سے اس کا دل غم‌گین ضرور ھو گیا ھے لیکن اسے امید ھے کہ وقت آنے پر وہ اس کی محبت حاصل کر لیگا، کیونکہ اس کو کھو دینے کا تصور اس کے لئے ناقابل برداشت ھے۔ اور اس کا دور دور ارادہ نہیں کہ وہ خود اپنے لئے پھانسی کا حکم دے۔ ان الفاظ کے ساتھ اس نے اس کا ھاتھ چوما اور اس کے باپ کے فیصلے کے بارے میں ایک لفظ کہے بغیر وھاں سے چلا گیا۔

لیکن ابھی اس کی گاڑی احاطے سے باھر بھی نہیں نکلی تھی کہ اس کا باپ کمرے میں داخل ھوا اور دوٹوک سنا دیا کہ اگلی صبح تک اسے شادی کے لئے تیار ھونا ھے۔ ماریا کیریلوونا جس کا دل شہزادہ ویریئسکی کی باتوں سے پہلے ھی بھرا ھوا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس نے خود کو اپنے باپ کے قدموں پر گرا دیا۔

”ابا، پیارے ابا،“ اس نے فریادی آواز میں کہا۔ ”مجھے مت مارو! میں شہزادے سے محبت نہیں کرتی۔ میں اس کی بیوی نہیں بنونگی۔“

”اس کا مطلب کیا ھے؟“ کیریلا پترووچ گرجا۔ ”اب تک تم خاموش رھیں اور اپنی رضامندی ظاھر کی اور اب جب سارا معاملہ طے ھو چکا ھے تو تم ھٹ دھرمی پر اتر آئی ھو اور اپنے وعدے سے پھرنا چاھتی ھو!

بس، مہربانی سے بیوقوفی بند کرو! تمہاری ان باتوں کا مجھ پر ذرا اثر نہ ہوگا۔“

”مجھے مت مارو!“ رنج و غم میں ڈوبی ہوئی ماشا نے دھرایا۔ ”آخر تم مجھے اپنے پاس سے کیوں بھگانا چاہتے ہو، اور کیوں مجھے ایک ایسے آدمی کے حوالے کرنا چاہتے ہو جسے میں نہیں چاہتی؟ کیا تم مجھ سے اکتا گئے ہو؟ میں بس پہلے کی طرح تمہارے پاس پڑی رہنا چاہتی ہوں۔ تم میرے بنا اداس رہوگے ابا اور تم اس وقت اور بھی غمزدہ ہوگے جب تمہیں معلوم ہوگا کہ میں خوش نہیں ہوں ابا، مجھے مجبور نہ کرو، میں شادی کرنا نہیں چاہتی...“

کیریلا پترووچ کا دل کچھ پسیجا، لیکن اس نے اپنے جذبات کو چھپایا اور اسے سختی سے ڈھکیل دیا اور بولا:

”سنتی ہو یہ سب حماقت ہے؟ میں تم سے زیادہ جانتا ہوں کہ تم کو کس چیز سے خوشی حاصل ہوگی۔ تمہارے آنسو بےسود ہیں، تمہاری شادی پرسوں ہوگی۔“

”پرسوں!“ ماشا چلائی۔ ”اف، خدا! نہیں نہیں یہ ناممکن ہے، یہ نہیں ہو سکتا! ابا میری سنو، اگر تم مجھے برباد کرنے کا فیصلہ کروگے تو میں ایک ایسے شخص کی پناہ میں چلی جاؤنگی جس کا تم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤگے کہ تم نے مجھے کس حد تک پہنچا دیا ہے۔“

”یہ کیا؟“ تروئے کوروف نے کہا ”دھمکیاں؟ سر پھری لڑکی، تو مجھے دھمکیاں دے! کیا تو نہیں جانتی کہ میں تیرے ساتھ وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جس کا تو نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ تو مجھے اپنے محافظ سے ڈرانا چاہتی ہے! ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو کہ تجھے پناہ دینے والا یہ ہے کون؟“

”ولادیمیر دوبرووسکی“ ماشا نے بےقابو ہوکر کہا۔

ایک لمحے کو تو کیریلا پترووچ نے سوچا کہ اس کی لڑکی کا دماغ چل گیا ہے ۔

''بہت اچھا،، اس نے آخر کہا ۔ ''تمہارا بچانےوالا جو کوئی بھی ہو تم اس کا انتظار کرو۔ لیکن اس اثنا میں تم یہیں کمرے میں بند رہوگی اور شادی سے پہلے نہیں نکلوگی ۔،، ان الفاظ کے ساتھ کیریلا پترووچ کمرے سے نکل گیا اور باھر سے قفل ڈال کر چلا گیا ۔

دکھی لڑکی دیر تک آنسو بہاتی رہی اور ان ساری باتوں کا تصور کرنے کی کوشش کرتی جو آنےوالی تھیں ۔ لیکن اس ہنگامے نے اس کا دل کچھ ہلکا کر دیا تھا اور اب اس میں سکت پیدا ہوگئی تھی کہ اپنے مقدر اور آئیندہ کے اقدامات کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرے۔ اس کا بنیادی مقصد اس بھیانک شادی سے بچنا تھا ۔ ایک ڈاکو کی بیوی بننا اس کے مقابلے میں اسے جنت معلوم ہوتا تھا ۔ اس نے وہ انگوٹھی دیکھی جو دوبرووسکی نے اس کو دی تھی ۔ کاش وہ اس فیصلہ کن لمحے سے پہلے ایک بار اور اس سے مل سکتی اور اطمینان سے صلاح مشورہ کر سکتی ۔ کوئی چیز تھی جو اس سے کہہ رہی تھی کہ آج کی رات وہ باغ میں کنج کے پاس ملیگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جیسے ہی اندھیرا ہوگا وہ وہاں پہنچ جائیگی۔ شام کا دھندلکا چھا گیا۔ ماشا جانے کی تیاری کرنے لگی۔ لیکن دروازے پر تو تالا پڑا ہوا تھا ۔ کنیز نے دروازے کے پیچھے سے کہا کہ کیریلا پترووچ نے ممانعت کر دی ہے کہ خبردار کوئی دروازہ نہ کھولے۔ وہ نظربند تھی ۔ انتہائی غمزدہ ہوکر وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ پوری رات کپڑے بدلے بغیر بیٹھی رہی اور سیاہ آسمان کو تکتی رہی۔ پو پھٹنے سے پہلے اس پر غنودگی طاری ہوگئی اور اسے ہلکی نیند آ گئی اور نیند میں دل دوز خوابوں نے اسے بہت ستایا اور جلد ہی صبح کے سورج کی کرنوں نے اسے جگا دیا ۔

سترھواں باب

آنکھ کھلتے ہی اس کو اس بھیانک صورت حال کی یاد آئی جس میں وہ پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی اور ایک کنیز اندر آئی۔ اس سے پوچھ گچھ پر معلوم ہوا کہ کیریلا پترووچ شام کو ارباتوف گیا تھا۔ رات گئے لوٹا اور ہر شخص کو تاکید کر دی کہ کوئی بھی اس کو کمرے سے باھر نکلنے یا کسی سے بات کرنے نہ دے۔ ساتھ ھی اس لڑکی نے بتایا کہ شادی کے لئے کوئی خاص تیاریاں نظر نہیں آتیں سوائے اس کے کہ پادری سے کہہ دیا گیا ھے کہ کسی بھی حالت میں وہ گاؤں سے باھر نہ جائے۔ اس اطلاع کے بعد کنیز دروازے پر قفل ڈال کر واپس چلی گئی۔

اس کے الفاظ نے جواں سال قیدی کا دل کڑا کر دیا۔ اس کے دماغ میں ھلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کے خون کا دوران تیز ھو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ دوبرووسکی کو سب کچھ بتا دے۔ اب وہ شاہ بلوط کے کھوکھل میں انگوٹھی رکھنے کی تدبیر سوچنے لگی۔ کھڑکی کے شیشے پر ایک ڈھیلا آکر لگا۔ اور اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ماریا کیریلوونا نے جھانک کر دیکھا تو وھاں ننھا ساشا اس کو چپکے چپکے اشارے کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی بہن کو کتنا چاھتا ھے۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔

”صبح بخیر ساشا،، اس نے کہا۔ ”کیا تم مجھ سے بات کرنا چاھتے ھو؟،،

”بہن میں دیکھنے آیا ھوں کہ تم کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ابا بہت ناراض ھیں اور کہتے ھیں کہ کوئی بھی تمہارا کہا نہ سنے۔ لیکن تم جو بھی کہو گی میں کروں گا۔،،

''شکریہ، پیارے ساشا۔ سنو تم کھوکھل والے شاہ بلوط کو جانتے ہو نا۔ وہ جو کنج کے پاس ہے؟''

''ہاں بہن۔''

''اچھا تو اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو جتنی جلدی ہو سکے بھاگ کر جاؤ اور یہ انگوٹھی کھوکھل میں ڈال دو۔ اور دیکھنا کوئی تمہیں دیکھ نہ پائے۔''

ان الفاظ کے ساتھ اس نے انگوٹھی گرائی اور کھڑکی بند کر دی۔

لڑکے نے جھپٹ کر انگوٹھی اٹھائی اور بھاگا۔ تین منٹ میں وہ ان محبت کرنےوالوں کے درخت کے سامنے کھڑا تھا۔ ہانپتے ہوئے اس نے چاروں طرف یہ دیکھنے کے لئے نظر دوڑائی کہ کوئی ہے تو نہیں اور انگوٹھی کھوکھل میں ڈال دی۔ وہ مڑ کر جلدی سے ماریا کیریلوونا کو کامیابی کی خوش خبری سنانے کےلئے بھاگنےوالا ہی تھا کہ چیتھڑوں میں اٹا ہوا، لال لال بالوں‌والا ایک آوارہ سا کانا چھوکرا کنج کے پیچھے سے نکلا اور شاہ بلوط کے پاس آیا اور اپنا ہاتھ کھوکھل میں ڈال دیا۔ ساشا گلہری کی تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور اس سے لپٹ گیا۔

''کیا کر رہا ہے تو؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''اس سے تمہیں کیا مطلب؟'' ساشا کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے چھوکرا بولا۔

''انگوٹھی چھوڑ کانے چھوکرے!'' ساشا چلایا۔ ''ورنہ میں ایسا مزہ چکھاؤں‌گا کہ زندگی بھر یاد رہیگا!''

جواب میں چھوکرے نے اس کے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا۔ لیکن ساشا نے اس کو نہ چھوڑا اور زور زور سے چیخنے لگا ''پکڑو، چور، دوڑو!''

چھوکرے نے گرفت سے نکلنے کی بےتحاشا کوشش کی۔ وہ ساشا سے کوئی دو برس بڑا ہوگا اور کہیں زیادہ مضبوط لیکن ساشا زیادہ پھرتیلا تھا۔

وہ چند لمحے تک لڑتے رہے یہاں تک کہ آخر لال بالوں‌والے چھوکرے نے اس پر غالب آتے ہوئے، ساشا کو زمین پر اٹھا پٹکا اور اس کا گلا پکڑ لیا۔

لیکن ٹھیک اسی لمحے ایک مضبوط ہاتھ نے اس کے لال اور جھبرے بالوں کو بھر مٹھی پکڑ لیا اور مالی استپان نے اس کو بالوں سے پکڑکر زمین سے کئی انچ اوپر اٹھا لیا۔

''لال بالوں‌والے بھوت!'' مالی چلایا۔ ''تجھے چھوٹے سرکار پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت کیسے ہوئی؟..''

ساشا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو نے ایمان سے کام نہیں لیا'' اس نے کہا۔ ''ورنہ تو کبھی بھی مجھے زمین پر نہیں پچھاڑ سکتا تھا۔ لا انگوٹھی دے مجھے اور یہاں سے دفان ہو جا۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا'' لڑکے نے جواب دیا اور اچانک چکر کھاکر اس نے اپنے بال استپان سے چھڑالئے۔

وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا لیکن ساشا نے اس کو جا لیا اور اس کی کمر پر ایسا دھکا دیا کہ وہ چاروں خانے چت زمین پر گر گیا۔ مالی نے اس کو دو بارہ پکڑا اور پیٹی سے کس لیا۔

''مجھے انگوٹھی دو!'' ساشا چلایا۔

''مالک ایک منٹ ٹھہرو!'' استپان نے کہا۔ ''ایک منٹ ٹھہرو، ہم اس کو کارندے کے پاس لے چلینگے۔ وہ اس کی مرمت کریگا۔''

مالی قیدی کو گھر کی طرف لے چلا۔ ساشا ساتھ ساتھ تھا، وہ اپنی پھٹی ہوئی اور گھاس سے داغدار برجس پر پریشان نگاہیں ڈالتا ہوا چل رہا تھا۔ دفعتاً ان کا سامنا کیریلا پترووچ سے ہوگیا جو اپنے اصطبل کا معائنہ کرنے کے لئے نکل رہا تھا۔

''کیا ماجرا ہے یہ؟'' اس نے استپان سے پوچھا۔

استپان نے واقعہ کا مختصر حال سنایا۔

کیریلا پترووچ نے سارا قصہ توجہ سے سنا۔

''پاجی کہیں کے، تجھے اس سے الجھنے کو کس نے کہا تھا؟'' اس نے ساشا سے پوچھا۔

''اس نے، ابا، کھوکھل سے انگوٹھی چرائی تھی۔ اس سے یہ انگوٹھی واپس دینے کے لئے کہو...''

''کیسی انگوٹھی؟ کیسا کھوکھل؟''

''انگوٹھی ماریا کیریلوونا نے... میرا مطلب ہے کہ انگوٹھی...''

ساشا نے بوکھلا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ کیریلا پترووچ کے تیور چڑھ گئے اور اس نے اپنا سر ھلاتے ہوئے کہا:

''اس میں ماریا کیریلوونا کا ھاتھ ہے۔ ساری باتیں سچ بتا ورنہ اتنے ڈنڈے برسینگے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائیگا۔''

''ابا، ابا... میں قسم کھاتا ہوں... ماریا کیریلوونا نے مجھ سے کچھ بھی کرنے کو نہیں کہا..!''

''استپان، جاؤ برچ کے درخت سے کوئی اچھی سی چھڑی کاٹ لاؤ...''

''ابا، ٹھہرو، میں سب بتاؤنگا تمھیں۔ میں احاطے میں دوڑ رھا تھا اور بہن ماریا کیریلوونا نے اپنی کھڑکی کھولی اس لئے میں دوڑ کر پاس گیا اور بہن نے اپنی انگوٹھی گرائی اور میں اسے کھوکھل میں چھپا رھا تھا... اور یہ لال بالوں والے چھوکرے نے اسے چرانے کی کوشش کی...''

''اس نے اپنی انگوٹھی گرائی اور تو اسے چھپانے جا رھا تھا۔ برچ کی چھڑی کاٹ لاؤ استپان۔''

''ایک منٹ ابا۔ میں سب بتاتا ھوں! میری بہن ماریا کیریلوونا نے مجھ سے شاہ بلوط تک جا کر اس میں یہ انگوٹھی رکھنے کے لئے کہا تھا اور میں وھاں گیا اور انگوٹھی اس میں ڈال دی اور یہ بدمعاش چھوکرا...''

کیریلا پترووچ بدمعاش چھوکرے کی طرف مڑا اور سختی سے پوچھا ''کس کا چھوکرا ہے تو؟''

''میں دوبرووسکی کا گھریلو نوکر ھوں'' لال بالوں والے چھوکرے نے جواب دیا۔

کیریلا پترووچ کا چہرہ سنولا گیا۔

''یہ بات ہے، تو مجھے اپنا مالک نہیں سمجھتا،، اس نے کہا۔ ''بہت اچھا۔ اور تو میرے باغ میں کیا کر رہا تھا؟،،

''میں رس بھریاں چن رہا تھا،، لڑکے نے بے پرواھی سے جواب دیا۔

''اھا!،، کیریلا پتروو چ بولا ''جیسا مالک ویسا نوکر۔ اور میری جاگیر میں رس بھریاں شاہ بلوط کے درخت میں پھلتی ھیں؟،،

لڑکے نے کچھ نہ کہا۔

''ابا اس سے انگوٹھی واپس دینے کو کہو،، ساشانے کہا۔

''چپ رہو، الکساندر،، کیریلا پتروو چ بولا ''یہ نہ بھولو کہ مجھے تم سے بھی سمجھنا ہے۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔ اور تو، کانا چھوکرا، بڑا چلتا پرزہ معلوم پڑتا ہے! لا مجھے انگوٹھی دے اور نو دو گیارہ ہو جا!،،

لڑکے نے مٹھی کھول دی اور دکھایا کہ اس کی مٹھی میں کچھ بھی نہیں۔

''اگر تو سب مان لیگا تو میں تجھے ڈنڈے نہیں کھلواؤنگا اور میں تجھے مونگ پھلیاں خریدنے کے لئے پانچ کوپک بھی دونگا۔ اور اگر تو سچ سچ نہیں بتائیگا تو میں تیری ایسی خبر لونگا کہ زندگی بھر یاد رکھیگا۔ ایں؟،،

لڑکے نے ایک لفظ بھی جواب نہیں دیا لیکن سر جھکائے کھڑا رہا اور اپنی صورت ایک گنوار دیہاتی لونڈے کی سی بنا لی۔

''اچھا،، کیریلا پتروو چ نے کہا ''بند کرو اس کو اور دیکھنا کہ نکل نہ بھاگے ورنہ میں ایک ایک کو مار مار کر زندہ در گور کر دونگا۔،،

استپان لڑکے کو کبوتر خانے کی طرف لے گیا اور وہاں اس کو بند کر دیا اور مرغی خانے کی بوڑھی عورت کو اس کی نگہبانی کے لئے چھوڑ دیا۔

''سیدھے شہرجاؤ اور تھانیدار کو بلالاؤ،، آنکھوں سے لڑکے کا تعاقب کرتے ہوئے کیریلا پترووچ نے کہا۔ ''جاؤ ہوا کی طرح۔،،

''اس میں کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا،، کیریلا پترووچ نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اور غصے میں ''فتح کے شادیانے بجاؤ!،، کی دھن پر سیٹی بجاتے ہوئے سوچا۔ ''اوہ اس کا تعلق اس کم بخت دوبرووسکی سے باقی ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اس‌نے واقعی اس کو اپنی مدد کےلئے بلوایا ہے۔ شائد میں نے آخر کار اس کا سراغ لگا لیا ہے اور وہ ہم سے بچ کر نہیں نکل سکتا! ہم اس موقع کا فائدہ اٹھائینگے۔ اف! گھوڑے کی گھنٹیوں کی آواز! یہ تو تھانیدار ہے، خدا کا شکر ہے! اوھو وہ رہا! لاؤ اس چھوکرے کو جس کو ہم‌نے ابھی پکڑا ہے!،،

ٹھیک اسی لمحے ایک گاڑی احاطے میں داخل ہوئی اور ہمارا دوست تھانیدار کمرے میں گھسا۔ وہ سرتاپا گردوغبار میں اٹا ہوا تھا۔

''شاندار خوش خبری ہے!،، کیریلا پترووچ نے اس سے کہا۔ ''میں نے دوبرووسکی کو پکڑ لیا ہے۔،،

''حضور عالی خدا کا شکر ہے!،، تھانیدار نے خوش ہوکر کہا۔ ''کہاں ہے وہ؟،،

''دوبرووسکی تو نہیں مگر کم از کم اس کے گروہ کا ایک آدمی۔ ایک منٹ میں وہ یہاں حاضر کیا جائیگا۔ وہ خود سردار کو گرفتار کروانے میں ہماری مدد کریگا۔ لو وہ رہا وہ!،،

تھانیدار کو امید تھی کہ اس کا سامنا کسی تگڑے بدمعاش سے ہوگا۔ اپنے سامنے بیمار سے تیرہ برس کے چھوکرے کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے تعجب بھری نظروں سے کیریلا پترووچ کو دیکھا اور اس کے کہنے سننے کا انتظار کرنے لگا۔ کیریلا پترووچ نے اس کو صبح کا واقعہ سنایا البتہ اس نے اس سلسلے میں ماریا کیریلوونا کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

تھانیدار نے غور سے اس کی باتیں سنیں۔ وہ برابر

اس چھوٹے سے بدمعاش پر نظریں گاڑے رہا جو اب تک گنوار چھوکرا بنا کھڑا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اسے اس کا کچھ پتہ نہیں کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔

''کیا میں آپ سے تنہائی میں بات کر سکتا ہوں، حضور عالی؟'' آخر کار تھانیدار نے پوچھا۔

کیریلا پتروویچ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد دونوں اس کمرے میں لوٹے جہاں قیدی اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

''حضور عالی کی خواہش تھی کہ تجھے شہر کے جیل میں بھیج دیا جائے اور ڈنڈوں کا مزا چکھایا جائے۔ اور پھر تجھے شہر بدر کر دیا جائے'' تھانیدار نے لڑکے سے کہا۔ ''لیکن میں نے تیری سفارش کی اور تیرے لئے معافی حاصل کی۔ کھول دو اسے۔''

''حضور عالی کا شکریہ ادا کر'' تھانیدار نے کہا۔

لڑکے کی رسیاں کھول دی گئیں۔

لڑکا کیریلا پتروویچ کے پاس گیا اور اس کا ہاتھ چوما۔

''تو گھر جا سکتا ہے'' کیریلا پتروویچ نے اس سے کہا۔ ''اور آئندہ پھر کبھی شاہ بلوط کے کھوکھل سے رس بھریاں نہ چرانا۔''

چھوکرا خوش خوش اچھلتا کودتا برساتی سے نکلا اور پلٹ کر دیکھے بغیر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور کستےنیوکا کے کھیتوں کو پار کرتا سیدھا بھاگتا چلا گیا۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ نکڑ پر ایک خستہ‌حال جھونپڑی کے سامنے رکا اور کھڑکی پر دستک دی۔ کھڑکی کھلی اور ایک بوڑھی عورت نظر آئی۔

''دادی روٹی دو'' لڑکا بولا۔ ''صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا، میں بھوکا ہوں۔''

''اچھا یہ تو ہے میتیا، بھوت تو کہاں تھا پورے وقت ایں؟''

''میں بعد میں بتاؤنگا دادی۔ روٹی خدا کے لئے، روٹی!''

''تو پھر جھونپڑی کے اندر آ جا۔''

''میرے پاس وقت نہیں دادی۔ مجھے ابھی اور کہیں جانا ہے۔ روٹی حضرت عیسی کا واسطہ، روٹی!''

''جانے کیا واھی تباھی بک رہا ہے!'' بڑھیا غرائی۔ ''لے یہ لے۔'' اور اس نے کھڑکی میں سے کالی روٹی کا ایک ٹکڑا اسے بڑھایا۔

لڑکے نے جھپٹ کر روٹی میں دانت گاڑ دئے اور چبانے لگا اور آگے بڑھ گیا۔

شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ کھلیانوں اور ترکاری کے کھیتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے میتیا نے کستےنیوکا کے جنگل کی راہ لی۔ جب وہ چیڑ کے دو درختوں کے پاس پہنچا جو جنگل کی دربانی کرتے تھے تو رک گیا اور چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ ایک چھوٹی اور تیز سیٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔ ایک نرم اور لمبی سیٹی جواب میں سنائی دی اور کوئی جنگل سے نکلا اور اس کے پاس آیا۔

اٹھارھواں باب

کیریلا پترووچ بڑے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور اس کی سیٹی کی دھن اور تیز ہو گئی تھی۔ سارا گھر بیدار تھا۔ ملازم ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ کنیزیں شور مچاتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ اصطبل میں کوچبان گاڑیوں میں گھوڑے جوت رہے تھے۔ پورا احاطہ مردوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ سنگار کے کمرے میں ایک عورت آئینے کے سامنے، کنیزوں کے جھرمٹ میں کھڑی زرد اور بےحس و حرکت ماریا کیریلوونا کو لباس پہنا رہی تھی۔ اس کا سر ہیرے جواھر کے بوجھ سے ذرا جھک گیا تھا۔ جب کبھی کسی بےاحتیاطی سے سوئی چبھتی تو وہ چونک جاتی

لیکن کچھ نہ کہتی اور کھوکھلی نگاھوں سے آئینے کو گھورتی رھتی۔

''کیاتم جلدی تیار ھو جاؤگی؟'' کیریلا پترووچ کی آواز باھروالے دروازے کے پیچھے سے آئی۔

'' ایک منٹ میں'' عورت نے جواب دیا۔ '' ماریا کیریلوونا اٹھو اور ذرا آئینے میں اپنی سج دھج دیکھو، ھر چیز تمہاری خواھش کے مطابق ھے نا؟''

ماریا کیریلوونا ایک لفظ کہے بغیر اٹھی۔ دروازہ کھلا۔

''دولہن تیار ھے'' عورت نے کہا۔ ''ھم گاڑی میں سوار ھو سکتے ھیں۔''

''اللہ کا چاھا ھو کر رھیگا'' میز پر سے عیسی کی تصویر اٹھاتے ھوئے کیریلا پترووچ نے جواب میں کہا۔ ''ادھر آؤ ماشا'' اس نے جذبات بھری آواز میں کہا۔ ''میں تم کو اپنی دعائیں دینا چاھتا ھوں...''

بیچاری لڑکی سسکتی ھوئی اس کے قدموں پر گر گئی۔

''ابا... ابا...'' اس نے آنسو بہاتے ھوئے کہا اور اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

کیریلا پترووچ نے جلدی جلدی دعائیں دیں۔ اور اسے اٹھاکر گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ اس کے پاس ھی ایک عورت اور کنیز بیٹھی تھی۔ وہ گرجا گھر کی طرف روانہ ھو گئے۔ وھاں دولہا پہلے ھی سے ان کا انتظار کر رھا تھا۔ وہ دولہن کا خیرمقدم کرنے کے لئے باھر آیا اور اس کے چہرے کا زرد رنگ اور چہرے کی عجیب کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ ایک ساتھ ٹھنڈے اور خالی گرجا کے اندر داخل ھوئے اور دروازہ بند ھوگیا۔ پادری عشائے ربانی کی میز کے عقب سے نکلا اور فوراً تقریب کی رسم شروع ھوگئی۔ ماریا کیریلوونا نے کچھ نہ دیکھا، کچھ نہ سنا۔ اس کے دماغ میں صرف ایک خیال تھا۔ وہ صبح سے دوبرووسکی کی راہ دیکھ رھی تھی۔ ایک لمحے کو بھی اس نے امید کا دامن نہ چھوڑا تھا۔ مگر جب پادری حسب معمول سوالوں

کے ساتھ اس کی طرف مڑا تو وہ لرزی اور اس کا بدن سخت ہو گیا۔ لیکن اس نے اب بھی دیر کی، اسے اب بھی امید تھی۔ پادری نے اس کا جواب سنے بغیر وہ الفاظ ادا کر دئیے جو واپس نہیں لئے جا سکتے۔

رسم ختم ہو گئی۔ ماریا کیریلوونا نے اپنے شوہر کا، جس کو وہ ذرا نہ چاہتی تھی سرد بوسہ محسوس کیا، آس پاس کے لوگوں کے منہ سے خوش خوش مبارکباد کی صدائیں سنیں اور اب بھی اسے یقین نہ آتا تھا کہ اس کے پیروں میں زندگی بھر کےلئے بیڑیاں پڑ گئی ھیں، اور یہ کہ دوبرووسکی اس کو بچانے کےلئے جھپٹتا ہوا نہ آیا۔ شہزادے نے اس سے محبت کے ساتھ بات کی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ گرجا سے باھر نکلے۔ پوکرووسکوئے کے کسان گرجا گھر کی برساتی میں جمع ہو گئے۔ اس کی آنکھیں تیزی سے ان کے چہروں پر تیریں اور پھر خالی خالی سی نظر آنے لگیں۔ دولہا دولہن کا نیا جوڑا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی ارباتوف کی طرف چل پڑی جہاں کیریلا پتروو چ ان کا استقبال کرنے کےلئے پہلے ھی سے موجود تھا۔ شہزادہ گاڑی میں اپنی جوان بیوی کے پاس تنہا بیٹھ کر اس کی سردمہری سے ذرا پریشان نہ ہوا۔ اس نے اس پر شہد بھرے اقرار محبت اور بےخودی کی مضحکہ خیز باتوں کی بوچھار نہیں کی۔ اس کی جذبات سے خالی باتوں کےلئے جواب کی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح انہوں نے کوئی دس ورسٹ کا فاصلہ طے کر لیا۔ گھوڑے، ناھموار دیہاتی سڑک پر سرپٹ دوڑ رہے تھے، اور گاڑی اپنے انگریزی اسپرنگ کی وجہ سے بہت کم ھچکولے کھا رہی تھی۔ دفعتاً تعاقب کرنےوالوں کی چیخ سنائی دی۔ گاڑی رک گئی اور مسلح آدمیوں کے ایک گروہ نے اس کو گھیر لیا۔ ایک نقاب پوش نے ایک طرف کا دروازہ کھولا جس طرف شہزادی بیٹھی ہوئی تھی اور بولا :

''تم آزاد ہو، باھر آ جاؤ !،،

''کیا ھے یہ؟،، شہزادہ چلایا۔ ''تم ہو کون؟،،

''یہ ھے دوبرِووسکی،، شہزادی نے کہا۔

شہزادے نے حاضر دماغی سے کام لیا، اس نے اپنا سفری پستول بغلی جیب سے نکالا اور نقاب پوش پر گولی چلا دی۔ شہزادی چیخ پڑی اور مارے دهشت کے اس نے اپنا منه هاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ دوبرووسکی کا شانه زخمی ہو گیا اور خون ٹپکنے لگا اور شہزادے نے ایک لمحه ضائع کئے بغیر دوسرا پستول نکالا لیکن اس کے گولی چلا نے سے پہلے دوسرا دروازه کھلا اور مضبوط هاتھوں نے اس کو گاڑی سے کھینچ لیا اور پستول اس سے چھین لیا۔ اس کے سر پر خنجر چمک اٹھے۔

''اس کو مت چھونا!،، دوبرووسکی چلایا اور اس کے تگڑے ساتھی پیچھے ہٹ گئے۔

''تم آزاد ہو،، دوبرووسکی نے زرد پڑی هوئی شہزادی سے مخاطب ہوتے هوئے کہا۔

''نہیں،، اس نے کہا ''اب بہت دیر هو گئی۔ میری شادی هو چکی ہے۔ میں شہزاده ویریئسکی کی بیوی هوں۔،،

''کیا!،، دوبرووسکی نے انتہائی دکھ کے ساتھ کہا۔
''نہیں تم اس کی بیوی نہیں هو۔ تم کو مجبور کیا گیا ہے، تم نے اپنی مرضی سے نہیں...،،

''میں نے اپنی رضامندی ظاهر کی، میں نے عهد کیا...،، اس نے ثابت قدمی سے کہا۔ ''شہزاده میرا شوهر ہے۔ ان سے کہو که اس کو آزاد کر دیں اور مجھے اس کے ساتھ چھوڑ دیں۔ میں نے تم کو دهوکا نہیں دیا۔ میں نے آخری منٹ تک تمہارا انتظار کیا۔ لیکن میں کہتی هوں اب بہت دیر هو چکی ہے۔ اب همیں جانے دو۔،،

دوبرووسکی اب اس کی باتیں نہیں سن رہا تھا اس لئے که اس کے زخم کے درد اور دل کے هیجان نے اس کی ساری طاقت سلب کر لی تھی۔ وه گاڑی کے پہئے کے پاس گر گیا۔ اور اس کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ اس میں بس اتنی سکت باقی تھی که چند لفظ ان سے کہه سکے۔ انہوں نے اس کو اپنے گھوڑے پر ڈال دیا۔ دو آدمیوں نے دو طرف سے اس کو سہارا دیا اور تیسرے نے لگام پکڑ لی۔

وہ سب ایک طرف ہو گئے اور گاڑی کو بیچ سڑک پر چھوڑ دیا، ملازموں کو باندھ دیا گیا اور گاڑی کے گھوڑے الگ کر دئیے گئے۔ کسی چیز کو ھاتھ نہ لگایا گیا اور نہ سردار کے خون کے انتقام میں ایک قطرہ خون بہایا گیا۔

انیسواں باب

گھنے جنگل کے درمیان ایک تنگ میدان میں مٹی کا ایک چھوٹا سا دھس تھا جو ایک پشتے اور ایک گڑھے پر مشتمل تھا۔ اور ان کے اندر کئی خیمے اور مٹی کے جھونپڑے تھے۔

جھونپڑوں کے سامنے کھلی ہوئی جگہ میں لوگوں کا ایک گروہ، ایک بڑی سی دیگ کے گرد بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ ننگے سر، لوگوں کے رنگ برنگے کپڑوں اور ان کے ھتھیاروں سے صاف ظاھر تھا کہ یہ ڈاکوؤں کا گروہ ھے۔ ایک چھوٹی سی توپ کے پاس پشتے پر ایک سنتری ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ وہ ایک قمیص پر پیوند لگا رہا تھا اور وہ اتنی چابکدستی سے سوئی چلا رہا تھا کہ اس سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ ایک تجربہ کار درزی ھے۔ ساتھ ھی وہ چاروں طرف اپنی نگاھیں بھی دوڑاتا جاتا تھا۔

اگرچہ ایک ڈونگا کئی بار ھاتھوں ھاتھ گشت کر چکا تھا، پھر بھی مجمع پر ایک عجیب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد، ڈاکو یکے بعد دیگرے اٹھے، خدا کا شکر ادا کیا اور منتشر ہو گئے۔ کچھ تو خیموں میں گئے، کچھ جنگل میں اور کچھ ایسے بھی تھے جو خاص روسی انداز میں لیٹ کر قیلولہ کرنے لگے۔

سنتری نے سلائی ختم کی اور چتھڑے چتھڑے قمیص کو هوا میں لهرایا اور اسے اوپر اٹھاکر دل هی دل میں پیوند کے حسن کی داد دینے لگا ۔ اس نے سوئی اپنی آستین میں گھسا لی اور توپ پر سوار هوکر آواز کی پوری بلندی سے ایک پرانا اداس راگ الاپنے لگا :

سرسبز و شاداب جنگلو سرگوشی نه کرو ،
مجھ، نڈر نوجوان کے خیالات کا سلسله نه توڑو ۔

اسی لمحے ایک خیمے سے سفید ٹوپی پهنے هوئے ایک عورت دهلیز پر نکل کر آئی ۔ وہ صاف ستھرے اور موزوں لباس میں تھی ۔

''استپکا چپکا رہ'' اس نے سختی سے کہا ۔ ''مالک آرام کر رهے هیں اور تو ڈکار رها هے ۔ تیرا ضمیر مر گیا هے یا تجھے رحم نهیں آتا ۔''

''معاف کرنا یگوروونا''، استپکا بولا ''بهت اچھا ۔ میں چپ هوا جاتا هوں ۔ همارے مالک کو آرام کرنے اور اچھا هونے دو ۔''

بوڑھی عورت واپس چلی گئی اور استپکا پشتے کی چوٹی پر پھیرے لگانے لگا ۔

جس خیمے سے بوڑھی عورت نکلی تھی، اس میں زخمی دوبرووسکی ایک اوٹ کے پیچھے سفری پلنگ پر پڑا تھا ۔ اس کے پاس میز پر اس کے پستول دهرے هوئے تھے اور اس کی تلوار اس کے سر کے اوپر دیوار سے لٹکی هوئی تھی ۔ خیمے کی دیواروں اور فرش پر قیمتی قالین بچھے هوئے تھے اور کونے میں عورتوں کی سجاوٹ کا سامان چاندی کے برتنوں میں ایک میز پر رکھا تھا اور ایک بڑا سا آئینه بھی موجود تھا ۔ دوبرووسکی کے هاتھ میں ایک کتاب تھی لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں اور بوڑھی عورت نے اوٹ کے پاس سے جھانک کر دیکھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نه آیا که وہ سو رها هے یا محض خیال میں گم هے ۔

اچانک دوبرووسکی چونک پڑا ۔ باهر سے خطرے کی گھنٹی کی آواز آ رهی تھی ۔ استپکا نے کھڑکی میں اپنا سر گھساتے هوئے کہا :

"مالک ولادیمیر اندریےوچ!" وہ چلایا۔ "یہ سگنل ہمارا تھا۔ وہ ہماری تلاش میں ہیں۔"

دوبرووسکی بستر سے اچھلا، جھپٹ کر اپنے ہتھیار اٹھائے اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ باہر اس کے آدمی شور مچا رہے تھے۔ اب اس شور کی جگہ بالکل خاموشی چھا گئی۔

"کیا ہر شخص یہاں موجود ہے؟" دوبرووسکی نے پوچھا۔

"پہرہ دینےوالوں کے سوا سبھی یہاں ہیں!" جواب ملا۔

"اپنے اپنے مورچے پر!" دوبرووسکی چلایا اور ہر ڈاکو اپنی مقررہ جگہ پر چلا گیا۔

ٹھیک اسی لمحہ تین گشتیپہریدار پھاٹک پر پہنچے اور دوبرووسکی ان سے ملنے کےلئے آگے بڑھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جنگل میں سپاہی ہیں" انہوں نے کہا۔ "ہم گھر گئے ہیں۔"

دوبرووسکی نے پھاٹکوں کے بند کرنے کا حکم دیا۔ اور خود چھوٹی سی توپ کا معائنہ کرنے لگا۔ جنگل سے ابھرتی ہوئی آواز قریب سے قریب تر آتی گئی۔ ڈاکو دم سادھے انتظار کرتے رہے۔ یکایک تین چار سپاہی جنگل سے نکلے اور اپنے ساتھیوں کےلئے سگنل داغتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

"لڑائی کےلئے تیار ہو جاؤ!" دوبرووسکی چلایا۔

ڈاکوؤں کے درمیان ایک سرسراہٹ سی ابھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اب قریب آتی ہوئی فوج کی آواز آنے لگی، درختوں کے درمیان ہتھیار چمکنے لگے اور کوئی ڈیڑھ سو سپاہی جنگل سے جھپٹے اور پشتے پر ٹوٹ پڑے۔ دوبرووسکی نے توپ کا سرا جلایا اور اس کے دھماکے نے اپنا کام کیا۔ ایک سپاہی کا سر اڑ گیا اور دو زخمی ہوئے۔ باقی سپاہیوں میں کھلبلی اور بھگدڑ سی مچ گئی۔ لیکن ان کا افسر آگے لپکا اور سپاہی اس کے پیچھے دوڑے اور گڑھے

کی طرف لپکے ۔ ڈاکوؤں نے بندوقوں اور پستولوں سے گولیاں برسائیں اور اپنی کلہاڑیوں سے پشتے کا بچاؤ کرنے لگے ۔ سپاھی اوپر چڑھ گئے اور اپنے پیچھے بیس زخمی ساتھیوں کو تڑپتا چھوڑ گئے ۔ اب دست‌بدست لڑائی شروع ھوئی ۔ سپاھیوں نے پشتے کے سرے پر قبضہ جما لیا تھا اور ڈاکوؤں کے قدم اکھڑنے ھی والے تھے کہ دوبرووسکی افسر کے سامنے بڑھا اور اس کے سینے پر پستول تان کر داغ دیا ۔ افسر چت گر پڑا، کئی سپاھی اسے اٹھاکر اپنے درمیان لے گئے، اور اپنے اس بوجھ کے ساتھ جنگل میں واپس چلے گئے ۔ باقی سپاھیوں کے پیر اپنے سردار کی غیرموجودگی میں اکھڑ گئے ۔ ڈاکوؤں کے گروہ نے اس تذبذب کے لمحے کا فائدہ اٹھایا اور ان پر پل پڑے، ان کو دھکیل کر گڑھے میں گرایا اور محاصرہ کرنے والے سپاھی بھاگ کھڑے ھوئے اور ڈاکوؤں کی للکار ان کا پیچھا کرتی رھی ۔ فتح یقینی تھی ۔ دوبرووسکی نے دشمنوں کی افراتفری پر بھروسہ کرتے ھوئے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کیا، زخمیوں کو اٹھانے اور پھرے کو دگنا کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ کوئی بھی اس قلعے سے باھر نہ جائے ۔ اور اس کے بعد اس نے خود کو ساتھیوں سمیت قلعے میں بند کر لیا ۔

اس آخری واقعے کے بعد صحیح معنوں میں، دوبرووسکی کے بیباک کارنامے حکام کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے ۔ اس کے بارے میں معلومات یکجا کی گئیں اور سپاھیوں کی ایک پوری کمپنی اسے زندہ یا مردہ لانے کےلئے بھیجی گئی ۔ اس کے گروہ کے چند آدمی گرفتار کر لئے گئے جن سے اس کی تصدیق ھوئی کہ دوبرووسکی اب ان کے درمیان نہیں رھا ۔ لڑائی کے ایک دو دن بعد اس نے اپنے تمام آدمیوں کو بلایا اور کہا کہ وہ ان کو ھمیشہ ھمیشہ کےلئے چھوڑنا چاھتا ھے اور ان کو صلاح دی کہ وہ اپنی زندگی کا ڈھنگ بدل دیں ۔

’’میری سرداری میں تم نے دولت کمائی ھے ۔ تم میں سے ھر ایک کے پاس ضروری کاغذات ھیں ۔ بحفاظت تمام کسی دوسرے صوبے میں چلے جاؤ جہاں تم اپنی باقی زندگی

عزت کی محنت اور خوش‌حالی میں بتا سکتے ہو - لیکن تم سب بدمعاش ہو اور غالباً تم اپنا دھندا چھوڑنا پسند نہ کرو گے -،،

یہ کہہ کر وہ ان کو چھوڑ کر چلا گیا اور اپنے ساتھ صرف ایک آدمی کو لے گیا - کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا - شروع میں اس بیان کی سچائی پر شبہہ کیا گیا - اپنے سردار کے لئے ڈاکوؤں کے دل میں جو محبت تھی سب اسے جانتے تھے اور یہ سوچا گیا کہ وہ اس کو بچانے کی کوشش کر رہے ھیں - لیکن بعد میں ان کے بیان کی تصدیق ہو گئی - خوفناک لوٹ‌مار اور حملوں، آتش‌زنی اور ڈاکوں کی وارداتیں ختم ہو گئیں - سڑکیں محفوظ اور صاف ہو گئیں - دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ دوبرووسکی دیس سے باھر سدھار گیا -

۳۳ — ۱۸۳۲ء